اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خُطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۳

اسلام اور حُسنِ معاملات

شیخ الاسلام مفتی مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز
اِدارۂ اسلامیات

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ’’اسلام اور ہماری زندگی‘‘ انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلام اور حُسنِ معاملات

جلد ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک ضروری گزارش!

معزز قارئینِ کرام! اس کتاب کو عام قاری کے مطالعہ، اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی اور ثوابِ دارین کے خاطر پاکستان ورچوئل لائبریری پر شائع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری یہ کاوش پسند آئی ہے یا آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے کوئی راہنمائی ملی ہے تو برائے مہربانی میرے اور میرے والدین کی بخشش کے لئے اللہ رب العزت سے دُعا ضرور کیجئے گا۔ شکریہ

طالبِ دُعا سعید خان

ایڈمن پاکستان ورچوئل لائبریری

ہماری روزمرہ زندگی اوراس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۳

اسلام اور حُسنِ معاملات

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اِسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور
فون ۳۷۳۲۳۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۲۳۲۲۸۵

★ ۱۹۰ انار کلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۳۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۳

اسلام اور حسن معاملات

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۲۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ـــــ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ـــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل

تجارت دین بھی، دنیا بھی ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (۱)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ)) (۲)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اَلتُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا إِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَبَرَّ وَصَدَقَ)) (۳)

مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! پہلے بھی ایک مرتبہ بھائی امان اللہ صاحب کی دعوت پر میری یہاں حاضری ہو چکی ہے، اور یہ ان کی اور دوستوں کی محبت کی بات ہے کہ دوبارہ ایک ایسا اجتماع

☆ اصلاحی خطبات (۳/۲۳۶ تا ۲۴۵) بمقام مکان یوسف غنی صاحب، کلفٹن، کراچی

(۱) التوبة: ۱۱۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمية النبی إياهم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷

(۳) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمية النبی إياهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦

انہوں نے منعقد فرمایا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ پچھلی مرتبہ جس طرح کچھ سوالات کئے گئے تھے، جن کا میری اپنی ناقص معلومات کی حد تک جو جواب بن پڑا، وہ دے دیا تھا، خیال یہ تھا کہ آج بھی اسی قسم کی مجلس ہوگی، کوئی تقریر یا بیان پیش نظر نہیں تھا، لیکن بھائی صاحب فرما رہے ہیں کہ ابتداء میں دین کی اور ایمان ویقین کی باتیں ہو جائیں، تو دین کی بات بیان کرنے سے تو کبھی انکار نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ دین ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پتھر کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تاجروں کا حشر، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ

اس مجمع میں جو دوست واحباب موجود ہیں، ان میں سے اکثر کا تعلق چونکہ تجارت سے ہے، اس لئے اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں میرے ذہن میں آئیں، اور پھر قرآن کریم کی ایک آیت بھی میں نے تلاوت کی، جس سے ان دونوں حدیثوں کے مضمون کی وضاحت ہوتی ہے، اور یہ دونوں حدیثیں بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں، ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ))(۱)

''جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''

یہ تجارت جس کو ہم اور آپ دنیا کا ایک کام سمجھتے ہیں، اور دل میں یہ خیال رہتا ہے کہ یہ تجارت ہم اپنے پیٹ کی خاطر کر رہے ہیں، اور اس کا بظاہر دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تاجر میں دو باتیں پائی جائیں، ایک یہ کہ وہ صدوق ہو، اور امین ہو، صدوق کے لفظی معنی ہیں ''سچا'' اور امین کے معنی ہیں ''امانت دار'' اگر یہ دو صفتیں اس میں پائی جائیں تو قیامت کے دن وہ انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا، ایک سچائی اور ایک امانت۔

تاجروں کا حشر، فاجروں کے ساتھ

اور دوسری حدیث جو بظاہر اس کے متضاد ہے وہ یہ ہے:

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمية النبی إياهم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷

((اَلتُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَبَرَّ وَصَدَقَ))(۱)

''تجار'' قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے، ''فجار'' فاجر کی جمع ہے، یعنی فاسق وفاجر اور گناہگار، جو اللہ تعالیٰ کی معصیتوں کا ارتکاب کرنے والا ہے، سوائے اس شخص کے جو تقویٰ اختیار کرے، اور نیکی اختیار کرے، اور سچائی اختیار کرے۔

تاجروں کی دو قسمیں

یہ دونوں حدیثیں انجام کے لحاظ سے بظاہر متضاد نظر آتی ہیں کہ پہلی حدیث میں فرمایا کہ نبیوں کے ساتھ ہوں گے، صدیق اور شہداء کے ساتھ ہوں گے، اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ فساق اور فجار کے ساتھ ہوں گے، لیکن الفاظ کے ترجمہ ہی سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ حقیقت میں دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ تاجروں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک قسم وہ ہے جو انبیاء اور صدیقین کے ساتھ ہوگی اور ایک قسم وہ ہے جو فاجروں اور فاسقوں کے ساتھ ہوگی۔

اور دونوں قسموں میں فرق بیان کرنے کے لئے جو شرائط بیان فرمائیں وہ یہ ہیں کہ سچائی ہو، امانت ہو، تقویٰ ہو، نیکی ہو تو پھر وہ تاجر پہلی قسم میں داخل ہے اور اس کو انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور اگر یہ شرائط اس کے اندر نہ ہوں، بلکہ صرف پیسہ حاصل کرنا مقصود ہو، جس طرح بھی ممکن ہو، چاہے دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر ہو، دھوکے دے کر ہو، فریب دے کر ہو، جھوٹ بول کر ہو، دغا دے کر ہو، کسی بھی ناجائز طریقے سے ہو تو پھر وہ تاجر دوسری قسم میں داخل ہے کہ اس کو فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

تجارت جنت کا سبب یا جہنم کا سبب

اگر ان دونوں حدیثوں کو ہم ملا کر دیکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو تجارت ہم کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اس تجارت کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بنالیں، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں، اور اگر چاہیں تو اسی تجارت کو جہنم کا راستہ بنالیں اور فساق فجار کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس دوسرے انجام سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ما جاء فی التجار وتسمیة النبی إیاهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲۴۲۶

ہر کام میں دو زاویئے

اور یہ بات صرف تجارت کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ دنیا کے جتنے کام ہیں، خواہ وہ ملازمت ہو، خواہ وہ تجارت ہو، خواہ وہ زراعت ہو، یا کوئی اور دنیا کا کام ہو، ان سب میں یہی بات ہے کہ اگر اس کو انسان ایک زاویئے سے دیکھے تو وہ دنیا ہے، اور اگر دوسرے زاویئے سے دیکھے تو وہی دین بھی ہے۔

زاویۂ نگاہ بدل دیں

یہ دین درحقیقت صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، اگر آپ وہی کام دوسرے زاویہ سے کریں، دوسری نیت سے کریں، دوسرے ارادے سے کریں، دوسرے نقطہ نظر سے کریں تو وہی چیز جو بظاہر خالص دنیاوی چیز نظر آ رہی تھی دین بن جاتی ہے۔

کھانا کھانا عبادت ہے

اگر انسان کھانا کھا رہا ہے، تو بظاہر انسان اپنی بھوک دور کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، لیکن اگر کھانا کھاتے وقت یہ نیت ہو کہ میرے نفس کا مجھ پر حق ہے، میری ذات کا، میرے وجود کا مجھ پر حق ہے، اور اس حق کی ادائیگی کے لئے میں یہ کھانا کھا رہا ہوں، اور اس لئے کھا رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا حق یہ ہے کہ میں اس کی طرف اشتیاق کا اظہار کروں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو استعمال کروں۔ تو وہی کھانا جو بظاہر لذت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور بظاہر بھوک دور کرنے کا ذریعہ تھا، پورا کھانا دین اور عبادت بن جائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور سونے کی تتلیاں

لوگ سمجھتے ہیں کہ دین یہ ہے کہ دنیا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤ، اور اللہ اللہ کرو، بس یہی دین ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کا نام آپ نے سنا ہوگا، کون مسلمان ہے جو ان کے نام سے واقف نہیں ہے۔ بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں اور بڑی ابتلا اور آزمائش سے گزرے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ وہ غسل کر رہے تھے، اور غسل کے دوران آسمان سے ان پر سونے کی تتلیوں کی بارش شروع ہوگئی،

تو حضرت ایوب علیہ السلام غسل چھوڑ چھاڑ کر ان تتلیوں کو پکڑنے اور جمع کرنے میں لگ گئے۔ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ایوب! کیا ہم نے تم کو پہلے ہی بے شمار نعمتیں نہیں دے رکھی ہیں؟ تمہاری ضروریات کا سارا انتظام کر رکھا ہے، ساری کفالت کر رکھی ہے، پھر بھی تمہیں حرص ہے، اور تتلیوں کو جمع کرنے کی طرف بھاگ رہے ہو؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے کیا عجیب جواب دیا کہ اے پروردگار!

((لَا غِنٰى بِىْ عَنْ بَرَكَتِكَ))(۱)

"میں تیری عطا کردہ برکت سے تو مستغنی نہیں ہوسکتا"

جب آپ میرے اوپر کوئی نعمت نازل فرمائیں تو یہ بات ادب کے خلاف ہے کہ میں اس سے بے نیازی کا اظہار کروں۔

جب آپ خود اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرما رہے ہیں تو اب اگر میں بیٹھا رہوں اور یہ کہوں کہ مجھے یہ سونا چاندی نہیں چاہئے میں تو اس پر ٹھوکر مارتا ہوں تو یہ بے ادبی کی بات ہے۔ جب آپ دے رہے ہیں تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اشتیاق کے ساتھ اس کو لوں اس کی قدر پہچانوں اور اس کا شکر یہ ادا کروں۔ اس لئے میں آگے بڑھ کر جمع کر رہا ہوں، یہ ایک پیغمبر کی آزمائش تھی۔ ورنہ اگر کوئی عام قسم کا خشک دین دار ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، میں تو اس دنیا کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ لیکن وہ چونکہ حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہی چیز اگر اس نقطہ نظر سے حاصل کی جائے کہ میرے پروردگار کی دی ہوئی ہے، اور اس کی نعمت ہے، میں اس کی قدر پہچانوں، اس کا شکر ادا کروں تو پھر یہ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ دین ہے۔

نگاہ نعمت دینے والے کی طرف ہو

ہم لوگ پانچ بھائی تھے، اور سب برسر روزگار اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، کبھی کبھی عید وغیرہ کے موقع پر جب ہم اکھٹے ہوتے تو حضرت والد صاحب ہمیں بعض اوقات عیدی دیا کرتے تھے، وہ عیدی کبھی ۲۰ روپے کبھی ۲۵ روپے اور کبھی ۳۰ روپے ہوتی، مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب ۲۵ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ نہیں ہم ۳۰ روپے لیں گے، اور جب وہ ۳۰ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ

(۱) صحيح البخاری، كتاب الغسل، باب من اغتسل عريانا وحده فی الخلوة ومن تستر، رقم: ۲۷۰، سنن النسائی، كتاب الغسل والتيمم، باب الاستتار عن الاغتسال، رقم: ۴۰۶، مسند أحمد، مسند ابی هريرة، رقم: ۷۸۱۲

نہیں ہم ۳۵ روپے لیں گے، اور تقریباً یہ صورت ہر گھر میں ہوتی ہے کہ اولاد چاہے جوان ہوگئی ہو، برسرروزگار ہوگئی ہو، کمارہی ہو لیکن اگر باپ دے رہا ہے تو اس سے مچل مچل کر مانگتے ہیں کہ اور دے دیں، حالانکہ وہ باپ کی طرف سے جو ۳۰ روپے دیئے گئے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لئے کہ ہم میں سے ہر بھائی ہزاروں روپے کمانے والا تھا، لیکن پھر اس ۳۰ روپے کا شوق، رغبت، اشتیاق اور اس کو حاصل کرنے کے لئے بار بار مچلنا یہ سب کیوں تھا؟

بات دراصل یہ ہے کہ نگاہ اس روپے پر نہیں تھی کہ ۳۰ روپے مل رہے ہیں، بلکہ نگاہ اس دینے والے کے ہاتھ کی طرف تھی، کہ وہ ۳۰ روپے کس دینے والے ہاتھ سے مل رہے ہیں۔ یہ ایک باپ کی طرف سے مل رہے ہیں، اور یہ ایک محبت کا اظہار ہے یہ ایک شفقت کا اظہار ہے، یہ ایک نعمت کا اظہار ہے لہٰذا اس کا ادب یہ ہے کہ اس کو اشتیاق کے ساتھ لیا جائے، اس کی قدر پہچانی جائے، چنانچہ اس کو خرچ نہیں کرتے تھے، بلکہ اٹھا کر لفافے میں بند کر کے رکھ دیتے کہ یہ میرے باپ کے دیئے ہوئے ہیں۔ اگر وہی ۳۰ روپے کسی دوسرے آدمی کی طرف سے ملیں، اور انسان اس میں لالچ اور رغبت کا اظہار کرے، اور اس سے کہے کہ مجھے ۳۰ روپے کے بجائے ۳۵ روپے دو، تو یہ شرافت اور مروت کے خلاف ہے۔

اسی کا نام تقویٰ ہے

دین درحقیقت زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، اور یہی زاویہ نگاہ جب بدل جاتا ہے تو قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی میں دنیا کے اندر جو کچھ کر رہا ہوں، چاہے کھا رہا ہوں، چاہے سو رہا ہوں، چاہے کما رہا ہوں اللہ کے لئے کر رہا ہوں، اللہ کے احکام کے مطابق کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کی مرضی پیش نظر رکھ کر کر رہا ہوں، اور پھر اس تقویٰ کے ساتھ تجارت کریں، تو یہ تجارت دنیا نہیں بلکہ یہ دین ہے، اور یہ جنت تک پہنچانے والی ہے، اور نبیوں کے ساتھ حشر کرانے والی ہے۔

صحبت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے

عموماً دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح حاصل ہو؟ یہ زاویہ نگاہ کس طرح بدلا جائے؟ تو اس کے جواب کے لئے میں نے شروع میں یہ آیت تلاوت کی تھی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾(۱)

(۱) التوبة: ۱۱۹

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو۔ قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس پر عمل کرنے کا راستہ بھی بتاتا ہے اور ایسا راستہ بتاتا ہے جو ہمارے اور آپ کے لئے آسان ہوتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ محض کسی کام کا حکم نہیں دیتے بلکہ ساتھ میں ہماری ضروریات، ہماری حاجتیں اور ہماری کمزوریوں کا احساس فرما کر ہمارے لئے آسان راستہ بھی بتاتے ہیں، تو تقویٰ حاصل کرنے کا آسان راستہ بتادیا:

﴿ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴾

''سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو''

یہ صحبت جب تمہیں حاصل ہوگی تو اس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر بھی تقویٰ پیدا ہوجائے گا۔ ویسے کتاب میں تقویٰ کی شرائط پڑھ کر تقویٰ اختیار کرنے کی کوشش کروگے تو یہ راستہ بہت مشکل نظر آئے گا، لیکن قرآن نے اس کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ بتلادیا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی دولت عطا فرمائی ہو دوسرے لفظوں میں جس کو صدق کی دولت حاصل ہو، اس کی صحبت اختیار کرلو، کیونکہ صحبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کی جاتی ہے، اس کا رنگ رفتہ رفتہ انسان پر چڑھ جاتا ہے۔

ہدایت کے لئے صرف کتاب کافی نہ تھی

اور دین کو حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کا بھی یہی راستہ ہے، نبی کریم سرور دو عالم ﷺ اسی لئے تشریف لائے، ورنہ سیدھی بات تو یہ تھی کہ صرف قرآن کریم نازل کردیا جاتا، اور مشرکین مکہ کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ ہمارے اوپر قرآن کریم کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کتاب اس طرح نازل کردیتے کہ جب لوگ صبح بیدار ہوتے تو ہر شخص بہت اچھا اور خوبصورت بائنڈنگ شدہ قرآن کریم اپنے سرہانے موجود پاتا، اور آسمان سے آواز آجاتی کہ یہ کتاب تمہارے لئے بھیج دی گئی ہے اس پر عمل کرو۔ تو یہ کام اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب رسول کے بغیر نہیں بھیجی، ہر کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجا ہے، رسول تو کتاب کے بغیر آئے ہیں، لیکن کتاب بغیر رسول کے نہیں آئی، کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اور اس کو کسی خاص رنگ پر ڈھالنے کے لئے صرف کتاب کبھی کافی نہیں ہوتی۔

صرف کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننے کا نتیجہ

اگر کوئی شخص چاہے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتاب پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں، اور پھر اس نے وہ کتاب پڑھ لی، اور اس کو سمجھ بھی لیا اور اس کے بعد اس نے ڈاکٹری اور علاج شروع کر دیا تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے وہ کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا، جب تک وہ کسی ڈاکٹر کی صحبت اختیار نہ کرے اور اس کے ساتھ کچھ مدت تک رہ کر کام نہ کرے، اس وقت تک وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا، اور میں تو آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ بازار میں کھانا پکانے کی کتابیں موجود ہیں، جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں، پلاؤ اس طرح بنتا ہے، بریانی اس طرح بنتی ہے، قورمہ ایسے بنتا ہے، اب اگر ایک شخص صرف وہ کتاب اپنے سامنے رکھ کر بریانی بنانا چاہے گا تو خدا جانے وہ کیا ملغوبہ تیار کرے گا، جب تک کہ کسی ماہر کے ساتھ رہ کر اس کی ٹریننگ حاصل نہ کی، اور اس کو سمجھا نہ ہو، اس وقت تک وہ بریانی تیار نہیں کر سکتا۔

متقی کی صحبت اختیار کریں

یہی معاملہ دین کا ہے کہ صرف کتاب انسان کو کسی دینی رنگ میں ڈھالنے کے لئے کافی نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی معلم اور مربی اس کے ساتھ نہ ہو، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ مرتبہ حاصل ہوا، صحابہ کے کیا معنی ہیں؟ صحابہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، انہوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل کیا، پھر اسی طرح تابعین نے صحابہ کی صحبت سے اور تبع تابعین نے تابعین کی صحبت سے حاصل کیا تو کچھ دین ہم تک پہنچا ہے وہ صحبت کے ذریعہ پہنچا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی تقویٰ حاصل کرنے کا راستہ یہ بتا دیا کہ اگر تقویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ کسی متقی کی صحبت اختیار کرو، اور پھر اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے اندر بھی وہ تقویٰ پیدا فرما دیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی حقیقت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ



تجارت کی فضیلت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿فَـإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(١)

قرآن کریم میں بکثرت یہ تعبیر آئی ہے کہ اللہ کا فضل تلاش کرو، اس تعبیر کی تفسیر اکثر حضرات مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد تجارت ہے گویا تجارت کو "ابتغاء فضل اللہ" سے تعبیر کیا ہے، اللہ کا فضل تلاش کرو، اس سے تجارت کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے، تجارت کو محض دنیاوی کام نہ سمجھو بلکہ یہ اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کے مترادف ہے۔

قرآن میں مال و دولت کا ذکر

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں دنیا اور مال و دولت کے لئے بعض جگہ پر ایسے کلمات استعمال کئے گئے ہیں جو ان کی قباحت اور شناعت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً:

﴿إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾(٢)

﴿وَّ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾(٣)

اور ان کے لئے تعریفی کلمات بھی ہیں، جیسے:

﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾(٤)

☆ انعام الباری (۶/۷۱ تا ۷۵)، زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے تجارت کی فضیلت اور اس کے اسلامی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی ہے۔

(١) الجمعة: ١٠، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ، اور اللہ کا فضل تلاش کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو"

(٢) التغابن: ١٥، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "بے شک تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش ہے"

(٣) الحديد: ٢٠، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے"

(٤) الجمعة: ١٠، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "اور ڈھونڈو فضل اللہ کا"

اس آیت میں تجارتی نفع کو فضل اللہ سے تعبیر کیا جارہا ہے، اور بعض جگہ مال کے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا گیا، جیسے:

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾(۱)

''اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے''

''الخیر'' یہاں مال کے معنی میں ہے تو ایک ظاہر بین انسان کو بعض اوقات ان دونوں قسم کی تعبیرات میں تعارض و تضاد محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تو کہہ رہے تھے کہ متاع الغرور یعنی دھوکہ کا سامان ہے اور ابھی کہہ رہے ہیں کہ فضل اللہ اور خیر ہے۔

حقیقت میں یہ تعارض نہیں بلکہ یہ بتانا منظور ہے کہ دنیاوی مال واسباب جتنے بھی ہیں یہ انسان کی حقیقی منزل اور منزل مقصود نہیں، بلکہ منزل مقصود آخرت اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ہے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ان اسباب کی ضرورت ہے ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، لہٰذا جب تک انسان ان اسباب کو محض راستہ کا ایک مرحلہ سمجھ کر استعمال کرے منزل مقصود قرار نہ دے تو اس وقت تک یہ خیر ہے، اور جب انسان ان کو منزل مقصود بنالے تو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس منزل مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنا شروع کردے، تو یہ فتنہ اور متاع الغرور ہے۔ لہٰذا جب تک دنیا اور اس کا مال واسباب محض وسائل کے طور پر استعمال ہو اور جائز حدود میں استعمال کیا جائے تو اس وقت تک اللہ کا فضل اور خیر ہے۔ اور جب اس کی محبت دل میں گھر کر جائے اور انسان اس کو منزل مقصود بنالے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ اختیار کرنا شروع کردے تو وہ فتنہ اور متاع الغرور یعنی دھوکہ کا سامان ہے۔

دنیا میں مال واسباب کی مثال

علامہ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی پیاری مثال دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو دنیا کے مال واسباب جتنے بھی ہیں ان کی مثال پانی کی سی ہے اور تیری مثال اے انسان! کشتی کی سی ہے، کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی، کشتی کے لئے پانی اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک کشتی کے چاروں طرف ہو، نیچے ہو دائیں ہو بائیں ہو، لیکن اگر پانی اندر آجائے تو اس کو ڈبودے گا اور غرق کردے گا:

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

(۱) العادیات:۸

”جب تک پانی کشتی کے نیچے ہو تو اس کو سہارا دیتا ہے، اس کو آگے بڑھاتا ہے اگر کشتی کے اندر گھس جائے تو کشتی کی ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے“

حدیث میں ہے:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ)) (۱)

اور دوسری حدیث میں ہے:

((اَلتُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ)) (۲)

تو جو آدمی اس کو راستے کا مرحلہ سمجھے اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں اس کو استعمال کرے تو وہ نعمت اور فضل اللہ ہے، اور جہاں آدمی اس کی محبت میں مبتلا ہو جائے اور اسکی وجہ سے حرام و حلال کی حدود کو پامال کر دے تو وہ متاع الغرور ہے۔ قرآن و حدیث نے اس حقیقت کو سمجھایا ہے۔

مسلمان تاجر کا خاصہ

اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿فَإِذَا قُضِیَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۳)

”پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا“

یعنی اللہ کا فضل تلاش کرو، تجارت کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تجارت کر رہے ہو تو بھی ذکر اللہ جاری رہنا چاہئے، کیونکہ اگر تجارت میں اللہ کی یاد فراموش ہوگئی اللہ کا ذکر نہ رہا تو وہ تجارت تمہارے دل میں گھس کر تمہاری کشتی کو ڈبو دے گی، اس واسطے ”وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ“ کے ساتھ ”وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا“ کا لاحقہ لگا دیا کہ تجارت کے ساتھ بھی اللہ کی یاد ہونی چاہئے۔ یہ نہ ہو:

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی ایاهم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷، حدیث کا ترجمہ یہ ہے ”سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا“

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی ایا لهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦، حدیث کا ترجمہ یہ ہے ”تاجر قیامت کے دن اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ وہ گناہ گاروں کی حالت میں ہوں گے لیکن وہ تاجر اس میں شامل نہیں جو تقویٰ اختیار کریں، نیکی سے تجارت کریں اور سچ سے کام لیں“

(۳) الجمعة: ۱۰

﴿یَآأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾(۱)

''یعنی مال و دولت اور اہل و عیال تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کردیں''

مسلمان تاجر کا خاصا یہ ہے کہ وہ تجارت بھی کر رہا ہے لیکن ع

دست بکار و دل بیار

یعنی ہاتھ تو کام میں لگ رہا ہے لیکن دل اللہ کی یاد میں لگا ہوا ہے۔

اسی کی صوفیائے کرام مشق کراتے ہیں۔ اور تصوف اسی کا نام ہے کہ تجارت بھی کرو، اور زیادہ سے زیادہ ذکر اللہ بھی کرو۔ اب یہ کیسے کریں اور اس کی عادت کیسے ڈالیں؟ تو صوفیائے کرام اسی فن کو سکھاتے ہیں کہ تم تجارت بھی کر رہے ہوگے اور اللہ کا ذکر بھی جاری رکھو گے۔

میرے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے ہم عمر تھے، یعنی جس سال دار العلوم دیوبند قائم ہوا اسی سال ان کی ولادت ہوئی، ساری عمر دار العلوم دیوبند میں گزاری، وہیں پڑھا اور وہیں پڑھایا، وہ فرماتے تھے:

''ہم نے دار العلوم دیوبند میں وہ زمانہ دیکھا کہ جب اس کے شیخ الحدیث سے لے کر اس کے دربان اور چپڑاسی تک سب صاحب نسبت ولی اللہ تھے''

چوکیدار چوکیداری کر رہا ہے دروازے پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے لطائف ستہ جاری ہیں۔

دادا جی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ہی دورہ حدیث پڑھا تھا، فرماتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے منطق کی کتاب ملاحسن کا سبق پڑھتے تھے، حضرت سبق پڑھا رہے ہوتے تھے تقریر کر رہے ہوتے تھے، تو ہمیں ان کے دل سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔

آیت کریمہ کا یہی مطالبہ ہے اور یہی کچھ حضرات صوفیائے کرام سکھاتے ہیں کہ کسی طرح تمہارا کام بھی چل رہا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ بھی تم مشغول ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بدعت نکال لی ہے، یہ کوئی بدعت وغیرہ نہیں بلکہ قرآن مجید کی اس آیت پر عمل ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا إِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○﴾(۲)

(۱) المنافقون:۹ (۲) الجمعۃ:۱۰-۱۱

''اور یاد کرو اللہ کو بہت سا تا کہ تمہارا بھلا ہو، اور جب دیکھیں سودا بکتا یا کچھ تماشا متفرق ہو جائیں اس کی طرف اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا، تو کہہ جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے تماشے سے اور سوداگری سے اور اللہ بہتر ہے روزی دینے والا''

آیت کا شان نزول

اس آیت کا شان نزول بخاری میں کتاب الجمعہ میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جمعہ کے روز خطبہ فرمارہے تھے کہ اس وقت کچھ لوگ اونٹوں پر کچھ سامان تجارت لے کر آ گئے تو بعض حضرات اس کو دیکھنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے کہ کیا سامان لے کر آئے ہیں، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جب وہ کوئی تجارت دیکھتے ہیں یا لہو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ کے چلے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، تو یہاں تجارت بھی ہے اور لہو بھی ہے۔(۱)

''لہو'' کی وضاحت

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''لہو'' کا لفظ تجارت کے لئے ہی استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ تجارت انسان کو ذکر اللہ سے غافل کر دیتی ہے اس لئے وہ ''لہو'' بن جاتی ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''لہو'' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ سامان تجارت لے کر آئے تھے ان کے ساتھ ڈھول ڈھما کا بھی تھا تو وہ تجارت بھی تھی اور ساتھ ''لہو'' بھی تھا۔ اس لئے دونوں کا ذکر فرمایا۔(۲)

''الیھا'' کی ضمیر مفرد ہونے کی وجہ

''الیھا'' میں ضمیر صرف تجارت کی طرف لوٹائی ہے ورنہ ''الیھما'' کہتے، لیکن ضمیر مفرد کی لائے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ ان کا مقصود اصلی تجارت کے لئے جانا تھا نہ کہ ''لہو'' کے واسطے تھا، بلکہ ''لہو'' ضمنی طور پر تھا۔

﴿وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِندَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ﴾

ابھی تو کہہ رہے تھے ''مِنْ فَضْلِ اللّٰه'' اور اب فرمارہے ہیں:

(۱) تفسیر ابن کثیر (۳۷۰/۴)، قدیمی کتب خانہ، کراچی

(۲) عمدۃ القاری (۱۲۲/۵)

﴿عِندَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ﴾

وہی بات آ گئی کہ جب تک وہ تجارت تمہیں اللہ کے ذکر اور اس کے حکم سے غافل نہیں کر رہی تھی تو وہ فضل اللہ تھا لیکن جب اس نے غافل کر دیا تو پھر وہی تجارت اللہ سے دوری کا ذریعہ بن گئی۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ اگر اللہ کے فلاں حکم پر عمل کریں گے والعیاذ باللہ اس سے ہمارا نقصان ہو جائے گا، تو یہ وہم شیطان کا ہے، یہ دل سے نکال دو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾(۱)

"نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی میں"

یہ آیت کریمہ بھی تجارت کے اصول بیان کر رہی ہے کہ باطل طریقہ سے اموال کمانا حرام ہے اور صرف اس طرح حلال ہے کہ جس میں دو شرطیں پائی جا رہی ہوں، ایک یہ ہے کہ تجارت ہو دوسرا یہ کہ باہمی رضامندی سے ہو۔

سودے کے صحیح ہونے کے لئے تنہا رضامندی کافی نہیں

معلوم ہوا کہ تنہا باہمی رضامندی کسی سودے کے حلت کے لئے کافی نہیں، باہمی رضامندی سے ایک سودا ہو گیا تو تنہا باہمی رضامندی کافی نہیں:

﴿إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾

(مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے) جب تک تجارت نہ ہو اور تجارت سے مراد وہ معاملہ جو اللہ کے نزدیک تجارت ہے۔ لہٰذا سود کا جو لین دین ہوتا ہے اس میں باہمی رضامندی سے وعدہ ہوتا ہے، باہمی رضامندی سے جوے کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور سٹہ کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب ممنوع ہے، اس واسطے کہ یہ اگرچہ باہمی رضامندی تو ہے لیکن تجارت نہیں ہے، اور اگر تجارت ہو لیکن باہمی رضامندی نہ ہو تو یہ بھی حرام ہے۔ تو بیک وقت دو شرطیں ہیں، تجارت بھی ہو اور باہمی رضامندی بھی ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

(۱) النساء: ۲۹

تدبیر اور روزگار ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كَانَ يَعْزِلُ نَفَقَةَ أَهْلِهِ سَنَةً"(۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل وعیال کا ایک سال کا نفقہ جدا کر کے الگ رکھ لیا کرتے تھے کہ یہ سال بھر اہل وعیال کے نفقہ میں خرچ کیا جائے گا۔

یہ عادت بیان فرمائی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ تمام ازواج مطہرات کا سال بھر کا نفقہ ان کے گھروں میں پہنچا دیا جاتا تھا اور خود آپ کا نفقہ بھی اس میں شامل ہوتا تھا۔ البتہ وہ ازواج مطہرات بھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تھیں، سال بھر کا نفقہ یا خرچہ پہنچ تو جاتا تھا لیکن صدقہ خیرات کثرت سے کرنے کا معمول تھا، اس لئے ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بعض اوقات تین تین مہینوں تک آگ نہیں جلتی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہم تین متواتر چاند دیکھتے تھے اور اس پورے عرصے میں گھر کے اندر آگ نہیں جلی ہوتی تھی۔ جن صاحب سے یہ بیان فرما رہی تھیں انہوں نے پوچھا کہ پھر آپ کا گزارہ کس چیز پر ہوتا تھا؟ تو آپ نے فرمایا:

"اَلْأَسْوَدَانِ: اَلتَّمْرُ وَالْمَآءُ"(۲)

☆ ضبط وتحریر: محمد اویس سرور، تاریخ ضبط: ۲ اپریل ۲۰۱۰ء

(۱) إحياء علوم الدين(۱/۲۲٤)

(۲) صحيح البخاری، كتاب الهبة وفضلها والحريض عليها، باب، رقم: ۲۳۷۹، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب، رقم: ۵۲۸۲، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب معيشة آل محمد، رقم: ٤١٣٥، مسند أحمد، رقم: ٢٣٢٨٤

''دو ہی چیزوں پر گزارہ ہوتا تھا، ایک کھجور ایک پانی''

لیکن تین تین مہینے تک آگ نہیں جلتی تھی، یہ بھی واقعات پیش آئے۔ یہ واقعات بھی پیش آئے کہ نبی کریم ﷺ نے پیٹ پر پتھر باندھے، یہ واقعات بھی پیش آئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور کبھی گندم تناول نہیں فرمایا، آپ کا کھانا جو کی روٹی کا ہوتا تھا۔(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے لئے کبھی کھانے کی چوکی نہیں بچھائی گئی، کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں بنائی گئی۔(۲)

چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں جو چٹنی اچار وغیرہ ہوتے ہیں جو بھوک بڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں وہ ساری عمر نہیں ہوئے۔ یہ سارے واقعات پیش آئے۔ اس کے باوجود یہ فرمایا جا رہا ہے کہ سارے سال کا نفقہ اٹھا کر ایک طرف کر لیا جاتا تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ نفقہ تو سال بھر کا اکٹھا ہو گیا۔ لیکن صدقہ خیرات کرنے کا معمول کثرت سے تھا خود آپ کا بھی اور آپ کی ازواج مطہرات کا بھی۔ اس کی وجہ سے یہ حالات بھی پیش آتے تھے۔ تو اس طرح حضور ﷺ نے دو مختلف اور متضاد پہلوؤں کو اپنی سنت قرار دے دیا۔

ضروریات کا اہتمام توکل کے منافی نہیں

ایک طرف یہ تعلیم دے دی اپنے عمل سے کہ سال بھر کا نفقہ سال بھر کا خرچہ اکٹھا کر لینا یہ کوئی شریعت کے خلاف یا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ سال بھر کا اگر خرچہ اکٹھا جمع کریں گے تو یہ توکل کے خلاف ہو جائے گا اللہ پر بھروسہ نہیں رہے گا یہ بات صحیح نہیں۔ اگر سال بھر کا خرچہ اکٹھا جمع کر لے انسان تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ کسی مصلحت سے بقدر ضرورت ذخیرہ رکھ لینا نہ توکل

(۱) صحيح البخاری، كتاب الأطعمة، باب ما كان النبی صلى الله عليه وسلم وأصحابه يأكلون، رقم:۴۹۹۶، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب، رقم:۵۲۷۴، سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء فی معشية النبی وأهله، رقم:۲۲۸۰، مسند أحمد، رقم:۲۳۰۲۲

(۲) صحيح البخاری، كتاب الأطعمة، باب الخبز المرقق والأكل على الخوان والسفرة، رقم:۴۹۶۷، سنن الترمذی، كتاب الأطعمة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء علام ما كان يأكل رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم:۱۷۱۰، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل على الخوان والسفرة، رقم:۳۲۸۳، مسند أحمد، رقم:۱۱۸۴۸

کے منافی ہے اور نہ کمال توکل کے۔ کیونکہ حضور ﷺ کے کامل ہونے میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ اگر کمال توکل کے خلاف ہوتا تو سرکار دو عالم ﷺ یہ کبھی نہ کرتے۔ آپ سے زیادہ کامل توکل رکھنے والا کون ہوگا۔ تو اس واسطے نہ توکل کے خلاف ہے نہ کمال توکل کے خلاف ہے۔ اور وہ مصلحت عام ہے خواہ عیال کی مصلحت ہو خواہ نفس کی مصلحت ہو، اس کے لئے اگر ذخیرہ کر کے رکھ لیا سال بھر کا تو یہ کوئی توکل کے خلاف نہیں۔

توکل کی اصل حقیقت

توکل درحقیقت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ پر بھروسہ ہو اگرچہ میں اسباب اختیار کر رہا ہوں، اس واسطے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے۔ اس لئے اسباب اختیار کر رہا ہوں لیکن اسباب میں کچھ نہیں رکھا بلکہ یہ اسباب اس وقت تک کارآمد نہیں جب تک مسبب یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں تاثیر پیدا نہ کریں۔ سال بھر کا نفقہ اٹھا کر رکھ لیا پھر بھی بھروسہ اس سال بھر کے جمع شدہ اندوختے پر نہیں بھروسہ اللہ ہی پر ہے۔ اپنی طرف سے جو تدبیر تھی وہ کرلی سال بھر کا اکٹھا کرلیا لیکن کچھ بھروسہ نہیں سال بھر میں یہ کہیں ضائع ہو جائے ہلاک ہو جائے کیڑا لگ جائے نقصان ہو جائے چوری ہو جائے ڈاکہ پڑ جائے ہزار احتمال ہے۔ تو اپنی طرف سے تدبیر کرلی لیکن بھروسہ اللہ پر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رزق دینے والا ہے وہی کفالت کرنے والا ہے۔ تو اسباب کو اختیار کرنے کے ساتھ صرف اللہ پر بھروسہ رکھا جائے۔

انسانی مزاج کا فرق

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات دین کے اندر یہ بھی مطلوب ہے کہ انسان کے دل کو اطمینان حاصل ہو اور جمعیت خاطر ہو۔ تشویش نہ ہو اور پریشانی نہ ہو۔ لہٰذا طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو کچھ پرواہ نہ ہوتی، جمع ہے کچھ نہیں ہے ذخیرہ ہے کہ نہیں ہے ان کے روزمرہ کے معمولات میں کام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو ضرورت ہوتی ہے اس بات کی کہ جب تک ظاہری اسباب نظر نہ آجائیں اس وقت تک پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ جمعیت خاطر نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا انوکھا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس سرہ سے سنا کہ ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ وہ ایک

دن بیٹھے ہوئے دعا کر رہے تھے:

''یا اللہ مجھے تو آپ سال بھر کا خرچہ اکٹھا ایک مرتبہ دے دیجئے''

یہ دعا وہ بہت گڑگڑا کر مانگ رہے تھے۔ وہ بزرگ انتہائی صاحب کشف و کرامات تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی وقت الہام ہوا کہ کیا تمہیں ہمارے اوپر بھروسہ نہیں جو سال بھر کا اکٹھا مانگ رہے ہو آج کا مانگو کل کا کل کو دیکھا جائے گا۔

جواب میں کہنے لگے کہ یا اللہ! بھروسہ تو ہے آپ کی ذات پر لیکن یہ کم بخت شیطان ہر وقت مجھے بہکاتا رہتا ہے کہ کل کو کیا کھائے گا؟ پرسوں کو کیا کھائے گا؟ اور اولاد کو کیا کھلائے گا؟ یہ دل میں تشویش پیدا کرتا رہتا ہے، پریشانی پیدا کرتا رہتا ہے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ یہ تشویش رفع ہو جائے، جب وہ دل میں بات ڈالے گا کہ کل کو کیا کھلائے گا تو اشارہ کردوں گا دیکھ یہ رکھا ہے۔ تو جب اشارہ کردوں گا تو اب اس کے بعد تشویش کرنے کی عقوبت ختم ہو جائے گی، اس واسطے سے اکٹھے مانگ رہا ہوں۔

ان کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور انہیں سال بھر کا نفقہ عطا فرما دیا۔

چونکہ نیت درست تھی، نیت یہ کہ جمعیت خاطر اور ہو دل مطمئن رہے۔ جب انسان کو اطمینان ہو جائے تو اس کو اپنے کام کے اندر شرحِ صدر بھی حاصل ہوتا ہے، تقویت بھی ہوتی ہے، جمعیت خاطر بھی ہوتی ہے۔ اور یہ جمعیت خاطر اس طریق میں بڑی نعمت ہے دل کا پرسکون رہنا، تشویش سے محفوظ رہنا یہ اس طریق میں بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کے اس طریق کا حاصل ہے اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جانا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد کا دل میں بس جانا کہ ہر وقت دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے۔ یہ ہے جمعیت خاطر اور یہ جو تشویشات آتی رہی ہیں یہ ہم جیسے کمزور لوگوں کی جمعیت خاطر کو خراب کرتی ہیں، پھر عبادت میں بھی آدمی کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا، ذکر میں بھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا جبکہ طریق کا حاصل اور مقصد ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ دل کا جڑ جانا کہ جب خاموش بیٹھا ہے انسان تنہائی میں بیٹھا ہے اس وقت بھی دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے، قلب ذکر میں مشغول ہے، کیونکہ ایک حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''شیطان، انسان کے قلب کی تاک میں رہتا ہے''(۱)

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب فضل التأذين، رقم:٥٧٣، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب فضل الأذان وهرب الشيطان عند سماعه، رقم:٥٨٥، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب رفع الصوت بالأذان، رقم:٤٣٣، مسند أحمد، رقم:٧٧٩٢

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کو یاد کر رہا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوتا ہے اللہ کی طرف دھیان ہوتا ہے تو یہ شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اور جب غفلت میں ہوتا ہے تو غفلت کی حالت میں وسوسے ڈالتا ہے۔

انسانی دل کی دو حالتیں

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا یا تو اس کا دل مشغول ہوگا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں یا پھر مشغول ہوگا شیطانی وساوس میں تیسرا حال نہیں۔ اگر اللہ کے ذکر میں مشغول نہیں ہے تو شیطان طرح طرح کے وسوسے دل میں ڈالتا رہے گا۔ لہٰذا شیطانی وساوس سے بچنے کا راستہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر، اور ذکر یہ عام ہے، چاہے زبان سے ہو، چاہے دل سے ہو، چاہے تسبیح کی شکل میں ہو، چاہے نماز کی شکل میں چاہے، صدقہ خیرات کی شکل میں ہو، چاہے کسی اور اطاعت کی شکل میں ہو۔ جو بھی اطاعت کا کام انسان کر رہا ہے وہ ذکر کے اندر داخل ہے۔

ہر اطاعت، ذکر اللہ کے مترادف ہے

علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ حصن حصین میں فرماتے ہیں:

"كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ"

"جو بھی اللہ کی اطاعت کا کام کر رہا ہو، وہ ذاکر ہے"

یعنی جو بھی اطاعت کا کام کر رہا ہے ذکر کرنے والے میں داخل ہے، یہاں تک کہ کسب رزق میں مشغول ہے لیکن صحیح نیت کے ساتھ ہے کہ اپنے حق کو ادا کرنا مقصود ہے اور صحیح طریقے کے ساتھ ہے کہ حلال طریقے سے حاصل کرنا مقصود ہے حرام سے بچنا مقصود ہے تو وہ بھی ذکر کا ایک فرد ہے۔

پس جتنی بھی اطاعات ہیں وہ ساری کی ساری ذکر کا فرد ہیں یا تو انسان اس میں مشغول رہے گا یا پھر اگر اس میں مشغول نہیں رہتا اپنے قلب کو اس میں مشغول نہیں کرتا تو پھر شیطانی وساوس کا شکار ہوگا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دل کو اللہ کے لئے فارغ رکھو۔

دل کو اللہ کے لئے فارغ کیجئے!

میرے والد ماجد ایک مرتبہ سنا رہے تھے کہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خانقاہ سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب خانقاہ سے گھر کی طرف تشریف لے جاتے تھے تو

عوام کو یہ ہدایت تھی کہ کوئی آدمی ساتھ نہ چلے، ساتھ چلنا منع تھا، اس واسطے کہ یہ جو پیروں کی ہیئت ہوتی ہے کہ پیر صاحب جارہے ہیں تو ایک خلقت دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے ان کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس ادا کو حضرت پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے عام طور سے ممانعت تھی کہ جب میں اٹھ کر جاؤں، جتنی بات کرنی ہے پہلے کرلو، پھر جب میں جانے لگوں تو میرے ساتھ دائیں بائیں نہ چلو مجھے تنہا جانے دو۔ اور یہ بھی ہدایت تھی کہ کوئی میرا سامان نہ اٹھائے جو میں لے کر جارہا ہوں، جو سامان میرے ہاتھ میں ہے میں خود لے کر جاؤں گا کوئی آدمی آگے بڑھ کر اس کو نہ اٹھائے۔

وجہ یہ ہے کہ حضرت فرماتے تھے کہ بھائی میں تو خادم ہوں مخدومیت سے مجھے کیا کام؟ میں تو خادم ہوں اس واسطے یہ بات کہ کچھ مریدین آگے چل رہے ہیں کچھ پیچھے چل رہے ہیں کچھ دائیں چل رہے ہیں کچھ بائیں چل رہے ہیں کوئی سامان اٹھا رہا ہے۔ یہ بات حضرت کو پسند نہیں تھی، بس عام آدمی جس طرح جاتے ہیں اس طریقے سے جایا کرتے تھے۔ لیکن کبھی حضرت کے کچھ خاص مزاج شناس خدام کسی ضرورت کی وجہ سے ساتھ ہو جائیں تو ایسے موقع پر منع بھی نہیں فرماتے تھے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق تھا تو فرمانے لگے میں ایک دن حضرت کے ساتھ خانقاہ سے گھر کی طرف چلا، چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ اچانک حضرت نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور لکھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ پھر فرمانے لگے "تم نے دیکھا مولوی شفیع میں نے یہ کیا کیا؟"

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا "حضرت بیان فرمادیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی"

اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"مجھے ایک کام یاد آیا کہ وہ کام کرنا ہے تو اس کا دل پر بوجھ تھا، میں نے وہ کاغذ پر لکھ لیا۔ دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر دیا۔ اب الحمدللہ دل فارغ ہے۔ یہ دل تو حقیقت میں ایک ہی چیز کے لئے ہے اور وہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر۔ جب کوئی تشویش آئے اور کوئی بوجھ آئے تو حتی الامکان اس تشویش اور بوجھ کو جلدی سے ختم کرنے کی کوشش کرو تا کہ دل فارغ ہو جائے اس ذات کے لئے جس ذات کے لئے یہ بنایا گیا ہے"

دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے

یہ دل تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی گاہ ہے، لہٰذا ہونا یہ چاہئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر ہو،

تو دل کو فارغ کر لیا دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر کے۔ اور پھر فرمایا کہ بس کوشش یہ کرو کہ دل میں اِدھر اُدھر کے جو تشویشات ہیں وہ نہ ہوں بس وہ ایک کام میں مشغول رہے جس کام کے لئے وہ پیدا کیا گیا۔ تو یہ ہے جمعیت خاطر کا حصول!

میں نے اپنے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے سنا (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) حضرت مرض الوفات میں بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں بند کی ہوئی ہیں، معالجین نے لوگوں سے ملاقات منع کر رکھی ہے کہ کوئی ملاقات نہ کرے بیماری کی وجہ سے اس حالت میں کوئی آتا اور آ کر کہتا کہ حضرت فلاں دوا کا وقت ہو گیا ہے دوا پی لیجئے۔ خیر دوا پی لی۔ کوئی اور آ گیا ان سے طبیعت پوچھ لی کہ حضرت کیسے مزاج ہیں؟ اس طرح مختلف لوگ آ آ کر باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن مولانا شبیر علی صاحب جو حضرت کی خانقاہ کے ناظم تھے ان سے فرمایا:

"بھائی مولوی شبیر علی صاحب جو ضرورت کی بات ہو وہ پوچھ لیا کرو، باقی اور زیادہ آ کر سوالات کرنے سے کچھ حاصل نہیں اور کیوں ایک مشغول آدمی کو پریشان کر رہے ہو"

مطلب یہ کہ دل تو لگا ہوا ہے کسی اور طرف اور اس وقت میں آ کر آپ باتیں کر رہے ہو مختلف قسم کے مسائل میرے سامنے چھیڑ دیتے ہو اس سے دل کسی اور طرف منتقل ہو جاتا ہے تو مشغول آدمی کو کیوں پریشان کرتے ہو۔

اصل یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہے، ورنہ پھر وہ شیطانی وساوس کا محل بن جاتا ہے، اس لئے جمعیت خاطر اس طریق میں بہت مطلوب ہے، اور جس شخص کو جمعیت خاطر اسباب کے حصول کے بغیر حاصل نہ ہو اس کو چاہئے کہ اسباب حاصل کرے، تاکہ اطمینان ہو، تکلیف رفع ہو اور جمعیت خاطر حاصل ہو، اور ان اسباب کو یہ سمجھنا کہ توکل کے منافی ہو گئے یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ توکل کے منافی نہیں۔ اس لئے کہ اسباب کو درجہ اسباب میں اختیار کیا جا رہا ہے حقیقی بھروسہ اللہ پر ہے کہ ان اسباب میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ پیدا نہ کریں۔

حصولِ رزق کی فکر ممنوع نہیں

رزق کے حاصل کرنے کی فکر اور رزق حلال حاصل کرنے کی فکر میں چاہے وہ ذخیرہ کرنے کی ہی شکل میں ہو تو یہ نہ ممنوع بات ہے نہ مکروہ ہے نہ بری بات ہے، اور نہ توکل اور تقویٰ کے منافی

ہے بلکہ جمعیت خاطر کے حصول کے لئے ایسا کرنا اور زیادہ بہتر ہے۔ لیکن جو چیز بری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اس کے اندر اتنا منہمک ہو جائے کہ لگا تو تھا اس کام کے لئے کہ اپنے دل کو فارغ کرے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کے لئے اور اپنے اسباب کو تدبیر کے درجے میں اختیار کرلے۔ اور باقی وقت کو اللہ تعالیٰ کے کام میں لگائے۔ لیکن جب لگا تو اتنا منہمک ہوا کہ صبح سے لے کر شام تک شام سے لے کر صبح تک اور کوئی خیال آتا ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ پیسے سے پیسہ کس طرح بناؤں اور دولت میں کیسے اضافہ کروں اسباب راحت مزید سے مزید جمع کروں دن رات اسی میں لگا ہوا ہے۔ یہ انہماک توکل کے خلاف ہے۔ یہ انہماک ہے بری بات ہے لیکن بقدر ضرورت اور ضرورت میں راحت بھی داخل ہے یہ بھی سمجھ لیں۔ یعنی ضرورت تو اس طرح بھی پوری ہوسکتی ہے کہ آدمی سال بھر کا اتنا نفقہ جمع کرلے جس میں دال روٹی سال بھر کی ہو جائے، خشک چاول اور دال کا حساب کر کے انسان جب جمع کرے تو ضرورت ویسے ہی پوری ہو جاتی ہے لیکن اتنا بھی شریعت نے کوئی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ اپنی راحت کے حساب سے جتنا اس کو مطلوب ہے اتنا اگر جمع کرلے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مولانا مسیح اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دن فرمانے لگے:

''دیکھو بھائی ہر شخص کی ضرورت اور ہر شخص کی حاجت اور راحت مختلف ہوتی ہے۔ ایک آدمی ہے وہ بیچارہ اکیلا رہتا ہے تو اس کے لئے تھوڑی چیز کافی ہو جائے گی، اور تھوڑی چیز سے اس کی ضرورت رفع ہو جائے گی۔ لیکن اس واسطے فقہاء کرام نے فرمایا کہ حاجات اصلیہ میں یہ ہے کہ تین جوڑے ہوں سال بھر کا راشن ہو تو حاجات اصلیہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اور ایک پیالہ یا پلیٹ ہو تو برتن کی ضرورت پوری ہوئی۔ لیکن ایک شخص ہے کہ جس کے پاس مہمان آتے ہیں تو اس کی حاجات پہلے شخص کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں تو اس واسطے وہ اگر اپنی حاجت کے مطابق جمع کر رہا ہے اپنی حاجت کے مطابق تدبیر کر رہا ہے تو اس میں کوئی شریعت کے خلاف بات نہیں''

میں نے ایک مرحلہ پر حضرت کو لکھا کہ میری اتنی آمدنی ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ مدرسے سے تنخواہ لینا بند کردوں۔ وہ اس واسطے کہ دوسرے ذریعہ سے جو آمدنی ہے ضرورت کے

مطابق پوری ہوجاتی ہے۔ تو حضرت نے اس کے اوپر لکیر کھینچ کر لکھا کہ یہ آپ کی ضرورت کو پورا کرنے والی مقدار نہیں ہے۔ لہٰذا لیں البتہ جو بچ جائے اس کو مدرسے میں اپنی طرف سے داخل کردیں۔

حصولِ روزگار میں افراط سے بچنا ضروری ہے

بات یہ چل رہی تھی کہ اپنی ضرورت کے مطابق ہر انسان جو کچھ جمع کرے وہ شریعت میں ناپسندیدہ بھی نہیں مکروہ بھی نہیں تصوف کے بھی خلاف نہیں، طریقت کے بھی خلاف نہیں، تقویٰ کے بھی خلاف نہیں۔

لیکن تقویٰ کے خلاف اور طریقت کے خلاف بات یہ ہے کہ دن رات ذہن پر بس اسی کی چکی چل رہی ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح میری دولت میں اضافہ ہوجائے، کس طرح سے میرا ایک کارخانہ ہے تو دو لگ جائیں، اور دو ہیں تو تین ہوجائیں اور کس طرح میرے بینک بیلنس میں اضافہ ہوجائے، اور کس طرح مجھے تعیّشات حاصل ہوجائیں دن رات اسی فکر میں لگا ہوا ہے یہ ہے بری بات۔ اس سے بچنے کی ضرورت ہے اب یہ کہ کس طرح بچیں؟ کس طرح حد فاصل قائم کریں؟ کہ کہاں ضرورت کی حد ختم ہوگئی اور کہاں تعیّشات کی حد شروع ہوگئی۔ تو یہ وہی بات ہے جو آپ سے بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ دو اور دو چار کرکے اس کا کوئی فارمولا نہیں بتایا جاسکتا، یہ چیز تو محض صحبت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، کسی کامل شیخ کی رہنمائی سے پتہ چلتا ہے کہ اب آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں اپنے آپ کو دن رات ہر وقت اسی فکر میں لگائے رکھنا اس سے پناہ مانگی گئی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا))(۱)

یا اللہ! ایسا نہ ہو کہ دنیا ہی کا خیال ہمارے تمام خیالات پر غالب آجائے، سب سے بڑی فکر سب سے بڑی دھن یہ دنیا بن جائے کہ دنیا کس طرح حاصل ہو اور پیسے کہاں سے حاصل ہوں، اور نہ ایسا ہو کہ ساری معلومات جو ہیں وہ دنیا کے اندر محدود ہوکر رہ گئی ہیں، اور ہماری پسند ہماری رغبت اور ہمارے شوق کا مرکز دنیا ہی بن جائے۔ ہر وقت اسی کے خیال آرہے ہیں، ہر وقت اسی کی فکر میں پڑا ہوا ہے۔ یہ ہے بری بات اور اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

(۱) روضة المحدثين، رقم: ٣٣١٦ (٤١/٨)، الجامع الصغير وزيادته رقم: ٢١٤٨ (٢١٦/١) دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! دنیا کو ہمارا بڑا غم نہ بنا، سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنا اور نہ ہی اسے ہماری رغبت کی انتہاء بنا۔

اسلام کی معتدل تعلیم

آپ دیکھیں کیسی معتدل تعلیم ہے شریعت کی کہ ہماری ضرورت کو کہیں روکا نہیں اور ضرورت ہی نہیں راحت کو بھی نہیں روکا۔ لیکن ساتھ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کو آگے بڑھا کر اپنے اوپر مسلط مت ہونے دو، تدبیر اس لئے کرو تا کہ ذہن فارغ ہو جائے، دل فارغ ہو جائے اللہ کے لئے فارغ ہو جائے، الحمد للہ سال بھر کا اکٹھا کر لیا اب چلو اپنے کام میں متوجہ ہو جاؤ اللہ کی طرف یہ ہے مقصود۔ تو اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے، جمعیت خاطر کو پیدا کرنے کے لئے جتنی تدبیر کرنی ہے وہ کر لے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے دونوں باتیں کر کے دکھادیں، ایک طرف سال بھر کا نفقہ جمع کر کے دے دیا تا کہ پتہ چل جائے کہ یہ صورت جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، اور دوسری طرف اتنی خیرات کی اتنی خیرات کی کہ تین مہینے تک گھر میں آگ نہیں جل رہی ہے۔ دونوں باتیں کر کے دکھادیں۔

نبی کریم ﷺ کا زہد

فرشتہ آتا ہے آ کر کہتا ہے اگر آپ چاہیں تو اس احد پہاڑ کو سونے کے پہاڑ میں تبدیل کردیں سارا سونے کا بنادیں، یہ پیشکش ہوتی ہے فرشتے کی طرف سے۔ تو جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''نہیں مجھے تو یہ پسند ہے کہ ایک دن بھوکا رہوں ایک دن کھاؤں'' (۱)

اگر نبی کریم ﷺ یہ عمل نہ فرماتے تو یہ غریب فاقہ کش کہاں جاتے، ان غریب فاقہ کشوں کے لئے نبی کریم ﷺ نے خود عمل کر کے پیٹ پر باندھ کر مشکلیں سہہ کر پریشانیاں اٹھا کر اور ان کے واسطے تسلی کا سامان کر دیا کہ اے غریبو تم جن حالات سے گزر رہے ہو گھبراؤ نہیں محمد ﷺ کے اوپر بھی یہ حالات گزرے چکے ہیں۔ تم اگر غیر اختیاری طور پر ان حالات سے گزر رہے ہو تو آپ ﷺ اختیاری طور پر ان حالات سے گزرے۔ ان کے لئے تسلی کا سامان پیدا فرمادیا نبی کریم ﷺ نے۔ ہم جیسے کمزوروں کے لئے تسلی کا یہ سامان پیدا فرمادیا کہ سال بھر کا نفقہ اکٹھا جمع کر کے اپنا اسوہ بتادیا کہ یہ بھی میری سنت ہے۔ ہم جیسے کمزوروں کے لئے یہ بتادیا اور دوسرے لوگوں کے لئے جو فاقہ میں مبتلا ہوں ان کے لئے سنت یہ بتادی کہ دیکھو میری سنت یہ ہے تین مہینے تک میرے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی الکفاف والصبر علیہ، رقم: ۲۲۷۰، مسند أحمد، رقم: ۲۱۱۶۶

قربان جائیں نبی کریم ﷺ کی ایک ایک ادا پر کہ آپ ﷺ نے امت کے کسی طبقے کو اپنی سنت سے اپنے اسوہ سے محروم نہیں فرمایا۔ ایک مرتبہ ایک جبہ زیب تن فرمایا تو دس ہزار دینار تقریباً اس کی قیمت تھی، اتنی قیمت کا جبہ بھی زیب تن فرمایا، اور عام حالات میں پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی پہنے اپنے دست مبارک سے کپڑے بھی دھوئے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی زیب تن فرمائے۔ تو ساری امت کے لئے امت کے ہر طبقہ کے لئے اپنا اسوہ چھوڑ گئے کہ کسی کے لئے بھی رہنمائی میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ اس حدیث کا یہ نکلا کہ اپنے دل کی تشویش کو زائل کرنے کے لئے اور اطمینان پیدا کرنے کے لئے اگر کوئی آدمی ذخیرہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن نیت یہی ہونی چاہئے۔ نیت یہ نہیں کہ میں مالدار کہلاؤں، نیت یہ نہیں کہ میں اس کو مزید بڑھاؤں ایک وادی سونے کی مل جائے تو ایک ایک اور مل جائے۔ بلکہ نیت یہ ہو کہ تشویش سے میں بچ جاؤں اور میرے دل میں جمعیت پیدا ہو جائے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اپنے دل کو لگانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے یہ حقیقت ہمارے دلوں میں مرکوز فرمادے اور اس کے اوپر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ



تجارت کے کچھ آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ، وَإِذَا اشْتَرٰى، وَإِذَا اقْتَضٰى))(۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ رحم فرماتے ہیں اس شخص پر جو بیچتے وقت بھی اور خریدتے وقت بھی اور اپنا حق وصول کرتے وقت بھی نرم ہو''

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ آدمی پیسے پر جان دے، کوئی خریدار خریداری کے لئے آیا ہے آپ نے اس کی قیمت بتائی اور وہ اس قیمت کو ادا کرنے کا اہل نہیں ہے، تو آپ اس کے ساتھ کچھ نرمی کر دیں۔ یعنی اپنا نقصان نہ کریں لیکن اپنے منافع میں سے کچھ کم کر دیں تو یہ " سمحا اذا باع" ہے، یہ نہیں کہ صاحب قسم کھا کے بیٹھ گیا کہ میں تو اتنے ہی میں دوں گا چاہے کچھ ہو جائے تو اگر حالات ایسے ہیں کہ دیکھ رہا ہے کہ یہ خریدار ضرورت مند ہے اور پیسے اس کے پاس نہیں ہیں تو اس کے لئے نرمی کا معاملہ کرو۔ آگے فرمایا:

((وَإِذَا اشْتَرٰى))

اور اسی طرح چاہئے کہ خریداری کے وقت میں بھی نرم ہو، یعنی یہ نہیں کہ پیسے پر جان دے رہا

☆ انعام الباری (۶/۱۲۵ تا ۱۳۱) زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں تجارت کے کچھ آداب واحکام کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱) صحيح البخاری، كتاب البيوع، باب السهولة والسماحة فی الشراء والبيع ومن طلب حقا، رقم: ۱۹۳٤، سنن الترمذی، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء فی استقراض البعير أو الشیء من الحيوان، رقم: ۱۲٤۱، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب السماحة فی البيع، رقم: ۲۱۹٤، مسند أحمد، باقی مسند المكثرين، رقم: ۱٤۱۳۱

ہو اور پیسے کم کرانے میں شام تک حجت بازی کر رہا ہے اور اڑا ہوا ہے کہ نہیں کم ضرور کم کرو، بائع کے سر پر سوار ہوگیا تو یہ طریقہ مومن کا طریقہ نہیں۔ اگر آپ کرانا چاہتے ہیں تو ایک دو مرتبہ اس سے کہہ دو کہ بھائی اگر اس میں دے سکتے ہو تو دے دو مان لے تو ٹھیک اور نہ مانے تو بھی ٹھیک ہے، اگر اتنے پیسے دے سکتے ہو تو دے دو اگر نہیں تو خریداری نہ کرو، اس کے اوپر لڑائی کرنا یا مسلط ہو جانا یہ صحیح نہیں ہے۔

دکاندار سے زبردستی پیسے کم کرا کے کوئی چیز خریدنا

آج کل رواج ہے کہ زبردستی پیسے کم کروائے جاتے ہیں، مثلاً فرض کریں کہ آدمی دوسرے کے سر پر سوار ہو کر اس کو بالکل ہی زچ کر دے، یہاں تک کہ اس کے پاس چارہ ہی نہ رہا تو اس نے کہا کہ چلو بھئی اس بلا کو دفع کرو چاہے پیسوں کا کچھ نقصان ہی ہو جائے یہ کہہ کر اگر دکاندار مال دیدے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ چیز آپ کے لئے حلال بھی نہیں ہوگی، اس لئے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ مِنْهُ))(۱)

لہٰذا آپ نے تو اس سے زبردستی کم کرایا ہے طیب نفس اس کا نہیں تھا، لہٰذا حلال بھی نہیں ہوا اس لئے کم کرانے کے لئے زیادہ اصرار کرنا اور زیادہ پیچھے پڑنا مومن کی شان نہیں۔

یہ بھی دین کے مقاصد میں داخل ہے

فرض کریں کسی سواری کا کرایہ ہے تو دوسرے لوگ جتنے دیتے ہیں اس سے کچھ زیادہ دے دیں تاکہ ان کی قدر و منزلت دل میں قائم رہے، اہل علم کی قدر و منزلت قائم رہنا یہ بھی دین کے مقاصد میں سے ہے اور اگر تم دوسروں سے کم دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مولوی کی شکل دیکھ کر وہ بھاگے گا کہ یہ مولوی آگیا ہے میرے اوپر مصیبت بنے گا اور مجھے پیسے پورے نہیں دے گا، اس کے برخلاف دوسروں سے زائد دے دو گے تو تمہاری قدر و منزلت پیدا ہوگی۔

یہ سب دین کی باتیں ہیں یہ اخلاق نبوی ہیں جن کو حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہئے کہ اپنے عام معاملات میں آدمی نرمی کا برتاؤ کرے، اگر پیسے ہیں اور ضرورت کی چیز نہیں ہے تو مت خریدیں

(۱) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی مسلمان کا مال دوسرے کے لئے اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں''

لیکن زبردستی کرنا یا لڑنا جھگڑنا یہ مومن کا شیوہ نہیں ہے۔ آگے فرمایا:

((وَاِذَا اقْتَضٰی))

یعنی جب اپنا حق کسی سے مانگے تو اس میں بھی نرم ہو، یعنی تمہارا حق ہے وہ مانگ رہے ہو تو جیسا ابھی عرض کیا کہ مانگو لیکن نرمی کے ساتھ، اگر دوسرے آدمی کو کوئی عذر ہے تو اس عذر کا لحاظ کرو۔

اس کا بہترین اصول نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادیا کہ جب بھی کسی شخص سے معاملہ کرو تو معاملہ کرتے وقت اس کو اپنی جگہ بٹھالو اور اپنے آپ کو اس کی جگہ بٹھالو اور یہ سوچو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا پسند کرتا تو جو معاملہ تم اپنے حق میں پسند کرتے ہو وہی معاملہ اس کے ساتھ کرو۔ نبی پاک ﷺ نے ارشادفرمایا:

((أَحِبَّ لِأَخِيْكَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))(۱)

یہ نہیں کہ دو پیمانے بنالئے ہیں ایک پیمانہ اپنے لئے اور ایک پیمانہ دوسروں کے لئے بلکہ ایک ہی پیمانے سے اپنے عمل کو بھی اور دوسرے کے عمل کو بھی ناپو۔

یہ ایسا زریں اصول ہے کہ اگر آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کرے تو نہ جانے کتنی لڑائیاں، جھگڑے، طوفانِ بدتمیزیاں ختم ہوجائیں یعنی معاملات کے وقت اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو جتنا اصرار میں کررہا ہوں اگر یہ مجھ سے اتنا اصرار کرتا تو کیا میں اس کو پسند کرتا اگر نہ کرتا تو مجھے بھی اس کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے۔

زیرِنظر حدیث کا بھی یہی مطلب ہے:

((رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ، وَاِذَا اشْتَرٰی، وَاِذَا اقْتَضٰی))

مومنوں کی تجارت، کاروبار اور ان کے معاملات غیرمسلموں سے کچھ تو ممتاز ہوں پتہ چلے کہ ہاں یہ مومن کا کام ہے، یہ بھی معلوم ہو کہ میں کسی مسلمان سے معاملہ کررہا ہوں اور مسلمان بھی اگر اہل علم ہو تو اس کا تو اور زیادہ بڑا مرتبہ ہے، اس واسطے اس کو دوسروں کی بہ نسبت اور زیادہ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه، رقم:۱۲، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب منه، رقم:۲٤۳۹، سنن النسائی، کتاب الایمان وشرائعه، باب علامة الایمان، رقم:٤۹۳۰، مسند أحمد، رقم:۱۲٦۷۱، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اپنے بھائی کے لئے بھی وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔"

دنیا میں تاجروں کے ذریعے اشاعت اسلام

دنیا کے بہت سے حصوں میں تاجروں کے ذریعے اسلام پھیلا۔ کیونکہ اس کے لئے باقاعدہ کوئی جماعت نہیں گئی تھی کہ جو جا کے لوگوں کو دعوت دے، تاجر تھے، تجارت کرنے گئے تھے لوگوں نے ان کے تجارتی معاملات کو دیکھا اور مشاہدہ کیا کہ یہ کیسے با اخلاق لوگ ہیں ان کو دیکھ کر مسلمان ہوئے۔

آج مسلمان چلا جائے تو لوگ ڈرتے ہیں کہ اس کے ساتھ معاملہ کیسے کریں، دھوکہ یہ دے گا، فریب یہ کرے گا، جھوٹ یہ بولے گا، بدعنوانیوں کا ارتکاب یہ کرے گا اور جو باتیں ہماری تھیں وہ غیر مسلموں نے اپنا لیں۔ تو اس کے نتیجے میں اللہ نے دنیا میں ان کو کم از کم فروغ دے دیا، اب بھی امریکہ میں یہ صورتحال ہے کہ آپ ایک دوکان سے کوئی سودا خریدنے کے لئے گئے، ہفتہ گزر گیا ایک ہفتہ گزرنے کے بعد آپ دکاندار کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ بھائی یہ جو سیٹ میں نے لیا تھا یہ میرے گھر والوں کو پسند نہیں آیا اگر اس چیز میں کوئی نقص پیدا نہ ہوا ہو تو کہتے ہیں لاؤ کوئی بات نہیں، واپس کرلیں گے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَقَالَ نَادِمًا بَيْعَتَهُ أَقَالَ اللّٰهُ عَثْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۱)

ہمارے ہاں اگر واپس کرنے کے لئے جائے تو جھگڑا ہو جائے گا جبکہ وہ واپس کر لیتے ہیں۔

ان اصولوں کی پابندی غیر مسلم تاجروں کے ہاں ہے

امریکہ سے پاکستان ٹیلی فون کیا اور آپ نے ایک ڈیڑھ منٹ بات کی اس کے بعد ایکسچینج کو فون کر دیں کہ میں نے فلاں نمبر پر فون کرنا چاہا تھا مجھے رانگ نمبر مل گیا جس نمبر کو میں چاہ رہا تھا وہ نمبر نہیں ملا تو کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہم آپ کے بل سے یہ کال کاٹ دیں گے۔

اب ہمارے پاکستانی بھائی پہنچ گئے تو انہوں نے ٹائپ رائٹر خریدا مہینے بھر اس کو استعمال کیا اس سے اپنا کام نکالا ایک مہینے کے بعد جا کر کہا کہ پسند نہیں آیا لہٰذا واپس لے لیں۔ شروع شروع میں انہوں نے واپس لے لیا لیکن دیکھا کہ لوگوں نے یہ کاروبار ہی بنالیا تو اب یہ معاملہ ختم کر دیا۔

---

(۱) کشف الخفاء، رقم:۲۳۸۳ (۲۲۸/۲)، جامع الأحادیث، رقم:۲۱٤۲۳ (۳۳/۲۰)، جمع الجوامع للسیوطی، رقم:٤١٥٤ (۲۲۰۵۵/۱)، صحیح ابن حبان، رقم:۵۰۲۷ (۳۸۱/۱۱)، اعلاء السنن، باب جواز الاقالة وفضلها، (۲۲۰/۱٤)، اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے ''جو شخص بیع پر نادم ہونے والے شخص سے کیا جانے والا معاہدہ ختم کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی لغزشات سے درگذر فرمائے گا''

اپنی نوعیت کا ایک عجیب واقعہ

میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، میں لندن سے کراچی واپس آ رہا تھا اور لندن کا جو ہیتھرو ائیر پورٹ ہے وہاں ائیر پورٹ پر بہت بڑا بازار ہے مختلف اسٹال وغیرہ لگے رہتے ہیں، اس میں دنیا کی مشہور کتاب ''انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا'' کا اسٹال لگا ہوا تھا، میں وہاں کتابیں دیکھنے لگا تو مجھے ایک کتاب نظر آئی جس کی بہت عرصے سے میں تلاش میں تھا اس کا نام ''گریٹ بکس'' ہے، انگریزی میں ۶۵ جلدوں میں ہے اس کتاب میں ''ارسطو'' سے لے کر ''برٹرینڈ رسل'' تک جو ابھی قریب میں فلسفی گزرا ہے یعنی تمام فلسفیوں اور تمام بڑے بڑے مفکرین کی اہم ترین کتابیں جمع کر دیں اور سب کے انگریزی ترجمے اس کتاب میں موجود ہیں۔ میں وہ کتاب اسٹال پر دیکھنے لگا اسٹال پر جو آدمی (Shope Keeper) یعنی دکاندار کھڑا تھا، کہنے لگا ''کیا آپ یہ کتاب لینا چاہتے ہیں اور کیا آپ کے پاس ''انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا'' پہلے موجود ہے؟''

میں نے کہا ''جی ہاں لینا چاہتا ہوں اور پہلے سے موجود بھی ہے''

اس نے کہا ''اگر آپ کے پاس پہلے سے ''انسائیکلو پیڈیا'' موجود ہے تو آپ کو ہم یہ پچاس فیصد رعایت میں دے دیں گے یعنی جو اصل قیمت ہے اس کی آدھی قیمت پر دے دیں گے''

میں نے کہا ''میرے پاس ہے تو سہی لیکن کوئی ثبوت نہیں ہے، جس سے ثابت کروں کہ میرے پاس ہے''

دکاندار نے کہا ''ثبوت کو چھوڑیں! بس آپ نے کہہ دیا ہے کہ ''ہے'' تو بس آپ پچاس فیصد کے حق دار ہیں''

اب میں نے حساب لگایا کہ پچاس فیصد رعایت کے ساتھ کتنے پیسے بنیں گے تو پچاس فیصد رعایت کے ساتھ وہ تقریباً پاکستانی چالیس ہزار روپے بن رہے تھے۔ مجھے اپنے دارالعلوم کے لئے خریدنی تھی، دارالعلوم ہی کے لئے ''بریٹانیکا'' پہلے بھی موجود تھی۔

میں نے کہا ''میں تو اب جا رہا ہوں یہ کتاب میرے پاس کیسے آئے گی؟''

دکاندار نے کہا ''آپ فارم بھر دیجئے ہم یہ کتاب آپ کو جہاز سے بھیج دیں گے، جب میں نے وہ فارم بھر دیا تو دکاندار کہنے لگا کہ آپ اپنا کریڈٹ کارڈ کا نمبر دے کر دستخط کر دیجئے''

تو میں ذرا کھٹکا کہ دستخط کروں یا نہ کروں اس لئے کہ دستخط کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ادائیگی ہوگئی وہ چاہے تو اسی وقت جا کر فوراً پیسے نکلوا سکتا ہے، مگر مجھے غیرت آئی کہ اس نے میری زبان پر

اعتبار کیا اور میں یہ کہوں کہ نہیں میں نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے دستخط کر دیئے، دستخط کرنے کے بعد میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے کہا کہ دیکھو یہاں آپ مجھے پچاس فیصد رعایت پر دے رہے ہیں، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے بلکہ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے یہاں سے کتابیں بہت رعایت سے خریدیں اور پاکستان جا کر مجھے اس سے بھی سستی مل گئیں، لوگ پتہ نہیں کس کس طرح منگوا لیتے ہیں اور سستی بیچ دیتے ہیں، تو مجھے اس بات کا احتمال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں مجھے اس سے سستی مل جائے۔

دکاندار نے کہا ''اچھا کوئی بات نہیں، آپ جا کے پاکستان میں معلوم کر لیجئے اگر آپ کو سستی مل رہی ہوں گی تو ہمارا یہ آرڈر کینسل کر دیجئے اور اگر نہ ملے تو ہم آپ کو بھیج دیں گے''

میں نے کہا ''آپ کو کیسے بتاؤں گا؟''

دکاندار کہنے لگا ''آپ کو تحقیق کرنے میں کتنے دن لگیں گے، کیا آپ چار پانچ دن یعنی بدھ کے دن تک پتہ لگا سکیں گے؟''

میں نے کہا ''ہاں! انشاء اللہ''

دکاندار نے کہا ''میں بدھ کے دن بارہ بجے آپ کو فون کر کے پوچھوں گا کہ آپ کو سستی مل گئی کہ نہیں، اگر مل گئی تو میں آرڈر کینسل کر دوں گا اور اگر نہیں ملی ہوگی تو پھر روانہ کر دوں گا''

تو اس نے حجت ہی نہیں چھوڑی۔ لہٰذا میں نے کہا کہ اچھا بھائی ٹھیک ہے اور میں نے دستخط کر دیئے اور فارم ان کو دے دیا، لیکن سارے راستے میرے دل میں دغدغا لگا رہا کہ میں دستخط کر کے آ گیا ہوں وہ اب چاہے تو اسی وقت جا کر بلا تاخیر چالیس ہزار روپے بینک سے وصول کر لے، اس میں تاخیر ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، لہٰذا یہاں کراچی پہنچ کر میں نے دو کام کئے۔

ایک کام یہ کیا کہ امریکن ایکسپریس جو کریڈٹ کارڈ کی کمپنی تھی اس کو خط لکھا کہ میں اس طرح دستخط کر کے آیا ہوں لیکن اس کی پیمنٹ (ادائیگی) اس وقت تک نہ کریں جب تک میں دوبارہ آپ سے نہ کہوں۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ ایک آدمی کو بھیجا کہ یہ کتاب دیکھ کر آؤ، اگر مل جائے تو لے آؤ، میں پہلے یہاں تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے ملتی نہیں تھی ایسا ہوا کہ اس نے جا کر تلاش کی تو صدر کی ایک دوکان میں یہ کتاب مل گئی اور سستی مل گئی یعنی وہاں چالیس ہزار میں پڑ رہی تھی یہاں تیس ہزار میں مل گئی جبکہ وہ پچاس فیصد رعایت کرنے کے بعد تھی، اب میرا دل اور پریشان ہوا، اللہ کا کرنا کہ یہاں سستی مل رہی ہے اور اس نے کہا تھا کہ بدھ کے دن میں فون کروں گا خدا جانے فون کرے نہ کرے۔ لہٰذا میں نے احتیاطاً خط بھی لکھ دیا کہ بھائی یہاں مل گئی ہے ٹھیک بدھ کا دن تھا اور بارہ بجے دوپہر کا

وقت تھا اس کا فون آیا۔

دکاندار نے فون پر کہا کہ بتایئے آپ نے کتاب دیکھ لی، معلومات کرلیں؟ میں نے کہا جی ہاں کرلی ہیں اور مجھے یہاں سستی مل گئی ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ آپ کو سستی مل گئی میں آپ کا آرڈر کینسل کردوں؟ میں نے کہا جی ہاں، اس پر دکاندار نے کہا میں آرڈر کینسل کررہا ہوں اور آپ نے جو فارم پر کیا تھا اس کو پھاڑ رہا ہوں اچھا ہوا کہ آپ کو سستی مل گئی ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

چار پانچ دن بعد اس کا خط آیا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ کتاب آپ کو کم قیمت پر مل گئی لیکن افسوس ضرور ہے کہ ہمیں آپ کی خدمت کا موقع نہیں مل سکا لیکن وہ کتاب آپ کو مل گئی، آپ کا مقصد حاصل ہوگیا آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس بات کو توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ ہمارے ساتھ رابطہ قائم رکھیں گے۔ ایک پیسے کا اس کو فائدہ نہیں ہوا فون لندن سے کراچی اپنے خرچ پر کیا، پھر خط بھی بھیج رہا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم گالیاں والیاں بہت دیتے ہیں، یہ ان اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے جنہیں ہم چھوڑ چکے ہیں، بہرحال کفر کی وجہ سے ان سے نفرت ہونی چاہئے لیکن انہوں نے بعض وہ اعمال اپنا لئے ہیں جو درحقیقت ہمارے اپنے اسلامی تعلیمات کے اعمال تھے اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو فروغ دیا۔

حق میں سرنگوں اور باطل میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) ایک بڑی یاد رکھنے کی اور بڑی زریں بات فرمایا کرتے تھے کہ باطل کے اندر تو ابھرنے کی صلاحیت نہیں ہے:

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾(۱)

لیکن اگر کبھی دیکھو کہ کوئی باطل پرست ابھر رہے ہیں تو سمجھو کہ کوئی حق والی چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس کو ابھار دیا ہے کیونکہ باطل میں تو ابھرنے کی طاقت تھی ہی نہیں، حق چیز لگ گئی اس نے ابھار دیا۔ اور حق میں صلاحیت سرنگوں ہونے کی نہیں:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾(۲)

تو جب حق اور باطل کا مقابلہ ہو تو ہمیشہ حق کو غالب ہونا ہے، اس میں صلاحیت نیچے جانے کی

(۱) بنی إسرائیل: ۸۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے''

(۲) بنی إسرائیل: ۸۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور کہو کہ: ''حق آن پہنچا اور باطل مٹ گیا''

نہیں ہے، اگر کبھی دیکھو کہ حق والی قوم نیچے جارہی ہے تو سمجھ لو کہ کوئی باطل چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس کو گرایا ہے یہ بڑی کام کی بات ہے۔

ہمارے ساتھ ان کے یہ سب باطل طریقے لگ گئے اور ان اقوام نے ان حق باتوں کو اپنا لیا ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے کم از کم دنیا میں تو اس کا بدلہ ان کو دیا کہ دنیا کے اندر ان کو فروغ حاصل ہوا، ترقی ملی، عزت ملی، لیکن آخرت میں معاملہ تو اور ہی معیار پر ہونا ہے۔ یعنی وہاں کا معاملہ دوسرے معیار کا ہے لہٰذا وہاں کا معاملہ تو وہاں ہوگا لیکن دنیا کے اندر ان کو جو ترقی مل رہی ہے اور ہم جو نیچے گر رہے ہیں اس کے اسباب یہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا دارالاسباب بنائی، انہوں نے یہ اخلاق اختیار کئے تو ان اخلاق کے اختیار کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے تجارت کو فروغ دیا، صنعت کو فروغ دیا اور سیاست میں فروغ دیا اور تم نے یہ چیزیں اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات چھوڑ دیئے لہٰذا اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں ہماری پٹائی کرادیتے ہیں، روز پٹائی ہوتی ہے۔

برطانیہ میں ایک بے روزگاری الاؤنس ہوتا ہے یعنی کوئی آدمی بے روزگار ہوگیا اور حکومت کو پتہ چل گیا کہ یہ بے روزگار ہے تو اس کا ایک الاؤنس جاری کردیتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ بے روزگار ہے تو بھوکا نہ مرے بلکہ اس کو ایک وظیفہ ملتا رہے اور اگر وہ معذور نہیں ہے تو روزگار کی تلاش میں لگا رہے کوشش کرتا رہے اور جب روزگار مل جائے تو اپنا روزگار خود سنبھالے اور اگر معذور ہے تو وظیفہ ملتا رہتا ہے۔

اب ہمارے مسلمان بھائیوں کی ایک بڑی تعداد وہاں پر ہے اس نے اپنے آپ کو بیروزگار ظاہر کرکے وہ ایک الاؤنس جاری کروا رکھا ہے اور بہت سیوں کہتے ہیں جب آرام سے گھر پر مل رہا ہے تو کمانے کی کیا ضرورت ہے اور بعض ایسے ہیں کہ جن کو روزگار ملا ہوا ہے یعنی چوری چھپے روزگار بھی کررہے ہیں اور وہ الاؤنس بھی لے رہے ہیں، اور حد تو یہ ہے کہ ائمہ مساجد یہ کام کررہے ہیں اور اس کی دلیل یہ بنالی ہے کہ یہ تو کافر لوگ ہیں ان سے پیسے وصول کرنا ثواب ہے۔ لہٰذا ہم یہ پیسے وصول کریں گے۔ امامت کے پیسے بھی مل رہے ہیں اور ٹیوشن بھی چلا رہے ہیں اور ساتھ میں بے روزگای الاؤنس بھی لے رہے ہیں۔

ہم اس عذاب میں مبتلا ہیں تو پھر کیسے رحمت نازل ہو؟ اور جب ہمارا حال یہ ہوگیا تو کیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت شامل حال ہو۔

معاشرے کی اصلاح فرد سے ہوتی ہے

کسی معاشرے کی اصلاح فرد سے ہوتی ہے، یہ سوچنا کہ چونکہ سب یہ کر رہے ہیں تو میں اکیلا کر کے کیا کروں گا یہ شیطان کا دوسرا دھوکہ ہے، دوسرے خواہ کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿ لَا يَضُرُّكُم مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ﴾(۱)

اپنے طور پر اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ سے درست کرلو اور جو اخلاق نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں ان کے اوپر عمل کرلو تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب ایک چراغ جلتا ہے تو اس ایک سے دوسرا چراغ جلتا ہے اور جلے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) المائدة: ۱۰۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے"

گناہ کا انجام، رزق سے محرومی ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اَلْمُسْتَغْفِرُ مِنَ الذَّنْبِ وَهُوَ مُصِرٌّ عَلَيْهِ كَالْمُسْتَهْزِئِ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ)) (۱)

''جو شخص کسی گناہ سے استغفار بھی کرتا رہے اور اس پر مصر بھی ہو یعنی چھوڑتا نہیں گناہ پر گناہ کئے جارہا ہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہتا ہے۔ تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ مذاق کر رہا ہے''

استغفار کے ساتھ گناہ پر اصرار مضر ہے

یہ تو بہت بری بات ہوئی کہ استغفار بھی کر رہا ہے اور گناہ چھوڑتا بھی نہیں بلکہ مسلسل گناہ میں لگا ہوا ہے۔ اسی لئے پہلے بار بار یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ توبہ کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ندامت ہو اور اس کام کو فی الوقت چھوڑ دے اور آئندہ کے لئے عزم کرے کہ دوبارہ نہیں کرے گا تب توبہ کامل ہوگی۔ پس جو آدمی گناہ بھی کئے جارہا ہے نہ اس کے اوپر ندامت ہے نہ اس کو چھوڑنے کو تیار ہے اور پھر ساتھ ساتھ ''استغفر اللہ'' بھی کہہ رہا ہے تو گویا یہ شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ محض مذاق کر رہا ہے۔ اسی کو ملا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''ہاتھ میں تسبیح ہے زبان پر توبہ کے الفاظ ہیں لیکن دل گناہ کے ذوق وشوق سے بھرا ہوا ہے تو ایسے استغفار سے ہمارے گناہ کو بھی ہنسی آتی ہے کہ یہ کیسا آدمی ہے کہ گناہ کو چھوڑتا بھی نہیں ہے اور ساتھ ساتھ اپنے آپ کو توبہ واستغفار کرنے والا بھی

☆ ضبط وتحریر: محمد اویس سرور، تاریخ ضبط: ۳۱ مارچ ۲۰۰۹ء

(۱) شعب الإيمان، رقم: ۷۱۷۸ (٤٣٦/٥)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (٣٤٨/٣)، تفسير حقي (٧٢/١)، إحياء علوم الدين (٣٥٩/٥)

سمجھ رہا ہے"

یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن معنی کے اعتبار سے بڑی حد تک صحیح ہے کہ آدمی اصرار کرتا رہے گناہ پر اور ساتھ ساتھ استغفار کرتا رہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔

ایک دوسری حدیث ہے اور وہ حدیث اس حدیث کے مقابلے میں سند کے اعتبار سے زیادہ قوی بھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ)) (۱)

"جو آدمی استغفار کرتا رہے وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوگا"

اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت

ان دونوں حدیثوں کا تعلق دراصل قرآن کریم کی ایک آیت سے ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اول تو کوشش کرتے ہیں کہ گناہ سے بچیں لیکن اگر کبھی کوئی بے حیائی کی بات ان سے سرزد ہوگئی یا انہوں نے اپنی جان پر ظلم کرلیا یعنی کسی گناہ کا ارتکاب کرلیا فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت اللہ سے طلب کرتے ہیں استغفار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا گناہ کون معاف کرے گا؟ اس لئے وہ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں جب کوئی غلطی ہوئی تو اللہ کو یاد کیا اور اس سے استغفار کیا، اور جو کچھ کیا تھا اس پر اصرار نہیں کرتے جانتے بوجھتے ہوئے۔

اس آیت میں بتادیا گیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ اس کے اندر گناہ کا مادہ موجود ہے تو کبھی نہ کبھی کوئی غلطی، کوئی کوتاہی انسان سے ہو ہی جاتی ہے لیکن یہ اللہ کے بندے ایسے ہیں جب کبھی ان سے غلطی اور کوتاہی ہو تو فوراً اللہ کو یاد کرکے توبہ استغفار کرتے ہیں اور اپنے اس فعل پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کو چھوڑنے کی فکر کرتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کا ارشاد، اس میں اصرار کا لفظ آیا ہے کہ اس میں گناہ کرنے والے اصرار نہیں کرتے کہ میں ضرور کروں گا۔

(۱) سنن الترمذی، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب في دعاء النبي صلى الله عليه وسلم، رقم: ٣٤٨٢، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في الإستغفار، رقم: ١٢٩٣

(۲) آل عمران: ١٣٥

ایک حدیث میں نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ)) (۱)

''جو آدمی گناہوں پر استغفار کرتا رہے وہ اصرار کرنے والا شمار نہیں ہوگا''

توبہ کی شرائط

اگر استغفار کرتا رہے اگر چہ گناہ ایک سے زائد دفعہ بھی ہوجائیں لیکن استغفار کرتا رہے تو وہ اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوگا۔ یہ وہ حدیث تھی جو پیچھے گزری ہے۔ اور اب یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ اگر کوئی شخص گناہوں کو چھوڑے نہیں بلکہ ان پر اصرار کرتا رہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہے تو ایسا ہے جیسے اللہ کی آیات سے مذاق کررہا ہو۔ تو اب بظاہر یہ حدیث جو ہے پچھلی حدیث سے ذرا مختلف نظر آرہی ہے۔ کہ وہاں تو یہ کہا تھا کہ اگر کوئی آدمی استغفار کرتا رہے تو استغفار کرنے کے نتیجے میں اس کو اصرار کرنے والا نہیں سمجھا جائے گا۔ اور یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ استغفار کرتا رہے اصرار کرتا رہے تو گویا وہ مذاق کررہا ہے۔ اب دونوں کا مطلب سمجھ لیجئے معاملے کی حقیقت جو ہے وہ یہ کہ اصل میں توبہ اور استغفار وہ ہے جس میں تین باتیں پائیں جائیں:

(۱) جو گناہ پہلے ہو چکے ان پر نادم اور شرمندہ ہو، پریشان ہو اور ان گناہوں کی برائی اور نحوست اس کے دل میں بیٹھ چکی ہو۔

(۲) اس کام کو فوری طور سے چھوڑ دے۔

(۳) آئندہ کے لئے پکا ارادہ کرے کہ پھر دوبارہ یہ عمل نہیں کروں گا۔

جب یہ تین باتیں پائی جائیں گی تو توبہ و استغفار کامل ہوگا۔ اور اس پر وعدہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہ جو ایسی توبہ کرلے گا وہ ایسا ہوجائے گا جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمالیا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ)) (۲)

''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں''

اس کا گناہ نامہ اعمال سے مٹا دیا جائے گا، اصل توبہ یہ ہے۔

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب في دعاء النبي صلى الله عليه وسلم، رقم:۳٤۸۲، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في الإستغفار، رقم:۱۲۹۳

(۲) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم:٤۲٤۰

دوسری ایک قسم ہم جیسے کمزوروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی گنجائش رکھی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی گناہ میں مبتلا ہے کسی مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے اس پر نادم بھی ہے شرمسار بھی ہے پشیمان بھی ہے چھوڑنا بھی چاہتا ہے کوشش میں بھی لگا ہوا ہے، لیکن کسی وجہ سے چھوڑا نہیں جارہا۔ مثلاً ایک آدمی کسی ناجائز ملازمت میں مبتلا ہوگیا جو شرعاً جائز نہیں۔ اب دل میں پشیمان بھی ہے کہ یہ جو آمدنی میری آرہی ہے یہ حلال نہیں ہے حرام ہے۔ اور ندامت بھی ہے شرمساری بھی ہے اور ساتھ ساتھ کوشش بھی ہے کہ چاہتا ہے اس کو چھوڑ کر کوئی اور حلال ذریعہ معاش اختیار کرلوں اور فوراً چھوڑ بھی نہیں سکتا کہ اگر چھوڑتا ہوں تو بچوں کو فاقے آئیں گے، اور کوئی دوسرا حلال ذریعہ معاش مل نہیں رہا تو اس مجبوری میں گھرا ہوا ہے اس وقت میں ایسی مجبوری ایسے حالات میں وہ حدیث کہی گئی:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ))

''استغفار کرنے والے نے گناہ پر اصرار نہیں کیا''

''استغفار'' کو حرزِ جان بنائیے

اگر ایسے حالات میں وہ استغفار کرتا رہے، اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہتا رہے کہ یا اللہ ہے تو یہ غلط کام جو میں کررہا ہوں اور میں اس وقت نادم بھی ہوں شرمسار بھی ہوں پشیمان بھی ہوں اور چھوڑنا بھی چاہ رہا ہوں لیکن کسی مجبوری کی بنا پر مجھ سے چھوڑا نہیں جارہا۔ اس واسطے اے اللہ میں آپ سے استغفار کرتا ہوں، تو ایسے آدمی کے لئے نبی کریم ﷺ نے مایوس ہونے کے راستے کے بجائے یہ بشارت دے دی جو آدمی اس طرح استغفار کرتا رہے اگرچہ ابھی تک چھوڑ نہیں پایا کوشش میں لگا ہوا ہے پھر بھی انشاء اللہ اس کو اصرار کرنے والوں میں نہیں لکھا جائے گا۔ کیونکہ یہ جو کررہا ہے یہ دھڑلے سے نہیں کررہا بے حیائی سے نہیں کررہا ہے۔ ندامت، پشیمانی اور شرمساری کے ساتھ کررہا ہے اور چھوڑنے کی کوشش میں بھی لگا ہوا ہے۔ جو استغفار کررہا ہے اس استغفار کے بدلے میں کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف بھی فرمادیں۔

یہ جو حدیث ہے اس میں جو کہا گیا ہے یہ تیسری قسم ہے کہ ایک آدمی ہے گناہ میں لگا ہوا ہے کوئی مجبوری نہیں اپنے اختیار میں ہے جب چاہے چھوڑ سکتا ہے اور اس کے باوجود دل میں کوئی ندامت بھی نہیں شرمساری بھی نہیں اور چھوڑنے کی کوشش بھی نہیں اور کہتا ہے کہ میں تو کرتا رہوں گا اور ساتھ ساتھ زبان سے کہہ رہا ہے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' تو نہ ندامت ہے نہ کوشش ہے چھوڑنے کی اور زبان سے کہہ رہا ہے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ

اِلَیۡہِ ‘‘ اس کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ یہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ مذاق کرنے والا ہے، یہ استغفار نہیں یہ تو مذاق ہے۔ کسی آدمی کو آپ پکڑ کے مارنا شروع کرو اور ایک تھپڑ مارو اور کہنا بھائی معاف کرنا تو یہ مذاق ہے کہ نہیں؟ تو جس طرح وہ مذاق ہے وہ چاہے گا کہ تم مجھ سے معافی مانگ رہے ہو یا میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو تو ایک آدمی اگر ایک انسان کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو وہ اس کو مذاق سمجھے گا تو اللہ کی نافرمانی بھی کئے جا رہے ہو دھڑلے سے کوئی ندامت نہیں کوئی شرمساری نہیں اور چھوڑنے کی کوشش بھی نہیں کوئی مجبوری بھی نہیں اور پھر بھی کہہ رہے ہو ’’اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ وَّاَتُوۡبُ اِلَیۡہِ ‘‘ تو یہ اللہ کے ساتھ مذاق کرنا ہوا اور اللہ بچائے، اللہ کے ساتھ مذاق کرنا بڑی سنگین بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

خلاصہ یہ کہ یہ حدیث ثابت آتی ہے ان لوگوں پر جو یہ کہتے ہیں کہ گناہ کے بارے میں کبھی چھوڑنے کا تصور بھی نہیں آتا ندامت بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ الٹا اس پر سینہ زوری کرتے ہیں، اس کو صحیح، جائز اور حلال قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور باوجود اختیار کے نہیں چھوڑتے۔ تو گناہ پر اصرار کے ساتھ استغفار کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔

البتہ جہاں آدمی کے دل میں ندامت ہو، شرمساری ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو کر اللہ کو یاد کرے اور استغفار کرے اور یہ کہے یا اللہ میں چھوڑنا چاہتا ہوں مگر فلاں وجہ سے چھوڑ نہیں پا رہا ہوں، اے اللہ! مجھے طاقت بھی دے دیجئے، توفیق بھی دے دیجئے۔ یا اللہ! مجھے اس گناہ سے چھڑا دیجئے توفیق عطا فرما دیجئے اور میں اس پر نادم ہوں، شرمسار ہوں اور پھر استغفار کرے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ استغفار مقبول ہے۔ یہ ہے دونوں حدیثوں کا فرق۔

گناہ کی نحوست، رزق سے محرومی

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الۡعَبۡدَ لَیُحۡرَمُ الرِّزۡقَ بِالذَّنۡبِ یُصِیۡبُہٗ)) (۱)

’’بعض اوقات بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے جس کا وہ ارتکاب کرے‘‘

یعنی گناہ کا نتیجہ بعض اوقات دنیا میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ

(۱) سنن ابن ماجہ، المقدمۃ، باب فی القدر، رقم: ۸۷، مسند أحمد، ومن حدیث ثوبان، رقم: ۲۱۳۷۹، ۲۱٤۰۲

انسان کو رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو بلکہ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ گناہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یعنی گناہ کا جو اصل نقصان ہے اور اس کی جو اصل سزا ہے وہ تو آخرت میں ہوگی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾(۱)

کبھی کبھی ہم اس آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی کچھ عذاب کی جھلک دکھا دیتے ہیں تاکہ ان کے اندر اگر کوئی ہوش عقل وغیرہ ہے تو شاید یہ لوٹ آئیں اور ان گناہوں سے بعض آجائیں دنیا ہی کے اندر تو آخرت میں ان کو عذاب دینے کی ضرورت نہ پڑے۔ اللہ تو بڑا رحیم وکریم ہیں قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ﴾(۲)

اگر تم اللہ کے شکر گزار بندے بنو اور صحیح معنی میں مومن بنو تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کریں گے۔ اس واسطے دنیا میں بھی کبھی کبھی ایک عذاب کی شکل دکھا دی جاتی ہے تاکہ یہ لوگ واپس آجائیں تو اسی عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہے۔

جب کبھی آدمی کو رزق میں کمی ہو صبر وفاقے کی نوبت آئے یا رزق میں تنگی ہو تو اس واسطے بزرگ کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں انسان کو استغفار کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ یا اللہ یہ جو تنگی پیش آرہی ہے یقیناً میری کسی بدعملی کا نتیجہ ہے۔ اے اللہ اپنی رحمت سے میری اس بدعملی کو معاف فرما دیجئے۔ تو جب کبھی کوئی تکلیف پیش آئے تو توبہ و استغفار کرے۔

رزق کا وسیع مفہوم

لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضور ﷺ نے لفظ یہ استعمال فرمایا کہ کبھی کبھی انسان کو گناہ کی وجہ سے رزق محروم کر دیا جاتا ہے۔ رزق کو عام طور پر صرف کھانے پینے کی اشیاء روپیہ پیسے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا ظاہری مفہوم ہم یہ سمجھیں گے کہ گناہ کے نتیجے میں پیسے کی آمدنی کم ہو جائے گی، لیکن عربی زبان میں رزق کا مفہوم صرف کھانے پینے روپے پیسے کے ساتھ خاص نہیں۔

عربی زبان میں رزق کہتے ہیں عطاء کو، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کوئی بھی چیز دے اس کو رزق کہتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس میں ساری عطائیں آجاتی ہیں، اس

(۱) السجدۃ: ۲۱ (۲) النساء: ۱۴۷

میں صرف روپیہ پیسہ، کھانا پینا نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی علم ہے وہ بھی اللہ کا رزق ہے، کسی کے پاس کوئی ہنر ہے وہ بھی اللہ کا رزق ہے، کسی کے پاس صحت ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، کسی کے پاس خوشحالی ہے وہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔

تمام کمالاتِ انسانیہ رزق ہیں

رزق صرف کھانے پینے روپے پیسے کے ساتھ خاص نہیں۔ جتنے بھی کمالات انسان کے اندر پائے جاتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے اس کا رزق ہے۔ اگر کوئی آدمی ذہین ہے تو یہ ذہن بھی اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے لہٰذا اللہ کا رزق ہے۔ اس کے اندر عقل ہے وہ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے لہٰذا عقل اللہ تعالیٰ کا رزق ہے۔ تو جب یہ کہا گیا کہ گناہ سے بعض اوقات انسان کو رزق سے محرومی ہو جاتی ہے تو اس میں صرف روپے پیسے کی بات نہیں کھانے پینے کی بات نہیں بلکہ ہر طرح کے رزق کی بات ہے۔

کبھی اللہ تعالیٰ ایسا کرتے ہیں کہ گناہ کی وجہ سے کھانے پینے میں تو کوئی کمی نہیں کرتے، کھانے پینے میں آدمی مست ہے خوب کھا پی رہا ہے، آمدنی پہلے سے بھی زیادہ ہو رہی ہے، لیکن اور کوئی چیز جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کی تھی وہ واپس لے لیتے ہیں چھین لیتے ہیں۔ صحت چھین لی بیماری آ گئی، فراغت چھین لی بےفکری چھین لی فکر اور پریشانی میں مبتلا ہو گیا، علم دیا تھا علم چھین لیا، ہنر دیا تھا ہنر چھین لیا، عقل اور سمجھ دی تھی وہ چھین لی، تو دنیا کے اندر گناہ کی جو سزا ملتی ہے ان میں یہ مختلف شکلیں ہوتی ہیں مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا گناہ کا نقصان جو آخرت میں ظاہر ہوگا وہ تو اپنی جگہ ایک بہت بڑا نقصان دنیا میں جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان سے اس گناہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان دولتوں میں سے کوئی دولت چھین لیتے ہیں۔ صحت چلی گئی روپیہ پیسے کی کمی نہیں محل قائم کئے ہوئے ہیں فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں گاڑیاں ہیں بینک بیلنس ہے سب کچھ موجود ہے، لیکن صحت نہیں رہی۔ اس صحت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ساری چیزیں بیکار ہو کر رہ گئیں ان کا کوئی فائدہ نہ رہا برکت چلی گئی یہ نقصان ہوا۔

علم و ہنر بھی رزق ہیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ علم اور ہنر دیا تھا کوئی کمال دیا تھا، وہ علم و ہنر اور کمال چلا گیا اور کوئی بات پہلے جیسی نہ رہی، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ بجائے گناہ کے نتیجے میں سمجھ الٹی

ہو جاتی ہے، سمجھ اور عقل اللہ تعالیٰ چھین لیتے ہیں، ہم نے تمہیں عقل دی تھی اس کام کے لئے کہ بھلے برے کو پہچانو اور بھلے برے کو پہچان کر بھلے کو اختیار کرو برے کو چھوڑو۔ لیکن تم نے اپنی عقل کو صحیح استعمال نہیں کیا اور برے میں ہی اس کو استعمال کرتے رہے تو اب ہم نے بھلے برے کی تمیز اور پہچان چھین لیتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں کیا ہوتا ہے کہ یہ جو بری باتیں ہیں وہ بھی اچھی لگنے لگتی ہیں برے کام بھی اچھے لگنے لگتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں انسان گناہ پر گناہ کئے جاتا ہے، اسی کو قرآن کریم میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۱)

ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ زنگ لگا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، زنگ لگا دیتا ہے کہ دل میں اچھی بات آتی ہی نہیں، برائی کا تصور ذہن سے مٹ جاتا ہے سمجھ الٹی ہو جاتی ہے، اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اب دیکھیں آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ پہلے زمانے میں جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے لوگوں میں دینداری کا غلبہ تھا تو گناہ کو کس طرح سے برا سمجھا جاتا تھا، اگر کوئی سود خور ہے تو سارے معاشرے میں ہے کہ بھائی یہ تو سود کھاتا ہے، اگر کوئی آدمی گانے بجانے کا کام کرتا ہے تو ساری دنیا میں بدنام کہ یہ تو گویا ہے۔ اور اب یہ ساری چیزیں ہنر بن گئیں اب تو وہ آدمی فنکار ہے بڑا تعلیم یافتہ ہے اور بڑا خوشحال ہے، اور لوگ تمنا کرتے ہیں کہ کسی طرح سود سے آمدنی مل جائے، اس واسطے کہ اس میں سہولیات بہت ملتی ہیں، تو وہ گناہ کے گناہ ہونے کا تصور اس کی برائی کا احساس وہ مٹ جاتا ہے، اس واسطے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عقل سلب کر لی، عقلیں الٹی ہو گئیں اس گناہ کی وجہ سے، تو گناہ کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے۔

گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے

اس اثر سے بچنے کا راستہ بھی یہ ہے کہ آدمی گناہ سے توبہ کرے اور استغفار، جب توبہ واستغفار کرے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ اللہ پاک اس کو سمجھ واپس لوٹا دیں گے، ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"انسان جب ایمان لاتا ہے یا مومن ہے بالغ ہوتا ہے تو اس کا دل ایک آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے، اس کے اندر کوئی نجاست نہیں ہوتی کوئی گندگی نہیں ہوتی کوئی میلا پن نہیں ہوتا، جب پہلی بار گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ

(۱) المطففین: ۱٤

جاتا ہے، اگر اس نے اس گناہ کے بعد توبہ واستغفار کرلیا ندامت کا اظہار کرلیا تو وہ نکتہ مٹ جاتا ہے، لیکن اگر اس گناہ کے کرنے کے بعد توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کرلیا تو ایک نکتہ اور لگ جاتا ہے، پھر گناہ کیا تو تیسرا نکتہ لگ جاتا ہے، اور اگر اسی طرح سے گناہ کرتا چلا گیا تو وہ نکتہ بڑھ بڑھ کر پورے دل کو گھیر لیتا ہے، اور گھیرنے کے بعد وہ زنگ کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کے دل کے اندر برائی کے برائی ہونے کا احساس ہی ختم ہوجاتا ہے" (۱)

اب آپ کو کیا بتاؤں، کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یعنی ایسی باتیں جو آج بھی اس معاشرے میں بھی مسلمان جو ہیں وہ اس کو انتہائی برا غلیظ اور بدنامی کا ذریعہ سمجھتے ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے لوگوں کو کہتے ہوئے کہ یہ تو باعث فخر ہے، اس کے اوپر تو ہم لوگوں کے سامنے فخر کرتے ہیں کہ ہم نے ایسا گناہ کیا۔ یہ ہے "رَانَ" جس کو قرآن کریم نے "رَانَ" سے تعبیر کیا ہے کہ نکتہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گیا کہ پورے قلب کو کالا کردیا اور وہ زنگ کی شکل اختیار کرگیا۔

لہٰذا جو بات ہمیشہ کہتا رہتا ہوں کہ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، لیکن اگر کبھی غلطیاں ہوجائیں تو فوراً اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور توبہ واستغفار کرو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ دنیا کے اندر بھی انسان کو گناہ کی وجہ سے رزق کی وجہ سے محروم کرتے ہیں، اور ظاہری بھی ہوسکتا ہے اور باطنی بھی ہوسکتا ہے، یہ جو میں نے بیان کیا یہ باطنی رزق ہے۔

نیکی کا شوق بھی رزق ہے

صوفیاء کرام اس کا ایک اور معنی بیان کرتے ہیں کہ جب کسی کو نیکی کی طرف عبادت اور اطاعت کی طرف ذوق وشوق ہوا منگ ہو کہ میں نیک کام کروں عبادت کروں، یہ بھی اللہ کی عطا ہے اور اس کا رزق ہے، بعض اوقات گناہ کی وجہ سے یہ عطا بھی چھن جاتی ہے، نیکی کا شوق نہیں رہتا، نیکی کی طرف ابھار پیدا نہیں ہوتا، اس کی امنگ نہیں ہوتی، اور اس کے بعد جو نیکیاں آدمی پہلے کرتا تھا اس سے محروم ہوجاتا ہے، یہ بھی گناہ کا ایک سبب ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أن الإسلام بدأ غریبا وسیعود غریبا......الخ، رقم: ۲۰۷، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ومن سورة ویل للمطففین، رقم: ۳۲۵۷، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الذنوب، رقم: ٤٢٣٤، مسند أحمد، مسند أبی هریرة، رقم: ٧٦١١

صوفیائے کرام کی دو حالتیں، بسط اور قبض

یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ دو حالتیں ہوتی ہیں ایک کو بسط کہا جاتا ہے ایک کو قبض کہا جاتا ہے، بسط کا معنی طبیعت میں ایک امنگ ہے نشاط ہے ابھار ہے۔ اور قبض کے معنی دل تنگ ہوگیا اور تنگی کی وجہ سے نیکی کا کام نہیں کیا جاتا، یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ تو بعض اوقات قبض کی جو حالت ہوتی ہے یعنی مقصود کا تعین نہیں ہو رہا، سستی ہو رہی ہے، نشاط پیدا نہیں ہوتا، طبیعت اٹھتی نہیں۔ یہ حالت بھی بعض اوقات گناہ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نیک کام کے کرنے میں سستی آئی تو پہلا کام یہ کرو کہ استغفار کرو ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ'' اے اللہ مجھے معاف فرما دیجئے یہ جو سستی آ رہی ہے یہ یقیناً میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہے، اے اللہ اس گناہ کو معاف فرما دیجئے تاکہ میری یہ سستی دور ہو جائے۔

بہت سے لوگ دیکھتے ہیں کہ طبیعت میں سستی آ رہی ہے مختلف نیکیوں کے کام کرنے کے اندر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، تو جب کبھی ایسا ہو تو فوراً کہو ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ'' اے اللہ مجھے معاف فرما دیجئے یہ جو سستی آ رہی ہے یہ میرے کسی کرتوت کا نتیجہ ہے۔ تو یہ قبض کی حالت انشاء اللہ بسط میں تبدیل ہو سکتی ہے اگر کوئی انسان توبہ واستغفار پر عمل کرے، اسی لئے صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ قبض کی حالت میں استغفار کی کثرت کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ سے خوب مانگنا چاہئے۔

استغفار، رزق کا دروازہ کھولتا ہے

میں نے ایک کتاب میں دیکھا کہ جو علماء کرام، محدثین اور فقہاء ہیں۔ ان کے سامنے کوئی مسئلہ آ گیا اور مسئلہ بڑا مشکل ہے حل نہیں ہو رہا طبیعت میں ایک بند سا لگ گیا ہے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس کا حل کیا ہو، جواب کیا ہو؟

ایسے موقع پر بزرگان دین فرماتے تھے کہ پہلا کام کرو ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ'' استغفار کرو کیوں؟ اس واسطے کہ جو بات سمجھ میں نہیں آ رہی اس کے معنی یہ ہیں کہ جو سمجھ کی طاقت اللہ نے دی تھی وہ چھن رہی ہے، تو کسی بدعملی کی وجہ سے چھن رہی ہے، کسی گناہ کی وجہ سے چھن رہی ہے، پہلے استغفار کر لو تو پھر انشاء اللہ بند کھل جائے گا۔ تو یہ صرف علم دین کے اندر خاص نہیں اور علوم کے اندر بھی اور میدانوں میں بھی۔

مثلاً ایک آدمی ڈاکٹر ہے ایک مریض آ گیا اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا کیا علاج کروں اس کا مرض کیا ہے سوچ رہا ہے سمجھ میں نہیں آ رہا مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اس موقع پر بھی استغفار کرے ''اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' اے اللہ میں استغفار کرتا ہوں کیونکہ یہ جو بند لگ رہا ہے یہ میری کسی بدعملی کا نتیجہ ہے، استغفار کرے گا تو کوئی بعید نہیں اللہ تعالیٰ بند کھول دے گا، اور بھی دنیا کے کاروبار میں جہاں کہیں کوئی رکاوٹ کا سامنا ہو کوئی بند لگے، فیصلہ نہیں ہو رہا یہ کروں کہ وہ کروں کشمکش میں مبتلا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرے۔ ''اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' اے اللہ یہ جو بند لگا ہے یہ میری کسی بدعملی کی وجہ سے لگا ہے اس کے اوپر استغفار کرتا ہوں معافی مانگتا ہوں کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ وہ بند کھول دے۔

یہ تجربے کی بات کر رہا ہوں جو اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی ہے اور الحمدللہ تجربہ خود بھی کیا جب کبھی اس پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بند کھول دیتے ہیں۔

گناہ اور خوشحالی کا اجتماع خطرناک ہے

تو یہ گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے بند کا لگ جانا رزق سے محرومی، استغفار کی کثرت کرو، تو انشاء اللہ یہ بند کھل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

((اِذَا رَأَیْتُمُ الرَّجُلَ یُعْطِیْهِ اللّٰهُ مَا یُحِبُّ وَهُوَ مُقِیْمٌ عَلٰی مَعْصِیَتِهٖ فَاعْلَمُوْا اَنَّ ذٰلِكَ اسْتِدْرَاجٌ)) (۱)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کر رہا ہے کہ جس چیز کی خواہش ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو دے دیتا ہے، جو چاہتا ہے مل رہا ہے، حالانکہ وہ مسلسل گناہ کئے جا رہا ہے، گناہ پر کمربستہ ہے، گناہ چھوڑ نہیں رہا، نہ گناہ پر ندامت کا اظہار ہوتا ہے، نہ توبہ واستغفار کرتا ہے، گناہوں میں لگا ہوا ہے گناہوں کے اندر لت پت ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو جو وہ چاہتا ہے، دے دیتے ہیں، دولت چاہتا ہے دولت ملتی ہے، شہرت چاہتا ہے شہرت ملتی ہے، عزت چاہتا ہے عزت ملتی ہے، پیسہ چاہتا ہے پیسہ ملتا ہے، مقبولیت چاہتا ہے مقبولیت ملتی ہے، جو کچھ چاہتا ہے مل رہا ہے، حالانکہ وہ اپنی معصیت پر کمربستہ ہے، گناہ پر کمربستہ ہے، تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ڈھیل دے رہا ہے۔ وہ استدراج ہے۔ استدراج قرآن کریم کی اصطلاح ہے، قرآن کریم میں

(۱) إحياء علوم الدين (١٩/٦)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَأُمْلِيْ لَهُمْ إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾(۱)

اصل میں کافروں کے بارے میں فرمایا کہ ہم ان کو ڈھیل دیتے جائیں گے اس انداز میں کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کوئی ڈھیل دے رہا ہے، اور ان کو مہلت دیں گے کہ یہ گناہ کرتے رہیں اللہ کی نافرمانی میں مبتلا رہیں پھر اچانک ان کو پکڑ لیں گے "إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہماری جو تقدیر ہے بڑی مضبوط ہے، تو اس کو کہتے ہیں استدراج۔

"استدراج" کی حقیقت

استدراج کا معنی ہے کہ ایک آدمی اللہ کا نافرمان ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو ظاہری دنیا کی نعمتوں سے نواز رہے ہیں، پیسے کی اس پر بارش ہو رہی ہے، شہرت اس کو مل رہی ہے، ترقی دنیا میں اس کو ہو رہی ہے، تو حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ سمجھ لو کہ اس کو استدراج ہو رہا ہے، ڈھیل مل رہی ہے، اللہ تعالیٰ ڈھیل دے رہے ہیں، قرآن کریم میں جگہ جگہ فرمایا کہ اگر تم کافروں کو دیکھتے ہو کہ وہ ترقی کر رہے ہیں دنیا میں مال و دولت کے انبار ان کے پاس لگے ہوئے ہیں اور ترقی پہ ترقی کئے جا رہے ہیں تو یاد رکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب دنیاوی زندگی کے اندر ہم نے ان کو تھوڑا سا موقع دے رکھا ہے، جب آنکھ بند ہوگی اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچیں گے تو پتہ چل جائے گا یہ سارے عیش و عشرت اور یہ آرام و آسائش ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ تو جس طرح کافروں کے ساتھ استدراج ہوتا ہے مسلمان کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

زمانے کے تازیانوں سے سبق سیکھو

اگر مسلمان معصیت پر کمر بستہ ہو، گناہوں پر کمر بستہ ہو، سینہ زوری کرے، اور ندامت کبھی پیدا نہ کرے تو اس کے باوجود بعض اوقات اللہ تبارک و تعالیٰ ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ ابھی میں نے وہ حدیث بیان کی تھی جس میں فرمایا کہ گناہ کی وجہ سے رزق میں کمی کر دیتے ہیں دنیا میں سزا مل جاتی ہے لیکن وہیں پر میں نے کہا تھا کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی پر انعام فرمانا چاہتے ہیں تو دنیا کے اندر مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ اس کو ہوش آ جائے، اگر ہوش آ جائے لوٹ آئے تو اللہ

(۱) القلم: ۴۴، ۴۵

تبارک وتعالیٰ کے ہاں بڑی خیر ہوگئی، لیکن اگر باوجود بار بار تازیانوں کے ایک آدمی کمر بستہ رہا چھوڑتا ہی نہیں کسی قیمت پر اللہ کی طرف آتا ہی نہیں، اللہ کو یاد کرتا ہی نہیں، ندامت پشیمانی کا اظہار نہیں کرتا تو بعض اوقات پھر حال یہ ہوجاتا ہے کہ جو تم کہتے ہو سب دیں گے تمہیں، اس دنیا میں سب کچھ دے دیں گے دولت بھی دے دیں گے مال بھی دے دیں گے شہرت بھی دے دیں گے عزت بھی دے دیں گے سبھی کچھ دے دیں گے۔ لیکن جب آخرت میں پکڑیں گے تو ایسی پکڑ ہوگی یاد رکھو۔

پس نبی کریم ﷺ نے فرمادیا کہ اگر کسی کو دیکھو کہ معصیت میں مبتلا ہے اور معصیتیں کئے جارہا ہے اس کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں۔ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتے ہیں کہ بھائی ایک آدمی ہے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ نافرمان ہے اور ظالم ہے جابر ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کمر بستہ ہے اس کے باوجود مزے اڑا رہا ہے، عیش وعشرت میں مصروف ہے کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ تو آدمی کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو عجیب معاملہ ہورہا ہے، وہ جو کہا:

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برف گرتی ہے بیچارے مسلمانوں پر

تو دوسروں کے اوپر یہ رحمتیں نازل ہورہی ہیں اور مسلمان کے اوپر برف گر رہی ہے، آفتیں آرہی ہیں مصیبتیں آرہی ہیں یہ جو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے سرکار دوعالم ﷺ اس کا جواب دے رہے ہیں:

”اگر دیکھو کہ کسی نافرمان پر یہ آرہی ہیں تو یہ کوئی قابل رشک مقام نہیں ہے ڈرنے کی چیز ہے کہ ڈھیل دی جارہی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے“

مصیبتیں گناہوں کا کفارہ بھی ہوتیں ہیں

بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں آپ کو جو کچھ مشکلات دیتے ہیں مصیبتیں دیتے ہیں وہ بھی مصیبتیں کفارہ ذنوب ہوتی ہیں، گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں تاکہ ہمارے پاس آئے تو حساب صاف کرکے آئے۔ صاف ہوکر آئے عذاب دینے کی ضرورت نہ پڑے، یہ تو ان کا کارخانہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے دوست کو بعض اوقات مار ڈالتے ہیں اور دشمن کو پالتے ہیں سامری جادوگر کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ پلوایا وہ کافر جو بت پرستی کا نشان بننے والا تھا اس کو جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے پہاڑوں کے اندر غذا پہنچائی اور پلوایا جبکہ زکریا علیہ السلام کو آروں سے چروادیا۔ یہ جو دنیا کے اندر دیکھتے ہو کہ بعض اوقات کسی نیک آدمی پر آزمائشیں آرہی ہیں اور غلط آدمی پھل پھول رہا ہے تو یہ

سب اس دنیا کا دھوکہ ہے۔

حقیقت میں وہ شخص جو ہے اسے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ابدی زندگی میں راحتیں ملیں اس واسطے اس کو دنیا کے اندر کچھ تھوڑی سی تکالیف دے دی ہیں۔ اور جو شخص کافر ہے تو اس کے لئے آخرت میں تو کوئی حصہ ہے نہیں لہٰذا دنیا کے اندر اس کو نواز دیا۔

تو میرے بھائی استدراج سے ڈرتے رہنا چاہئے، کہ اگر آدمی کوئی گناہ کر رہا ہو اور ساتھ میں اگر بظاہر کوئی مصیبت نہیں آ رہی تو یہ ڈرنے کی چیز ہے کہ میں دنیا کے اندر گناہ بھی کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے کوئی عذاب بھی نہیں آ رہا تو ڈر ہے کہ کہیں اللہ کی طرف سے ڈھیل تو نہیں دی جا رہی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میرے والد قدس سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایک واقعہ سنایا کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، تبلیغی جماعت کے بانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پتہ نہیں ان کے سینے کے اندر کیا آگ بھری تھی امت مسلمہ کو دعوت دینے کی کہ اسی آگ کا ثمرہ ماشاء اللہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ تو وہ بیمار ہوئے، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت کی عیادت کے لئے اس وقت دہلی گیا، جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ معالجین نے ملاقات سے روکا ہوا ہے پابندی لگائی ہوئی ہے، تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے حضرت کی خیریت معلوم کرنی تھی معلوم ہوگئی تو میں واپس دعا کر کے جانے لگا، کسی طرح حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چل گیا حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ عیادت کے لئے تشریف لائے تھے، تو انہوں نے فوراً آدمی کو دوڑایا کہ نہیں جا کر واپس بلا کر لاؤ، تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں وہ آدمی آیا تو میں نے کہا کہ ایسے ملنا مناسب نہیں ہے، کہا کہ نہیں حضرت کا حکم ہے کہ واپس بلایا جائے تا کہ ملاقات ہو سکے۔ جب خدمت میں پہنچے تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو واپس اس لئے بلایا کہ بعض آدمیوں کی ملاقات سے راحت ہوتی ہے، اور پھر ہاتھ میں ہاتھ لے کر بے تحاشا رونا شروع ہو گئے، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھے کہ تکلیف میں ہیں اس واسطے طبیعت پر گریہ طاری ہو گیا پھر فرمایا:

”اصل میں میں نے آپ کو اس لئے بلایا کہ میرے دل میں ایک بے چینی ہے وہ آپ کے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہوں، بے چینی یہ ہے کہ ماشاء اللہ یہ جماعت کا کام روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور ہر قدم پر الحمدللہ اس میں کامیابیاں ہو رہی ہیں، اللہ

تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہورہی ہے، تو مجھے کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ جماعت کا کام جو اتنا پھیل رہا ہے اور اتنی کامیابیاں ہورہی ہیں یہ کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج تو نہیں، یہ میرے ساتھ استدراج تو نہیں، اللہ نے ڈھیل تو نہیں دی''

آپ اندازہ کیجئے کہ جس آدمی کا لمحہ لمحہ دین کے لئے وقف ہے اور جو ہر وقت اللہ کے دین کے لئے اور امت کے لئے فکرمند ہے۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہورہا ہے کہ یہ کامیابیاں یہ کہیں استدراج تو نہیں، اس وجہ سے رورہے ہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک بات ڈال دی، میں نے عرض کیا'' حضرت میں آپ کو پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں''

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا'' کیسے کیا دلیل ہے تمہارے پاس کہ استدراج نہیں؟''

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' دلیل یہ ہے کہ جب کسی بندے کے ساتھ استدراج ہوتا ہے تو اس کے دل پر خیال بھی نہیں گزرتا کہ میرے ساتھ استدراج ہورہا ہے۔ کبھی اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ ڈھیل دی جارہی ہے اور اگر دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا اور اندیشہ پیدا ہوتو یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ استدراج نہیں ہے۔ آپ کے دل میں جو خیال پیدا ہوا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ استدراج نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہے جو ہورہی ہے تو استدراج نہیں''

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس پر حضرت کو بڑا ہی سکون اور اطمینان ہوا۔ اور فرمایا کہ میرا ذہن پہلے اس طرف نہیں گیا تھا۔

تو یہ بات صحیح ہے کہ بزرگوں نے فرمایا کہ جب استدراج ہوتا ہے تو کبھی دل میں واہمہ بھی نہیں گزرتا ہے جب ڈھیل دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ لیکن اگر دل میں یہ خیال اتر آئے تب تو آدمی یہ سوچتا رہے کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے کہیں استدراج نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے رجوع کرتا رہے انشاء اللہ وہ استدراج کی بلا سے محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى:

﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾(۱)

معزز حاضرین کرام! یہ میرے لئے خوشی اور افتخار کا باعث ہے کہ آج آپ حضرات سے ایک دینی موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ کا یہ ادارہ جس کو "ایوان صنعت وتجارت" کہا جاتا ہے یہاں عام طور پر جن لوگوں کو خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی ہے وہ لوگ یہاں آکر یا تو تجارت کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں یا سیاست کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا سیاست سے بھی عملی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے اور تجارت سے بھی کوئی عملی رابطہ نہیں ہے۔ میں دین کا طالب علم ہوں، اور جہاں کہیں کوئی بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا موضوع دین ہی سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا آج کی اس نشست میں اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور دین ایسی چیز ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اس میں کوئی بات نہ کہی گئی ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ صرف مسجد اور عبادت گاہوں کی حد تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے پر حاوی ہے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کے لئے مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں "موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض" کے موضوع پر گفتگو کروں۔ چنانچہ اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ صحیح بات، حق طریقے سے، حق نیت سے کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆ اصلاحی خطبات (۹/۵۰تا۷۱) ۲۰ جولائی ۱۹۹۳ء، ایوانِ صنعت وتجارت، کراچی

(۱) القصص: ۷۷

دین صرف مسجد تک محدود نہیں

بات دراصل یہ ہے کہ جب سے ہماری امت پر سیاسی اور سماجی زوال کا آغاز ہوا اس وقت سے یہ عجیب وغریب فضا بن گئی کہ دین کو ہم نے دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند عبادتوں کی حد تک محدود کر دیا ہے، جب تک ہم مسجد میں ہیں یا اپنے گھر میں عبادت انجام دے رہے ہیں اس وقت تو ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام یاد آ جاتے ہیں، لیکن جب ہم زندگی کی عملی کشاکشی میں داخل ہوتے ہیں اور بازار میں پہنچتے ہیں، یا سیاست کے ایوانوں میں پہنچتے ہیں، یا معاشرے کے دوسرے عملی گوشوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت دین کے احکام اور دین کی تعلیمات ہمارے ذہنوں میں نہیں رہتیں۔

تلاوت قرآن کریم سے آغاز

ہمارے درمیان یہ بڑا اچھا رواج جاری ہے کہ ہماری امت مسلمہ میں ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوتا ہے، وہ چاہے اسمبلی کی محفل ہو، یا اقتدار کی کوئی تقریب ہو، یا ایوان وصنعت وتجارت کی کوئی تقریب ہو، الحمدللہ سب سے پہلے اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ جس وقت وہ کلام پڑھا جا رہا ہے اس وقت تک تو اس کے احترام اور اس کی تعظیم وتکریم کا خیال ذہن میں آتا ہے، لیکن جونہی اس قرآن کریم کی تلاوت ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد عملی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے اس مرحلے پر وہ قرآن کریم یاد نہیں رہتا۔

قرآن کریم ہم سے فریاد کر رہا ہے

ہمارے دور کے ایک شاعر گزرے ہیں ''ماہر القادری صاحب مرحوم'' انہوں نے قرآن کریم کی فریاد پر ایک نظم کہی ہے، اس نظم میں انہوں نے قرآن کریم کو ایک فریادی کی شکل میں دکھایا ہے، وہ اس طرح فریاد کر رہا ہے:

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لئے
تکرار کی نوبت آتی ہے

پھر میری ضرورت پڑتی ہے
ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں

یعنی مجھے ہر وقت طاقوں میں سجا کر رکھا ہوا ہے، خوشبو میں بسا کر رکھا ہوا ہے، اور ہر مجلس کا آغاز میری تلاوت سے ہوتا ہے، مجھ سے برکت حاصل کی جاتی ہے، اور جب لوگوں کے درمیان جھگڑے پیش آتے ہیں تو پھر مجھے ہاتھوں میں اٹھا کر قسمیں دی جاتی ہیں، میرے ساتھ یہ سب سلوک ہو رہا ہے، اور زبان سے میری محبت اور تعظیم کے دعوے کئے جا رہے ہیں، لیکن جس قانون پر لوگ چل رہے ہیں اور جس انداز زندگی کو اختیار کیا ہوا ہے، وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے اے قرآن! ''معاذ اللہ'' تیری ہدایت کی ہمیں ضرورت نہیں۔

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

جن صاحب نے اس وقت جن آیات کی تلاوت فرمائی ہے وہ بہ موقع تلاوت کی ہیں ان آیات میں ارشاد ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِيْ السِّلْمِ كَآفَّةً﴾(۱)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''

یہ نہ ہو کہ مسجد میں جب تک ہو، اس وقت تو تم مسلمان ہو اور بازار میں مسلمان نہ ہو، اور اقتدار کے ایوان میں مسلمان نہ ہو، بلکہ تم ہر جگہ مسلمان ہو۔

بہرحال آج کی نشست کا موضوع یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ''موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض کیا ہیں'' اس موضوع کے سلسلے میں میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے، اس کی تھوڑی تشریح پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن تشریح کرنے سے پہلے موجودہ دور کا ایک تمہیدی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ اگر موجودہ حالات کے پس منظر میں جب اس آیت کی تشریح سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو شاید زیادہ فائدہ ہوگا۔

دو معاشی نظریے

ہم اور آپ اس وقت ایسے دور میں جی رہے ہیں جس میں یہ کہا اور سمجھا یا جا رہا ہے کہ انسان کی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ''معاش کا مسئلہ'' ہے، اور اسی بنیاد پر اس دور میں دو معاشی نظریوں

(۱) البقرة:۲۰۸

کے درمیان پہلے فکری اور پھر عملی تصادم رونما ہوا۔ ایک ''سرمایہ دارانہ معیشت'' کا نظریہ۔ اور دوسرا ''اشتراکی معیشت کا نظریہ'' ان دونوں نظریوں کے درمیان پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زبردست ٹکراؤ رہا، اور فکری اور عملی دونوں سطح پر یہ دونوں نظریے برسرپیکار رہے۔ دونوں کے پیچھے ایک فلسفہ اور ایک نظریہ تھا، ۷۴ سال گزرنے کے بعد ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اشتراکی معیشت کا جو نظر فریب ایوان تھا وہ بیٹھ گیا۔ اور دنیا نے پُر فریب نظریہ کی حقیقت کو عملی تجربہ گاہ میں پہچان لیا، اور اشتراکیت بحیثیت ایک انقلابی نظام کے فیل ہوگئی۔

اشتراکیت کے وجود میں آنے کے اسباب

لیکن یہ بات سوچنے کی ہے کہ اشتراکیت کیوں وجود میں آئی تھی؟ اور اس کے پیچھے کیا اسباب اور کیا عوامل کارفرما تھے؟ جن لوگوں نے دنیا کے مختلف معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت اشتراکیت ایک ردّعمل تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر جو امیر اور غریب کے درمیان زبردست دیواریں حائل ہیں اور اس میں دولت کی تقسیم کا نظام غیر منصفانہ ہے، اس غیر منصفانہ نظام کے ردّعمل کے طور پر اشتراکیت وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر فرد کو اتنی آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے، اس پر کسی طرح کی قید اور پابندی نہیں، آزاد معیشت اور آزاد تجارت کے نظریہ کے تحت اس کو کھلی چھٹی فراہم کی گئی، اور اس کھلی چھٹی کے نتیجے میں دولت کی تقسیم کا نظام ناہموار ہوگیا، اور امیر و غریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوگئیں، غریب کے حقوق پامال ہوئے، اس کے ردّعمل کے طور پر اشتراکیت کا نظام وجود میں آیا، جس نے یہ کہا کہ ''فرد کو کوئی آزادی نہیں ہونی چاہئے اور سرکاری منصوبہ بندی کے تحت معیشت کو کام کرنا چاہئے''

سرمایہ دارانہ نظام میں خرابیاں موجود ہیں

یہ بات ٹھیک ہے کہ اشتراکی نظام ناکام اور فیل ہوگیا، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کی وجہ سے اشتراکی نظام وجود میں آیا تھا، کیا وہ خرابیاں دور ہوگئیں؟ وہ ناانصافیاں جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پائی جاتی تھیں کیا ان کا کوئی مناسب حل نکل آیا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں جو خرابیاں تھیں وہ اپنی جگہ پر برقرار ہیں۔

سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ

اور یہ مقام عبرت ہے کہ جس تاریخ میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا، اور امریکی رسالے ''ٹائم'' (Time) کے جس شمارے میں یہ خبر اور اس پر تبصرے شائع ہوئے کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا اور اشتراکیت کا بت پاش پاش ہو گیا، ٹھیک اسی شمارے میں امریکی نظام حیات کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اسی بات پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ اس وقت امریکی نظام زندگی میں اپنی خدمات کے عوض سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ کون سا ہے؟

اس مضمون میں یہ کہا گیا تھا کہ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ''ماڈل گرلز'' کا طبقہ ہے، جو موڈلنگ کر کے پیسے کماتی ہیں۔ اور اس مضمون میں لکھا تھا کہ بعض ماڈل گرل ایسی ہیں جو ایک دن کی خدمات کا معاوضہ ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ کمانے والا طبقہ کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ۲۵ ملین ڈالر جو ایک ماڈل گرل کو دیئے جارہے ہیں، یہ کون ادا کر رہا ہے؟ اور کس کی جیب سے یہ رقم جارہی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ۲۵ ملین ڈالر آخرکار صارفین سے وصول کئے جائیں گے، ایک ہی شمارے میں یہ دونوں باتیں پڑھ کر مجھے عبرت ہو رہی تھی کہ ایک طرف تو یہ دعویٰ کر کے بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ ہم نے اشتراکیت کے بت کو پاش پاش کر دیا، لیکن جس چیز نے اشتراکیت کو جنم دیا تھا اس چیز کی طرف کسی کی نظر اور کسی کو فکر نہیں۔ آج آپ نے اشتراکیت کے ایک بت کو تو پاش پاش کر دیا، لیکن اس کے اصل سبب اور محرک کو ختم نہیں کیا تو کل کو ایک اور اشتراکیت ابھر کر سامنے آجائے گی، پہلی اشتراکیت نے انسانیت کو زخم دیئے۔ پھر دوسری اشتراکیت آ کر اس سے زیادہ زخم لگائے گی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اصل خرابی

صحیح بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں فرد کو منافع کمانے کی مکمل آزادی دی گئی ہے اور نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ درحقیقت خرابی اس وجہ سے تھی کہ اس نظام معیشت میں حلال وحرام کی کوئی تقسیم نہیں تھی، جائز اور ناجائز کی کوئی تقسیم نہیں تھی، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ جو دین اور معیشت کا جو نظام ہمیں عطا فرمایا ہے اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگرچہ انسان اپنی معیشت اور تجارت میں آزاد ضرور ہے، لیکن اپنے خالق اور مالک کے بتائے ہوئے احکام کا پابند بھی ہے، لہٰذا

اس کی تجارت، اس کی صنعت اور اس کی معیشت حلال وحرام کے اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور جب تک حلال وحرام کے ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تجارت ومعیشت کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوگا اس وقت تک اسی قسم کی بے اعتدالیوں اور ناکامیوں کا راستہ کھلا رہے گا۔

ایک امریکی افسر سے ملاقات

جس زمانے میں سود کے بارے میں ''فیڈرل شریعت کورٹ'' کا فیصلہ منظر عام پر آیا، اس وقت پاکستان میں امریکی سفارت خانے کے معاشی امور کے انچارج میرے پاس آئے اور اس فیصلے کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کیں۔ اس وقت اشتراکیت کی ناکامی کا تازہ تازہ واقعہ پیش آیا تھا، میں نے آخر میں ان سے گزارش کی کہ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آج امریکہ کا ڈنکا بج رہا ہے، اور بلاشبہ آپ لوگوں نے عالمی سطح پر اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے کہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ پوری دنیا میں اس وقت صرف ایک سپر طاقت ہے، دوسری کوئی طاقت نہیں۔ لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کی اس ناکامی کے بعد کیا آپ نے کبھی اس پہلو پر غور کیا کہ جن اسباب کے نتیجے میں یہ اشتراکیت ابھری تھی، کیا وہ اسباب ختم ہوگئے ہیں؟ اور کیا اب دوبارہ ان اسباب پر غور کرنے کی ضرورت نہیں؟ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی شخص کھڑا ہوکر یہ کہتا ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی اپنی جگہ پر ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا ایک حل ہمارے پاس موجود ہے، اور وہ یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے لائے ہوئے حلال وحرام کے اصولوں کی بنیاد پر کوئی اپنی معیشت کے اصولوں کو استوار کرتا ہے تو آپ کی طرف سے اس کو بنیاد پرستی کے طعنے دیئے جاتے ہیں، اس کو فنڈ امینٹلسٹ (Fundamentalist) کہا جاتا ہے، اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اور اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے، آپ یہ بتایئے کہ آپ کے خیال میں کیا کوئی تیسرا تصور وجود ہی میں نہیں آسکتا؟ آپ اس پر غور کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں؟

وہ کافی دیر توجہ سے میری بات سنتے رہے بعد میں انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے جو ذرائع ابلاغ ہیں انہوں نے بلاشبہ اسلامی احکام اور تعلیمات کو بڑا مسخ کرکے پیش کرنا شروع کردیا ہے، میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ اور سود کے بارے میں جس طرح آپ نے وضاحت سے بتایا، اس طرح وضاحت کے ساتھ میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے، اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈہ کے خوگر

ہیں۔ اس وجہ سے جب بھی اس قسم کی کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ ان کا اچھا طرز عمل نہیں ہے۔

صرف اسلام کا نظام معیشت منصفانہ ہے

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر دوسرے لوگ اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام کے بارے میں ایسی باتیں کریں تو انکو معذور سمجھا جا سکتا ہے، اس لئے کہ انہوں نے ''اسلام'' کو سمجھا ہی نہیں۔ اسلام کو پڑھا ہی نہیں، اسلام پر ان کو اعتقاد ہی نہیں، اسلام ان کو کیا سکھاتا ہے اس سے ان کو کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ لیکن ہم اور آپ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور اپنی ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کرتے ہیں، ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ہم اسلام کے اس عظیم پہلو سے اپنے آپ کو غافل اور بے خبر رکھیں، اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ ہمارے دین اسلام نے معیشت کے میدان میں ہمیں کیا تعلیم دی ہے؟ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اشتراکیت ناکام ہو چکی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہیں، ایسے معاشرے میں اگر کوئی نظام انسانیت کے لئے ایک اعتدال کی راہ پیش کر سکتا ہے، تو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا نظام ہے۔

اس یقین کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر اس آیت کریمہ پر غور کیا جائے جو بھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے تو اس میں ہماری اور آپ کی رہنمائی کے لئے بہت بڑا سامان ہے۔

قارون اور اس کی دولت

یہ آیت کریمہ سورۃ قصص کی آیت ہے، اس آیت میں قارون کو خطاب کیا گیا ہے، یہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بہت دولت مند شخص تھا، چنانچہ قارون کا خزانہ بہت مشہور ہے، یہ اتنا بڑا دولت مند تھا کہ اس کی دولت کی کثرت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ﴾(۱)

''اس خزانوں کی چابیاں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ ایک بڑی جماعت مل کر ان چابیوں کو اٹھا پاتی تھی''

(۱) القصص: ۷٦

اس زمانے میں چابیاں بھی بڑی وزنی ہوا کرتی تھیں، پھر اس کے خزانے بہت پھیلے ہوئے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے اس کو جو ہدایات دیں وہ اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہیں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، اگرچہ اس آیت میں براہ راست خطاب قارون کو ہے، لیکن اس کے واسطے سے ہر اس شخص کو خطاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہے۔

قارون کو چار ہدایات

چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾(۱)

یہ چار جملے ہیں، پہلے جملے میں فرمایا کہ جو کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو (دولت) عطا فرمائی ہے اس کے ذریعہ آخرت کی فلاح و بہبود کو طلب کرو۔

دوسرے جملے میں فرمایا کہ (یہ نہ ہو کہ آخرت کی فلاح طلب کرنے کے لئے ساری دولت لٹا دو اور دنیا میں اپنے پاس دولت بالکل نہ رکھو) بلکہ دنیا کا جو حصہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر فرمایا ہے اس کو مت بھولو (اس کو اپنے پاس رکھو، اس کا حق ادا کرو)

تیسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ دولت عطا کر کے) احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان اور اچھائی کا معاملہ کرو۔

چوتھے جملے میں ارشاد فرمایا کہ اپنی اس دولت کے بل بوتے پر زمین میں فساد مت مچاؤ۔ (اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش مت کرو) اس آیت میں یہ چار ہدایات قارون کو دیں۔

لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ چار ہدایات ایک تاجر کے لئے، ایک صنعت کار کے لئے اور ایک ایسے مسلمان کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر کچھ بھی عطا فرمایا ہو، ایک پورا نظام عمل پیش کر رہی ہیں۔

پہلی ہدایت، آخرت کی بہبود کی فکر

سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ تم میں اور ایک غیر مسلم میں فرق یہ ہے کہ غیر مسلم جو اللہ پر

(۱)　القصص: ۷۷

ایمان نہیں رکھتا، اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ دولت مجھے حاصل ہے یہ سب میری قوت بازو کا کرشمہ ہے، میں نے اپنی محنت سے، اپنی صلاحیت سے اور اپنی جدوجہد سے اس کو کمایا اور حاصل کیا ہے، لہٰذا میں اس دولت کا بلاشرکت غیر مالک ہوں۔ اور کسی شخص کو میری دولت میں مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں، یہ دولت میری ہے، یہ مال میرا ہے، میں نے اپنی قوت بازو کے بل پر اسے کمایا ہے، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس کو کمایا ہے۔ لہٰذا میں اس دولت کو کمانے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں، اور اس کو خرچ کرنے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

قوم شعیب علیہ السلام اور سرمایہ دارانہ ذہنیت

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِيْ أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ﴾(۱)

یعنی یہ جو آپ ہمیں منع کر رہے ہیں کہ کم مت ناپو، کم مت تولو، انصاف سے کام لو، حلال وحرام کی فکر کرو، تو یہ آپ نے ہمارے معاشی مسائل میں کہاں سے دخل اندازی شروع کر دی، تم اگر نماز پڑھنا چاہو تو اپنے گھر جا کر نماز پڑھو، یا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباء واجداد عبادت کیا کرتے تھے، یا ہمارا جو مال ہے اس میں ہم جو چاہیں کریں۔

حقیقت میں یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے کہ یہ مال ہمارا ہے، یہ دولت ہماری ہے، اس پر ہمارا سکہ چلے گا، تصرف ہمارا ہے، ہم جس طرح چاہیں گے کریں گے، جس طرح چاہیں گے کمائیں گے، اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی بھی یہی ذہنیت تھی، اس کی تردید میں یہ بات کہی گئی کہ جو دولت تمہارے پاس ہے یہ کلی طور پر تمہاری نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾(۲)

آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمادی ہے، اس لئے فرمایا:

---

(۱) ھود:۸۷ (۲) النساء:۱۳۱

﴿وَابْتَغِ فِيمَآ آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ﴾
''جو مال اللہ نے تمہیں دیا ہے اس کے ذریعہ آخرت طلب کرو''
یہ نہیں فرمایا اپنے مال کے ذریعہ آخرت طلب کرو۔

مال و دولت اللہ کی عطا ہے

لہٰذا پہلی بات یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے چاہے وہ نقد روپیہ ہو، چاہے وہ بینک بیلنس ہو، چاہے وہ صنعت ہو یا تجارت ہو، یہ سب اللہ کی عطا ہے۔ بیشک اس کو حاصل کرنے میں تمہاری جدوجہد اور کوشش کو بھی دخل ہے، لیکن تمہاری یہ کوشش دولت حاصل کرنے کے لئے علت حقیقی کا درجہ نہیں رکھتی، اس لئے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس دولت ہے، لیکن محنت کے ذریعہ مزید دولت حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ دولت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لہٰذا یہ تصور ذہن سے نکال دو کہ یہ دولت تمہاری ہے، بلکہ یہ دولت اللہ کی ہے، اور اللہ نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اس آیت سے ایک ہدایت تو یہ دے دی۔

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق ہیں:

(۱) پہلا فرق یہ ہے کہ مسلمان اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے، جبکہ غیر مسلم اس دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا نہیں سمجھتا، بلکہ اس دولت کو اپنی قوت بازو کا کرشمہ سمجھتا ہے۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس دولت کو آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنائے اور دولت کو حاصل کرنے اور اس کو خرچ کرنے میں ایسا طرز عمل اختیار کرے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ تاکہ یہ دنیا اس کے لئے دین کا ذریعہ بن جائے اور آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جائے۔ یہی دنیا ہے کہ اگر اس کے حصول میں انسان کی نیت درست ہو اور اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے حلال و حرام کے احکام کی پابندی ہو تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے اور یہی دنیا و آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان بھی کھاتا ہے اور کماتا ہے، اور ایک غیر مسلم بھی کھاتا ہے اور کماتا ہے، لیکن غیر مسلم کے دل میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا تصور ہوتا ہے اور نہ اس کے احکام کی

پابندی کا خیال ہوتا ہے، اور مسلمان کے دل میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ دنیا دین بنادی۔

اگر ایک تاجر اس نیت کے ساتھ تجارت کرے کہ میں دو وجہ سے تجارت کر رہا ہوں، ایک تو اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے ذمے کچھ حقوق عائد کئے ہوئے ہیں، میرے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں، میرے بچوں کے میرے ذمے کچھ حقوق ہیں، میری بیوی کے میرے ذمے کچھ حقوق ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ تجارت کر رہا ہوں۔ دوسرے اس لئے میں تجارت کر رہا ہوں کہ اس تجارت کے ذریعہ میں معاشرے میں ایک چیز فراہم کرنے کا ذریعہ بن جاؤں، اور مناسب طریقے سے ان کی اشیاء ضرورت ان تک پہنچاؤں۔

اگر تجارت کرتے وقت دل میں یہ دونیتیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ حلال طریقے کو اختیار کرے اور حرام طریقے سے بچے تو پھر یہ ساری تجارت عبادت ہے۔

تاجروں کی دو قسمیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ)) (۱)

"ایک امانت دار اور سچا تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا"

لیکن اگر تجارت کے اندر نیت صحیح نہ ہو اور حلال وحرام کی فکر نہ ہو تو پھر ایسے تاجر کے بارے میں پہلی حدیث کے برخلاف دوسری حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا إِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ)) (۲)

یعنی تجار قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے، "فجار" کے معنی ہیں فاسق وفاجر، نافرمان، گناہگار، سوائے اس تاجر کے جو تقویٰ اختیار کرے، نیکی اختیار کرے، اور سچائی اختیار کرے، اگر یہ تین شرطیں موجود نہیں ہیں تو وہ تاجر فجار میں شامل ہے، اور اگر یہ تین شرطیں موجود ہیں تو پھر وہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی إیاهم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲۴۲۷

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی إیاهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲۴۲۶

انبیاء اور صدیقین اور شہداء کی صف میں شامل ہے، ایسے تاجر کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام بخشا ہے۔

بہر حال، پہلا مرحلہ نیت کی درستی ہے، اور دوسرا مرحلہ عمل کے اندر حلال وحرام کا امتیاز ہے، یہ نہ ہو کہ مسجد کی حد تک تو وہ مسلمان ہے، لیکن مسجد سے باہر نکلنے کے بعد اس کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ ہو کہ میں جو کاروبار کرنے جارہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس دوسرے مرحلے پر مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں۔ ایک غیر مسلم سودی کاروبار کر رہا ہے تو مسلمان بھی سودی کاروبار کر رہا ہے، غیر مسلم قمار کا کام کر رہا ہے تو مسلمان بھی کر رہا ہے، اگر کسی مسلمان تاجر کے اندر یہ بات ہے تو پھر ایسا تاجر اس وعید کے اندر داخل ہے۔ جو دوسری حدیث میں اوپر عرض کی۔ اور اگر یہ بات نہیں تو پھر وہ تاجر پہلی حدیث میں بیان کی گئی بشارت کا مستحق ہے۔

دوسری ہدایت، دنیاوی ضروریات کا خیال

اب دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ اسلام نے ہماری تجارت کا راستہ بھی بند کر دیا اور یہ فرمادیا کہ بس آخرت ہی کو دیکھو، دنیا کو مت دیکھو، اور دنیا کے اندر اپنی ضروریات کا خیال نہ کرو۔ اس خیال کی تردید کے لئے قرآن کریم نے فوراً دوسرے جملے میں دوسری ہدایت یہ فرمائی:

﴿وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنيَا﴾(۱)

یعنی ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم دنیا کو بالکل چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ بلکہ تمہارا دنیا کا جو حصہ ہے اس کو مت بھولو، اسکے لئے جائز اور حلال طریقے اختیار کرنے کی کوشش کرو۔

یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں

لیکن قرآن کریم کے انداز بیان نے ایک بات اور واضح کر دی کہ تمہارا بنیادی مسئلہ اس زندگی کے اندر ''معاش کا مسئلہ'' نہیں، بیشک قرآن وحدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے معاش کے مسئلے کو تسلیم کیا ہے، لیکن یہ معاش کا مسئلہ تمہاری زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک کافر اور مومن میں یہی فرق ہے کہ کافر اپنی ساری زندگی کا بنیادی مسئلہ اس کو سمجھتا ہے کہ میری پیدائش سے لے کر مرتے دم تک میرے کھانے کمانے کا کیا انتظام ہے، اس سے آگے اس کی سوچ اور فکر نہیں جاتی۔ لیکن ایک مسلمان کو قرآن وحدیث یہ تعلیم دیتے ہیں کہ بیشک معاشی سرگرمیوں کی تمہیں اجازت

---

(۱) القصص: ۷۷

ہے، لیکن یہ تمہاری زندگی کا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ زندگی تو خدا جانے کتنے دنوں کی ہے، آج بھی ختم ہوسکتی ہے، کل بھی ختم ہوسکتی ہے، ہر لمحے اس زندگی کے ختم ہونے کا امکان موجود ہے، آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے موت سے انکار کیا ہو، خدا کا انکار کرنے والے دنیا میں موجود ہیں لیکن موت سے انکار کرنے والا کوئی نہیں۔ اس دنیا سے ضرور جانا ہے، اور اگر تم مسلمان ہو تو یقیناً تمہارا یہ اعتقاد ہوگا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے، وہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں، وہ ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔

کیا انسان ایک معاشی جانور ہے؟

ذرا سی عقل رکھنے والے انسان کو بھی یہ بات سوچنی چاہئے کہ اس کو اپنی جدوجہد اور اپنی زندگی کا بنیادی مقصد اس چند روزہ زندگی کو بنانا چاہئے، یا اس آنے والی دائمی زندگی کو اپنا مقصد بنانا چاہئے؟ ایک مسلمان جو اللہ اور اللہ رسول ﷺ کے احکام پر ایمان رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد صرف کھا پی کر پورا نہیں ہوجاتا، صرف زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ جمع کر کے پورا نہیں ہوجاتا، کیونکہ اگر ایسا ہوجائے تو پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا

انسان کی تعریف میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان ایک معاشی جانور (Economic Animal) ہے۔ یہ تعریف درست نہیں، اس لئے کہ اگر انسان صرف (Economic Animal) ہوتا تو پھر انسان میں اور بیل، گدھے، کتے میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

اس لئے کہ یہ جانور کھانے پینے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اگر انسان بھی صرف کمانے پینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سارے جانوروں کے لئے رزق کے دروازے کھولے ہیں۔ وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، لیکن انسان کو جانوروں سے جو امتیاز عطا فرمایا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور اس عقل کے ذریعہ وہ یہ سوچے کہ آئندہ آنے والی زندگی ایک دائمی زندگی ہے، اور وہ زندگی اس موجودہ زندگی پر فوقیت رکھتی ہے۔

بہرحال اس دوسرے جملے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ دنیا سے اپنا حصہ مت بھولو، لیکن یہ یاد رکھو کہ زندگی کا اصل مقصود دار آخرت ہے، اور یہ جتنی معاشی سرگرمیاں ہیں یہ راستے کی منزل ہیں یہ خود منزل مقصود نہیں۔

تیسری ہدایت، مال کو امورِ خیر میں خرچ کیجئے

پھر تیسرے جملے میں یہ ہدایت دی:

﴿وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾(۱)

"جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ دولت عطا کر کے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں پر احسان کرو"

اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتادیا کہ حلال وحرام میں فرق کرو اور حرام کے ذریعہ مال حاصل نہ کرو۔ اور دوسری طرف یہ بھی بتادیا کہ جو چیز حلال طریقے سے حاصل کی ہے اس کے بارے میں بھی یہ مت سمجھو کہ میں اس کا بلاشرکتِ غیر مالک ہوں۔ بلکہ اس کے ذریعہ تم دوسروں پر احسان کا معاملہ کرو۔ اور احسان کرنے کے لئے زکوٰۃ اور صدقات وخیرات کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

چوتھی ہدایت، زمین پر فساد مت پھیلاؤ

چوتھے جملے میں یہ ہدایت دی:

﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾

زمین میں فساد مت پھیلاؤ، یعنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ مت ڈالو، دوسروں کے حقوق غصب مت کرو، اگر تم نے ان چار ہدایات پر عمل کرلیا تو تمہاری یہ دولت، تمہارا یہ سرمایہ اور تمہاری یہ معاشی سرگرمیاں تمہارے لئے مبارک ہیں۔ اور تم انبیاء، صدیقین اور شہداء کی فہرست میں شامل ہو۔ اور اگر تم نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا تو پھر تمہاری ساری معاشی سرگرمیاں بیکار ہیں، اور آخرت میں اس کا نتیجہ سزا اور عذاب کی صورت میں سامنے آجائے گا۔

دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں

بہرحال اس وقت ہمارے مسلمان تاجروں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کی ان چار ہدایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اس دنیا کے سامنے جو نظامِ سرمایہ داری سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے، اور اشتراکیت سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے۔ اور ایسا نمونہ پیش کریں جو دوسروں کے لئے باعث کشش ہو، جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اس دور کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرے گا۔

(۱) القصص: ۷۷

کیا ایک آدمی معاشرے میں تبدیلی لاسکتا ہے؟

آج کل یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک نظام نہ بدلے، اور جب تک سب لوگ نہ بدلیں، اس وقت تک اکیلا آدمی کیسے تبدیلی لاسکتا ہے؟ اور اکیلا آدمی ان چار ہدایتوں پر کس طرح عمل کرسکتا ہے؟ یاد رکھئے! نظام اور معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی جگہ یہ سوچتا رہے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا اس وقت تک میں بھی نہیں بدلوں گا، تو پھر معاشرے میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ تبدیلی ہمیشہ اس طرح آیا کرتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ فرد بن کر اپنی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے، پھر اس چراغ کو دیکھ کر دوسرا چراغ جلتا ہے اور پھر دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اس طرح افراد کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے، اور افراد سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ عذر کہ میں تنہا کچھ نہیں کرسکتا، یہ معقول عذر نہیں۔

حضور ﷺ کس طرح تبدیلی لائے

جب نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں، اس وقت اگر آپ ﷺ یہ سوچتے کہ اتنا بڑا معاشرہ الٹی سمت کی طرف جارہا ہے میں تنہا کیا کرسکوں گا، اور یہ سوچ کر آپ ﷺ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے تو آج ہم اور آپ یہاں پر مسلمان بیٹھے ہوئے نہ ہوتے۔ آپ نے دنیا کی مخالفتوں کے سیلاب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک راہ ڈالی، نیا راستہ نکالا، اور اس راستے پر گامزن ہوئے، یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ کو اس راستے میں قربانیاں بھی دینی پڑیں، آپ کو پریشانیاں بھی پیش آئیں۔ مشکلات بھی سامنے آئیں، لیکن آپ نے ان سب کو گوارہ کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کی ایک تہائی آبادی محمد رسول اللہ ﷺ کی نام لیوا اور ان کی غلام ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوچ کر بیٹھ جاتے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا، اس وقت تک تنہا میں کیا کرسکتا ہوں تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

ہر شخص اپنے اندر تبدیلی لائے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی ذمہ داری اس کے اپنے اوپر ڈالی ہے، لہٰذا اس بات کو دیکھے بغیر کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں، ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو درست کرے، اور کم از کم اس بات کی طلب ہمارے دلوں میں پیدا ہوجائے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں معیشت

کے میدان میں اور تجارت وصنعت کے میدان میں کن احکامات کا پابند کیا ہے؟ ان احکام پر ہم کس طرح عمل کر سکتے ہیں، اس کی معلومات حاصل کر کے اس پر عمل کرنے کا جذبہ اور عزم پیدا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجلس انشاء اللہ بڑی مبارک اور مفید ہے۔ ورنہ نشستن وگفتن و برخواستن والی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ جذبہ اور یہ تصور اور یہ خیال اور یہ عزم ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمادے جو اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری دنیا وآخرت دونوں سنوار دے۔ اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



جدید معاشی مسائل اور نظریات ایک نظر میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾(۱)

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ:

﴿إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾(۲)

دین کا ایک اہم شعبہ ''معاملات''

کتاب البیوع سے دین کا ایک شعبہ یعنی معاملات کا شعبہ شروع ہو رہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند اصولی باتیں پہلے ذکر کردی جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ معاملات، دین کا ایک بہت ہی اہم شعبہ ہے اور جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عبادات کا مکلّف بنایا ہے اسی طرح معاملات میں بھی کچھ احکام کا مکلف بنایا ہے۔ اور جس طرح ہمیں عبادات میں رہنمائی عطا فرمائی ہے اسی طرح معاملات میں بھی رہنمائی عطا فرمائی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کے وقت کن باتوں کا خیال رکھیں، کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی چیزیں حرام ہیں، افسوس یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں کے درمیان معاملات سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی اہمیت دلوں سے مٹ گئی ہے، دین صرف

☆ انعام الباری (۶/۱۴۱ تا ۶۷) زیرِ نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ نے معاملاتِ جدیدہ پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) البقرۃ:۲۷۵ (۲) البقرۃ:۲۸۲

عقائد اور عبادات کا نام رکھ دیا ہے، معاملات کی صفائی، معاملات میں جائز وناجائز کی فکر اور حلال وحرام کی فکر رفتہ رفتہ ختم ہوگئی ہے، اس لئے بھی اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان کے بارے میں غفلت بڑھتی جارہی ہے۔

معاملات کے میدان میں دین سے دوری کی وجہ

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند سو سالوں سے مسلمانوں پر غیر ملکی اور غیر مسلم سیاسی اقتدار مسلط رہا اور غیر مسلم سیاسی اقتدار نے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ اس بات کی تو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے عقائد پر قائم رہیں اور مسجدوں میں عبادات انجام دیتے رہیں، اپنی انفرادی زندگی میں عبادات کا اہتمام کریں لیکن زندگی میں تجارت (Business) ومعیشت (Economy) کے جو عام کام ہیں وہ سارے کے سارے ان کے اپنے قوانین کے تحت چلائے گئے اور دین کے معاملات کے احکام کو زندگی سے خارج کردیا گیا، چنانچہ مسجد ومدرسہ میں تو دین کا تذکرہ ہے لیکن بازاروں میں، حکومت کے ایوانوں میں اور انصاف کی عدالتوں میں دین کا ذکر اور اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا اور غیر مسلموں نے اقتدار پر قبضہ کیا۔ چونکہ اسلام کے جو معاملات سے متعلق احکام ہیں وہ عمل میں نہیں آرہے تھے، اور ان کا عملی چلن دنیا میں نہیں رہا، اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کی اہمیت گھٹ گئی اور ان پر بحث ومباحثہ اور ان کے اندر تحقیق واستنباط کا میدان بھی بہت محدود ہوکر رہ گیا۔

فطری نظام ایسا ہے کہ جیسی جیسی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ اس کے حساب سے اسباب پیدا فرماتے رہتے ہیں، معاملات کا شعبہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب اس پر عمل ہورہا ہوتو نئے نئے معاملات سامنے آتے ہیں، نئی نئی صورتحال کا سامنا ہوتا ہے اس میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے، فقہاء کرام ان پر غور کرتے ہیں، ان کے بارے میں استنباط کرتے ہیں اور نئی نئی صورتحال کے حل بتاتے ہیں، ان کے بارے میں شریعت کے احکام سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں۔

لیکن جب ایک چیز کا دنیا میں چلن ہی نہیں رہا تو اس کے بارے میں فقہاء سے پوچھنے والے بھی کم ہوگئے، اس کے نتیجے میں فقہاء کرام کی طرف سے استنباط کا جو سلسلہ چل رہا تھا وہ بھی دھیما پڑ گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ رک گیا بلکہ دھیما پڑ گیا، اس واسطے کہ اللہ کے کچھ بندے ہر دور میں ایسے رہے ہیں کہ جو اپنی تجارت اور معیشت میں حلال وحرام کی فکر رکھتے تھے، وہ کبھی کبھی علماء کی طرف رجوع کرتے اور علماء ان کے بارے میں کچھ جوابات دیتے جو ہمارے ہاں فتاویٰ کی کتابوں میں

موجود ہیں، لیکن چونکہ پورا نظام غیر اسلامی تھا اس واسطے غور و تحقیق اور استنباط کے اندر وسعت نہ رہی اور اس کا دائرہ محدود ہوگیا اور اس کی وجہ سے معاملات کے سلسلے میں فقہ کا جو ایک طبعی ارتقاء تھا وہ سست پڑ گیا، اور اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جب ہم دینی مدارس میں فقہ اور حدیث وغیرہ پڑھتے پڑھاتے ہیں تو سارا زور عبادات پر صَرف کر لیتے ہیں اور جب معاملات کا باب آتا ہے تو چونکہ ذہن میں اس کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور بازار میں اس کا چلن کم ہوگیا ہے، اس لئے اس پر کچھ زیادہ توجہ اور اہمیت کے ساتھ بحث ومباحثہ کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی، عام طور سے معاملات کے ابواب بھاگتے دوڑتے گزر جاتے ہیں، اس وجہ سے معاملات کی فقہ کو جاننے والے کم ہوگئے ہیں اور جب وہ کم ہوگئے ہیں تو ایک طرف بازار میں نئے نئے معاملات پیدا ہورہے ہیں اور نئی نئی صورتیں وجود میں آرہی ہیں، دوسری طرف ان صورتوں کو سمجھنے اور ان کے حکم کا استنباط کرنے والوں کی کمی ہوگئی ہے۔

اب اگر ایک تاجر تجارت کر رہا ہے اور اس کو اس کے اندر روز مرہ نئے نئے حالات پیش آتے ہیں وہ کسی عالم کے پاس جاتا ہے کہ بھائی میری یہ صورت حال ہے اس کا حکم بتائیں؟ اب صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ تاجر عالم کی بات نہیں سمجھتا اور عالم تاجر کی بات نہیں سمجھتا کیونکہ دونوں کے درمیان ایک ایسا فاصلہ قائم ہوگیا ہے کہ ان کی بہت سی اصطلاحات اور بہت سے معاملات میں ان کے عرف اور ان کے طریق کار سے عالم ناواقف ہے۔ تاجر اگر مسئلہ پوچھے گا تو وہ اپنی زبان میں پوچھے گا اور عالم نے وہ زبان نہ سنی، نہ پڑھی، لہٰذا وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پاتا، عالم جواب دے گا تو اپنی زبان میں جواب دے گا، جس سے تاجر محروم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ علماء کے پاس جاکر ہمیں اپنے سوالات کا پورا جواب نہیں ملتا تو انہوں نے علماء کی طرف رجوع کرنا ہی چھوڑ دیا۔

اس کی وجہ سے علماء اور کاروبار کرنے والوں کے درمیان اور معاملات کے اندر بہت بڑا فاصلہ پیدا ہوگیا اور اس کے نتیجے میں خرابی در خرابی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ''فقہ المعاملات'' کو سمجھا جائے اور پڑھا جائے۔

معاملات کی اصلاح کا آغاز

اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سارے عالم میں ایک شعور پیدا ہورہا ہے اور وہ شعور یہ ہے کہ جس طرح ہم اپنی عبادتیں شریعت کے مطابق انجام دینا چاہتے ہیں اسی طرح اپنے معاملات کو بھی شریعت کے سانچے میں ڈھالیں، یہ قدرت کی طرف سے ایک شعور ہے جو ساری دنیا کے

مسلمانوں میں رفتہ رفتہ پیدا ہونا شروع ہوا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کی ظاہری شکل وصورت اور ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر دور دور تک یہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ متدین ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حرام مال کی نفرت اور حلال مال کی طرف رغبت پیدا فرمادی ہے۔ اب وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح ہمارے معاملات شریعت کے مطابق ہو جائیں وہ اس تلاش میں ہیں کہ کوئی ہماری رہنمائی کرے، لیکن اس میدان میں رہنمائی کرنے والے کم ہو گئے، ان کے مزاج ومزاق کو سمجھ کر ان کے معاملات اور اصطلاحات کو سمجھ کر جواب دینے والے بہت کم ہو گئے اس وقت ضرورت تو بہت بڑی ہے لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے والے افراد بہت کم ہیں۔

ایک اہم کوشش

اس لئے میں عرصہ دراز سے اس فکر میں ہوں کہ دینی مدارس کے تعلیمی نصاب میں ''فقہ المعاملات'' کو خصوصی اہمیت دی جائے اور اس غرض کے لئے بہت سے اقدامات بھی کئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

بہرحال یہ بہت ہی اہمیت والا باب ہے اس لئے خیال یہ ہے کہ ''کتاب البیوع'' سے متعلقہ جو مسائل سامنے آئیں انہیں ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ کم از کم ان سے واقفیت ہو جائے۔

نظامہائے معیشت

پہلی بحث اس سلسلے میں یہ ہے کہ آپ نے یہ نام بہت سنے ہوں گے کہ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور اشتراکی نظام (Socialism) اس وقت دنیا میں یہی دو نظام رائج ہیں اور ساری دنیا ان دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، اگرچہ اشتراکیت بحیثیت سیاسی طاقت کے بفضلہٖ تعالیٰ ختم ہوگئی ہے، روس کے زوال اور سویت یونین کے سقوط کے بعد اس کو وہ سیاسی طاقت تو حاصل نہیں جو پہلے تھی لیکن ایک نظریہ کے طور پر وہ اب بھی زندہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی جوریاستیں آزاد ہوئی ہیں ان میں امریکی اثرات پھیلنے کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں بھی پھیلی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں میں دوبارہ اشتراکی نظام کی طرف رغبت پیدا ہو رہی ہے۔ ابھی سقوط کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیاں سامنے آنا شروع ہوگئی ہیں اس لئے لوگ پھر اشتراکی نظریہ کو زندہ کرنے کی فکر میں لگ گئے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس کی بعض آزاد شدہ ریاستوں میں کمیونسٹ پارٹی (Comunist Party) الیکشن کے اندر بڑے بھاری ووٹ لے کر کامیاب ہوئی، لہٰذا اگرچہ اشتراکیت کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا ہے لیکن بطور ایک نظریہ کے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اشتراکیت ختم ہوگئی ہے بلکہ وہ اب بھی زندہ ہے۔

دنیا میں یہ دو متخالف نظریات (اشتراکیت اور سرمایہ داری) رائج رہے ہیں اور دنیا ان کے درمیان سیاسی سطح پر باہمی جنگ وجدال کی پلیٹ میں رہی ہے، فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث ومناظرہ کا بازار بھی گرم رہا اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ تو ایک سرمایہ دارانہ نظام ہے اور دوسرا اشتراکی نظام ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کیا ہیں؟

آج کل لوگ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟ اشتراکی نظام کیا ہے؟ ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ ان میں کہاں غلطی ہے؟ اور ان کے مقابلے میں اسلامی معیشت کے احکام کس طرح ممتاز ہیں؟ یہ بات دو اور دو چار کر کے واضح طور پر ذہنوں میں نہیں ہے، عام طور پر مجمل باتیں کی جاتی ہیں۔

بنیادی معاشی مسائل

اس لئے میں مختصراً اس کو ذکر کرتا ہوں کہ اس طرح سمجھنا چاہئے کہ آج معاشیات (Economies) ایک مستقل فن بن گیا ہے، معیشت ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے اور کسی بھی نظام معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے وہ بنیادی طور پر چار ہیں۔

1۔ ترجیحات کا تعین: (Determination of Priorites)

پہلا مسئلہ جس سے معیشت کو واسطہ پڑتا ہے اس کو معاشی اصطلاح میں ترجیحات کا تعین کہتے ہیں۔ معنی ہے کہ یہ بات واضح اور مسلم ہے کہ انسان کی خواہشات زیادہ ہیں (یہاں ضروریات کا لفظ استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ خواہشات کا لفظ استعمال کر رہا ہوں) اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل ان کے مقابلے میں کم ہیں۔

ہر انسان کے دل میں بے شمار خواہشات ہوتی ہیں کہ میرے پاس اتنا پیسہ آجائے، میرے

پاس اچھی سواری ہو، میں ایسا مکان بنالوں، مجھے کھانے کو فلاں چیز ملے وغیرہ وغیرہ تو خواہشات تو بہت ہیں لیکن ان خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل کم ہیں۔(۱)

ایک لطیفہ ہے کہ ایک دیہاتی تھا، ایک دن کہنے لگا کہ ''یوں جی کرے کہ ڈھیر سارا دودھ ہو اور اس میں ڈھیر سارا گڑ ڈالوں اور اس گڑ کو انگل سے چلا کے خوب پیوں'' کسی نے کہا کہ بھائی تیرا جی تو کرے لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ کہنے لگا انگل ہے اور تو کچھ بھی نہیں، تو خواہشات تو بہت ہیں لیکن ان کو پورا کرنے کے وسائل محدود ہیں، ایک انسان کی انفرادی سطح پر بھی یہی معاملہ ہے اور کسی ملک اور معاشرہ کی اجتماعی سطح پر بھی یہی معاملہ ہے۔

فرض کریں ایک انسان کا معاملہ دیکھ لیں اس میں بھی یہی صورتحال ہے کہ اس کی خواہشات بہت ہیں اور ایک ملک کی سطح پر دیکھ لیں کہ ملک کی خواہشات بہت ہیں۔ خواہشات کیا ضروریات بھی بہت ہیں، ہمارا ملک ہے تو اس کی ضرورت یہ بھی ہے کہ اس کی سڑکیں اچھی بنیں، اس کے ہسپتال اچھے تعمیر ہوں، اس کی تعلیم گاہیں اچھی ہوں، اس کا دفاع مضبوط ہو، یہ بے شمار ضروریات ہیں، لیکن ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے جو وسائل ہیں وہ کم اور محدود ہیں۔ لہٰذا اس کے بغیر چارہ نہیں کہ انسان کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم رکھے اور کچھ کو مؤخر رکھے، اسی کا نام ترجیح ہے کہ ایک خواہش کو دوسری خواہش پر ترجیح دے کہ میں کون سی خواہش پہلے پوری کروں اور کون سی خواہش بعد میں پوری کروں۔

اب مثلاً ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ کراچی سے لے کر پشاور تک موٹروے بنے اور ایک خواہش یہ بھی ہے کہ ایٹم بم بنے، اب ہمیں ترتیب قائم کرنی پڑتی ہے کہ اتنا پیسہ تو نہیں ہے کہ دونوں کام کریں، لہٰذا جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے اس کو مقدم کریں گے اور دوسرے پر ترجیح دیں گے کہ اس وقت بھارت نے ایٹم بم بنالیا ہے اگر اس نے کسی وقت بھی چلالیا تو ہمارے لئے مصیبت بن جائے گی، اس لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ایٹم بم بنائیں۔ تو موٹروے کو مؤخر کردیا، اس کو ترجیحات کا تعین کہتے ہیں اور ہر معاشی نظام میں یہ پہلا مسئلہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کیا جائے کہ کون سی چیز مقدم ہو اور کون سی چیز مؤخر ہو۔

2۔ وسائل کی تخصیص:(Allocation of Resources)

یعنی کچھ وسائل ہمارے پاس ہیں، زمینیں ہیں، روپیہ ہے، کارخانے ہیں، یہ سب وسائل ہیں ان میں سے کتنے وسائل کو کس کام میں خرچ کیا جائے، مثلاً ترجیحات کا تعین کرلیا کہ ہمیں گندم اگانی

(۱) راجع لتفصیل المباحث: تکملة فتح الملهم (۳۱۲/۱ - ۳۳۰)

چاہئے وہ بھی ضروریات میں داخل ہے، چاول اگانے چاہئیں وہ بھی ضروریات میں داخل ہیں، کپڑا بنانا چاہئے وہ بھی ضروریات میں داخل ہے، لیکن کتنی زمینوں میں گندم اگائیں، کتنی زمینوں میں چاول اگائیں اور کتنی زمینوں میں روئی (کپاس) اگائیں، کتنی زمینوں میں چائے اور کتنی میں تمباکو اگائیں؟ اسی طرح کتنے کارخانے کپڑے کے قائم کریں، کتنے جوتے کے قائم کریں اور کتنے اسلحہ کے قائم کریں؟ اس کو وسائل کی تخصیص کہتے ہیں کہ وسائل کو مختلف معاشی سرگرمیوں میں کس طرح مخصوص کیا جائے؟

3۔آمدنی کی تقسیم:(Distribution of Income)

تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے، کہ ترجیحات کا تعین بھی کرلیا، وسائل کی تخصیص بھی کردی گئی، اب زمینیں کام میں لگی ہوئی ہیں کہ ان کے اندر چاول اگ رہے ہیں، گندم اگ رہی ہے وغیرہ وغیرہ، کارخانے کام میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں کپڑا بن رہا ہے، ان میں جوتے بن رہے ہیں، ضرورت کی دوسری اشیاء بن رہی ہیں۔ اس تمام عمل پیداوار کے نتیجے میں جو آمدنی یا پیداوار حاصل ہوئی اس کو وسائل پیداوار میں کس طرح تقسیم کیا جائے؟ اس کو دولت کی تقسیم بھی کہتے ہیں اور آمدنی کی تقسیم بھی کہتے ہیں۔

4۔ترقی:(Development)

چوتھا مسئلہ ترقی کا ہے "کمًّا" اور "کیفاً" بھی ترقی حاصل ہو، مثلاً انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہ رہے بلکہ آگے بڑھے، اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ آدمی پہلے گدھے پر سفر کرتا تھا، پھر گھوڑے پر سفر کرنے لگا، پھر اونٹ پر سفر، پھر سائیکل بنائی، پھر موٹر سائیکل بنالی، پھر کار بنالی، پھر ہوائی جہاز بنالیا اور اب ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے۔

تو ترقی انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے، ہم کس طرح اپنی معیشت میں ترقی کرسکتے ہیں، اس کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے کہ ہم ایک حالت پر نہ رہیں بلکہ آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یہ وہ چار بنیادی مسائل ہیں جن سے ہر نظام معیشت کو سابقہ پڑتا ہے، ترجیحات کا تعین (Dwtermination of Priorities) وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources) آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income) اور ترقی (Development)

ہم جب تک کسی بھی نظام معیشت کے بارے میں بات کریں تو سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نظام نے ان چار مسائل کا حل کس طرح تلاش کیا ہے، اور ان چار مسائل میں اس نے

کیا طریقہ کار تجویز کیا جائے۔

ان مسائل کے حل میں ایک راستہ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) نے اختیار کیا ہے اور دوسرا راستہ اشتراکیت (Socialism) نے اختیار کیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ ان چاروں مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی آزادی دے دی جائے، یعنی ہر ایک کو یہ آزادی دے دی جائے کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کرے، جس طرح معقول حدود میں رہ کر منافع کمائے، اور منافع کمانے کی جدوجہد کرے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ جب منافع کمانے کے لئے ہر شخص کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو قدرت کی طرف سے دو طاقتیں ایسی مقرر ہیں جو اس منافع کمانے کی جدوجہد کو اس طرح استعمال کریں گی کہ اس سے یہ چاروں مسائل خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے وہ دو طاقتیں کیا ہیں؟

کہتے ہیں کہ ایک رسد (Supply) ہے اور ایک طلب (Demand) ہے، بازار میں جن اشیاء کی مانگ ہوتی ہے ان کو طلب (Demand) کہتے ہیں اور جو سامان بیچنے کے لئے بازار میں لایا جاتا ہے اس کو رسد (Supply) کہتے ہیں۔

قانونِ قدرت

قدرت کا قانون یہ ہے کہ جب کسی چیز کی رسد بڑھ جائے اور طلب کم ہو تو قیمتیں کم ہو جاتی ہیں اور اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے اور رسد کم ہو تو قیمت بڑھ جاتی ہے، یہ عام مشاہدہ ہے کہ گرمی میں برف کی بہت ضرورت پڑتی ہے اور بازار میں ضرورت کے بقدر مہیا نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے قیمت بڑھ جاتی ہے اور برف مہنگی ہو جاتی ہے، اس کے برعکس سردی میں برف کی رسد زیادہ ہوتی ہے اور طلب کم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے قیمت گھٹ جاتی ہے، تو رسد و طلب یہ قدرت کا ایک قانون ہے جس کا انہوں نے نام رکھا ہے "بازار کی قوتیں" یعنی مارکیٹ فورسز (Market Forces) یہ قدرتی طاقتیں ہیں جو بازار میں کارفرما ہیں۔

اب ایک طرف قدرتی طاقتیں بازار میں کام کر رہی ہیں، دوسری طرف آدمی سے یہ کہہ دیا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی جدوجہد کرو۔

اب وہ شخص جب بازار آئے گا تو لازماً وہی چیز لائے گا جس کی طلب زیادہ ہوگی اور رسد کم ہوگی، اسے کہا گیا کہ زیادہ منافع کماؤ! اب وہ سوچے گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے اور رسد کم ہے، کیونکہ جب وہ چیز لائے گا تو بازار میں زیادہ قیمت وصول ہوگی اور زیادہ منافع کما سکے گا اگر وہ ایسی چیز بازار میں لے آئے جس کی پہلے ہی رسد زیادہ اور طلب کم ہے تو اس سے نقصان ہوگا۔

جب ہر شخص کو آزادی دے دی گئی کہ تم منافع کماؤ تو اب وہ وہی چیز بازار میں لے کر آئے گا جس کی طلب زیادہ ہو اور رسد کم ہو اور اس وقت تک لاتا رہے گا جب تک رسد طلب کے برابر نہ ہو جائے، جس مرحلہ پر رسد اور طلب برابر ہوگی اب اگر اور بھی لے کر آئے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمت گر جائے گی اور اس کا نقصان ہوگا۔

اگر کوئی کپڑے کا تاجر ہے تو وہ دیکھے گا کہ بازار میں کپڑا کتنا ہے؟ اگر وہ محسوس کرے گا کہ طلب زیادہ ہے اور بازار میں جو پیداوار ہو رہی ہے وہ کم ہے، قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو وہ کپڑا بازار میں لائے گا، کپڑے کا کارخانہ لگائے گا لیکن جب رسد اور طلب برابر ہو جائے گی جس کو معاشی اصطلاح میں ''نقطۂ توازن'' کہتے ہیں، جب نقطۂ توازن قائم ہو جائے گا تو اس وقت بازار میں کپڑا لانا بند کر دے گا کیونکہ اس وقت نقصان ہوگا۔

تو سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ اس طرح خود بخود ترجیحات کا تعین ہو جائے گا، ہر آدمی سوچے گا کہ بازار میں کس چیز کی ضرورت ہے؟ کپڑے کی ضرورت ہوگی تو کپڑا بنائے گا کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ لے کر آئے گا۔ جب آدمی نفع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائے گا کہ کون سی چیز بنائی جائے اور کون سی نہ بنائی جائے۔

ایک زمیندار ہے وہ زمین کے اندر چاول بھی اگا سکتا ہے، گندم بھی اگا سکتا ہے، کپاس بھی اگا سکتا ہے، تمباکو اور چائے بھی اگا سکتا ہے، لیکن وہ اگانے سے پہلے یہ سوچے گا کہ اسے کس چیز میں زیادہ فائدہ ہوگا، بازار میں جس کی طلب اور ضرورت زیادہ ہوگی وہ اسے ہی اگائے گا، اگر لوگوں کو آٹا نہیں مل رہا ہے اور وہ افیون کی کاشت کرنے لگے تو وہ احمق ہوگا۔ اس وقت اس کو افیون کا خریدار کوئی نہیں ملے گا وہ سوچے گا کہ آٹے کا ملک میں قحط ہے لہٰذا گندم اگانی چاہئے۔ اسی سے ترجیحات کا تعین بھی ہو رہا ہے اور وسائل کی تخصیص بھی ہو رہی ہے۔

آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income)

سرمایہ دارانہ نظام یہ کہتا ہے کہ پیداوار کے چار عوامل ہوتے ہیں، یعنی کوئی بھی پیداواری عمل

ہو اس میں چار چیزیں مل کر کام کرتی ہیں تب کوئی پیداوار وجود میں آتی ہے، مثلاً کپڑے کا کارخانہ ہے اس میں کام کرنے والے چار عوامل ہیں۔

(۱) زمین (Land) ایسی جگہ جہاں کام کیا جائے یہ ایک عامل پیداوار ہے۔

(۲) سرمایہ (Capital) سرمایہ سے مراد روپیہ ہے، آدمی کے پاس روپیہ ہوگا تو وہ اس سے تعمیر کرے گا، مشینری خریدے گا وغیرہ وغیرہ۔

(۳) محنت (Labour) یعنی اگر زمین بھی ہو سرمایہ بھی ہو لیکن محنت نہ ہو تو کام نہیں ہوسکتا لہٰذا محنت کرنے کے لئے مزدور لانے پڑتے ہیں۔

(۴) آجر یا تنظیم: چوتھی چیز جس کا اردو میں ترجمہ بڑا مشکل ہے یعنی اس کو آجر کہتے ہیں اور بعض اس کو تنظیم کہتے ہیں ایسا آدمی جو ان تینوں عوامل کو اکٹھا کر کے ان کی تنظیم کرے اور ان سے کام لے اس کو انگریزی میں (Entrepreneur) کہتے ہیں۔ یہ اصل میں فرانسیسی لفظ ہے اس کا اردو میں صحیح ترجمہ "مہم جو" ہے۔ یعنی جو یہ بیڑا اٹھائے کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور اس میں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگائے کہ میں یہ کام کروں گا، رسک خطرہ مول لیتا ہے، پھر ان چیزوں کو جمع کرتا ہے، زمین لیتا ہے، سرمائے مہیا کرتا ہے، مزدور مہیا کرتا ہے، آگے جا کر یہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے کہ جو سامان تیار ہوگا نہ معلوم وہ فروخت ہو یا نہ ہو۔

تو یہ چاروں عوامل پیداوار (Factors of Production) ہوتے ہیں: زمین، سرمایہ، محنت اور آجر یا تنظیم۔

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ ان چاروں عوامل نے مل کر آمدنی پیدا کی ہے اس لئے ان چاروں عوامل کا آمدنی میں حصہ ہے۔

زمین کا حصہ کرایہ ہے، یعنی جس آدمی نے کاروبار کے لئے زمین دی ہے وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس کو زمین کا کرایہ دیا جائے۔

سرمایہ کا حصہ سود ہے، یعنی جس نے سرمایہ مہیا کیا اس کو اس بات کا حق ہے کہ وہ سود کا مطالبہ کرے کہ میں نے اتنا سرمایہ، اتنے پیسے دیئے تھے مثلاً میں نے تمہیں ایک لاکھ روپیہ دیا تھا، اس میں سے مجھے دس فیصد سود دو۔

محنت یعنی مزدور کا حق ہے کہ وہ اجرت یعنی اپنی مزدوری وصول کرے۔

یہ تین چیزیں دینے کے بعد یعنی زمین کا کرایہ (Rent) سرمایہ کا سود (Interest) اور مزدوری کی اجرت (Wages) جو کچھ بچے وہ آجر یا تنظیم کا منافع (Profit) ہے کیونکہ اس نے ان

سب کو لگانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اور خطرہ بھی مول لیا تھا، لہٰذا جو کچھ بچے وہ سارا آجر کا منافع ہے۔

سوال: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے یہ تو کہہ دیا کہ زمین کا کرایہ ملے گا، سرمایہ کو سود اور مزدور کو اجرت ملے گی، لیکن زمین کو کتنا کرایہ، سرمایہ کو کتنا سود اور مزدور کو کتنی اجرت ملے گی؟ اس کا تعین کیسے ہوگا؟

جواب: سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا ہے کہ اس کا تعین بھی وہی رسد وطلب کرے گی، زمین کا کرایہ، مزدور کی اجرت اور سرمایہ کا سود ان کی مقدار کا تعین بازار کی قوتیں رسد اور طلب ہی کریں گی، مثلاً زید کو ایک کارخانہ لگانا ہے اس کے لئے زمین چاہئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زمین کی کتنی رسد ہے اور طلب کتنی ہے؟ آیا زمین کرایہ پر لینے والا زید تنہا ہی ہے یا اور لوگ بھی اس فکر میں ہیں کہ زمین کرایہ پر لیں، اگر زید تنہا ہی زمین کا لینے والا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ زمین کی طلب کم اور رسد زیادہ ہے، لہٰذا زمین کا کرایہ بھی کم ہوگا، اور اگر ساری قوم زمین کی تلاش میں ہے اور زمینیں گنی چنی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی رسد کم ہے اور طلب زیادہ ہے، لہٰذا زمین کا کرایہ بھی زیادہ ہوگا تو رسد اور طلب کی طاقتیں جہاں مل جائیں گی وہاں کرایہ کا تعین ہوگا۔

فرض کریں زید کو زمین کی ضرورت ہے اور وہ ایک ہزار سے زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا اب وہ ایک ہزار ماہانہ کے حساب سے زمین کی تلاش میں نکلا، بازار میں جا کر دیکھا کہ وہاں پوری قوم زمین کی تلاش میں پھر رہی ہے، کوئی پانچ ہزار ماہانہ دینے کو تیار ہے، کوئی سات ہزار دینے کو تیار ہے اور زمینیں کم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زید کو ایک ہزار میں زمین نہیں ملے گی، لہٰذا اسے چارو ناچار پانچ ہزار میں کسی سے بات کرنا ہوگی۔

اسی طرح اگر زمین والا دل میں یہ ارادہ بٹھا لیتا ہے کہ میں اپنی زمین دس ہزار ماہانہ سے کم پر نہیں دوں گا۔ بازار میں جا کر دیکھتا ہے کوئی پانچ ہزار دینے کو تیار نہیں کہ زمین کی رسد زیادہ ہوگئی ہے اور طلب کم ہے، لہٰذا وہ لازماً پانچ ہزار میں دینے پر مجبور ہوگا۔

تو پانچ ہزار کا نکتہ ایسا ہے جس پر طلب ورسد جا کر مل جائیں گے اور کرایہ متعین ہو جائے گا، تو زمین کا کرایہ متعین کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ رسد وطلب کی طاقتیں متعین کریں گے۔

سود میں بھی یہی طریقہ ہے کہ آدمی کاروبار کے لئے روپیہ چاہتا ہے، وہ بینک کے پاس جاتا ہے کہ مجھے کاروبار کے لئے پیسے چاہئیں، بینک اس کو کہتا ہے کہ میں اتنے سود پر مہیا کروں گا، اب اگر روپے کی طلب زیادہ ہے اور روپیہ کم ہے تو سود کی شرح بڑھ جائے گی، اور اگر اس کے برعکس روپے کی

طلب تو کم ہے رسد زیادہ ہے تو سود شرح گھٹ جائے گی، تو یہاں بھی رسد و طلب مل کر سود کی شرح متعین کریں گے۔

یہی معاملہ مزدور کا بھی ہے کہ اگر بازار میں مزدوروں کی رسد زیادہ ہے، ہزاروں جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے روزگار ملے، کارخانے کم ہیں، تو اجرت بھی کم ہوگی اس واسطے کہ رسد زیادہ ہے۔

کارخانے دار کے پاس مزدور جاتا ہے کہ مجھے رکھ لو، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں رکھتا، مزدور کہتا ہے کہ مجھے ایک روپیہ یومیہ پر رکھ لو، مگر رکھ لو، اب کارخانے دار سوچتا ہے کہ دوسرا آدمی دو روپے یومیہ پر کام کر رہا ہے یہ اس سے سستا پڑتا ہے اس لئے دوسرے آدمی کی چھٹی کرادی اور اس سے کہا کہ تم آجاؤ۔

اس کے برعکس اگر مزدوری کرنے والے کم ہوں اور محنت طلب کرنے والے زیادہ ہوں تو اس صورت میں اجرت بڑھ جائے گی۔

یہاں ہمارے ملک میں چونکہ بے روزگار زیادہ ہیں اس لئے اجرتیں کم ہیں۔ انگلینڈ میں جا کر دیکھ لیں وہاں اجرتیں آسمانوں پر پہنچی ہوئی ہیں، ہم لوگ عیش کرتے ہیں، گھروں میں کام کے لئے نوکر موجود ہیں۔ لیکن وہاں اگر گھر میں کام کرنے کے لئے نوکر رکھنا پڑ جائے تو دیوالیہ نکل جائے اس لئے کہ نوکر اتنا مہنگا ملتا ہے۔ اجرتیں بڑھی ہوئی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدوروں کی رسد کم اور طلب زیادہ ہے، چنانچہ مزدور کی اجرت بھی رسد اور طلب کے نتیجے میں متعین ہوگی۔

چوتھا مسئلہ، ترقی (Development)

جب آپ نے ہر انسان کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو وہ بازار میں ایسی چیز لانے کی کوشش کرے گا جو زیادہ دلکش اور مفید و پائیدار ہو، اور لوگ اس کی طرف زیادہ رغبت کریں۔

اگر ایک آدمی کار بنا رہا ہے اور سالہا سال سے ایک ہی طرح کی کار بنائے جا رہا ہے تو اس سے لوگ اکتا جائیں گے، تو وہ چاہے گا کہ میں کار کو ایسا بناؤں کہ اس کے نتیجے میں لوگوں سے زیادہ پیسے مانگ سکوں، اس لئے وہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی نئی چیز لگا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختراع کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس کو بروئے کار لا کر انسان نئی سے نئی چیزیں پیدا کرتا ہے تو ترقی خود بخود ہوتی چلی جائے گی۔ جب انسان کو زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو اب انسان ایک سے ایک چیز پیدا کرے گا۔ بازار میں دیکھ لیں یہی ہو رہا ہے، ہر روز نئی پیداوار سامنے آتی ہے اس لئے کہ آدمی سوچتا ہے کہ میں ہر روز نئی چیز لے کر آؤں، جس کی طرف لوگ مائل ہوں اور جس کی

طرف لوگ بھاگیں، اس طرح سے دن بدن ترقی ہورہی ہے۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے میں معیشت کے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ہی جادو کی چھڑی ہے یعنی رسد اور طلب کی بازاری قوتیں۔ اس کو مارکیٹ (Market Mechnism) بھی کہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اصول

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول تین ہیں۔

(۱) انفرادی ملکیت کا احترام، کہ ہر شخص کی ملکیت کا احترام کیا جائے،

(۲) منافع کمانے کے لئے لوگوں کو آزاد چھوڑنا۔

(۳) اور حکومت کی طرف سے عدم مداخلت، یعنی حکومت بیچ میں مداخلت نہ کرے کہ تاجروں پر پابندی لگارہی ہے، یہ کررہی ہے، وہ کررہی ہے بلکہ انہیں آزاد چھوڑ دو۔

سوال: مہم جو یعنی آجر یا تنظیم کا منافع تو طلب ورسد سے تعین نہیں ہوا؟

جواب: وہ اس طرح سے متعین ہوا کہ جب طلب ورسد سے اجرت بھی متعین ہوئی، سود بھی متعین ہوا، کرایہ بھی متعین ہوا، اور جو چیز باقی بچے اس کا نام منافع ہے، اور باقی بچنے والی مقدار کتنی ہے؟ وہ موقوف ہے ان تینوں چیزوں کے تعین پر اور یہ تینوں چیزیں رسد وطلب سے متعین ہوتی ہیں، لہٰذا وہ بھی بالواسطہ رسد وطلب سے متعین ہورہا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب وہ اپنی چیز اپنی پیداوار بازار میں لے کر گیا تو وہاں جتنی قیمت ملے گی وہ طلب ورسد کی حیثیت سے حاصل ہوگی، پھر اس قیمت میں سے ان تینوں کو جو ادائیگی ہوگی وہ بھی طلب ورسد کی بنیاد پر ہوگی، لہٰذا جو باقی بچے وہ بھی درحقیقت طلب ورسد کا ہی کرشمہ ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کا خلاصہ ہے۔

اشتراکیت (Socialism)

اشتراکیت میدان میں آئی، اس نے کہا کہ جناب آپ نے معیشت کے اتنے اہم اور بنیادی مسئلے کو طلب ورسد کی اندھی اور بہری طاقتوں کے حوالے کردیا ہے، آپ نے کہا کہ ہر کام اسی سے ہوگا یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے اس پر اشتراکیت نے دو بنیادی تنقیدیں کیں۔

سرمایہ دارانہ نظام پر تنقیدیں

اشتراکیت کی طرف سے یہ تنقید کی گئی کہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی بازار میں وہی چیز لائے گا جس کی بازار میں زیادہ طلب ہوگی اور جب طلب، رسد کے برابر ہوجائے گی تو بنانا چھوڑ دے گا اس واسطے کہ اگر مزید بنائے گا تو نفع کم ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نکتہ ہے جس پر پہنچ کر طلب اور رسد برابر ہوں گے، کیا ہر انسان کے پاس خودکار میٹر موجود ہے جس سے وہ اندازہ کرے کہ اب طلب ورسد برابر ہوگئے ہیں، لہٰذا اب مزید نہیں بنانا چاہئے یا کوئی فرشتہ غیب سے آکر اس کو بتلائے گا کہ اب رسد وطلب برابر ہوگئی ہے اب مزید مت بنانا، نہ کوئی ایسا میٹر موجود ہے، نہ کوئی ایسی غیبی طاقت موجود ہے جو آکر تاجر کو بتادے کہ اب چیزیں بنانا بیکار ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عملاً ایسا ہوتا ہے کہ تاجر اپنی مصنوعات بناتا چلا جاتا ہے، اس گمان پر کہ ابھی تک طلب رسد کے برابر نہیں ہوئی، لیکن حقیقت میں طلب رسد کے برابر ہوچکی ہوتی ہے، اور تاجر اس زعم باطل میں مبتلا ہے، دوسرا ابھی اسی میں مبتلا ہے، تیسرا ابھی اسی میں مبتلا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زعم باطل کے واشگاف ہوتے ہوتے کروڑوں ٹن سامان ضرورت سے زیادہ بن گیا، تب آنکھیں کھلیں کہ یہ تو بہت زیادہ ہوگیا، بازار میں قیمتیں گرنے لگیں، کساد بازاری آگئی، کارخانے بند ہونا شروع ہوگئے، اس واسطے کہ سامان ضرورت سے زیادہ ہوگیا، بازار میں قیمتیں اتنی گرگئیں کہ لاگت بھی وصول نہیں ہورہی ہے، کارخانے بیکار ہورہے ہیں، انہوں نے کہا کہ انہیں بند کرو۔ چنانچہ کارخانے بند ہوئے، کارخانے بند ہونے کا مطلب ہے کہ ہزارہا مزدور بے کار، نتیجہ یہ ہوا کہ بیروزگاری پھیل گئی، اس کو "کساد بازاری" کہتے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی بلا ہے کہ معاشی بیماریوں میں شاید اس سے زیادہ خطرناک بیماری اور کوئی نہیں ہے۔

آج لوگ سمجھتے ہیں کہ افراط زر بہت بڑی بلا ہے، یعنی قیمتوں کا چڑھ جانا، لیکن قیمتوں کے چڑھ جانے سے کساد بازاری زیادہ خطرناک چیز ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں ملک معاشی طور پر تباہ ہوجاتا ہے، کارخانے بند اور لوگ بیروزگار ہوجاتے ہیں۔

اب چونکہ کساد بازاری ہے لوگوں نے کہا کہ کارخانے مت لگانا جو سامان بنا تھا وہ سستے داموں بک گیا، لوگ ڈر اور خوف میں مبتلا ہیں کہ کارخانے مت لگانا کیونکہ اس میں نقصان ہے، یہاں تک کہ رسد کم پڑ گئی اور طلب بڑھ گئی، اب مزید کوئی سامان بنانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے، تاجر کہتا ہے کہ مثلاً میں کپڑے کا کارخانہ نہیں لگاؤں گا کیونکہ میں اس

سے تباہ ہو چکا ہوں لوگ کپڑے مانگ رہے ہیں اور وہ نہیں مل رہے ہیں، پھر اچانک کچھ لوگ آتے ہیں کہ اب حالات بدل گئے ہیں، اب طلب بڑھ گئی ہے، چلو اب کارخانے لگاتے ہیں، لیکن یہ جو درمیانی وقفہ تھا یہ انتہائی عدم توازن کا تھا، جس میں دس بیس سال گزر جاتے ہیں، اس میں معاشی طور پر ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں، کساد بازاری آتی ہے، بعض اوقات بے روزگاری پھیلتی ہے اور خدا جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔

اور یہ جو آپ نے کہا کہ طلب ورسد کی طاقتیں متعین کر دیتی ہیں تو متعین کر دینے کے کیا معنی؟ کہ بیچ میں ایک عرصہ ایسا گزرتا ہے جس میں بے انتہا ناہمواری رہتی ہے، اب پھر اگلی مرتبہ بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں نے دوبارہ بنانا شروع کیا اور ویسے ہی زیادہ بناتے چلے گئے، لہٰذا آپ کا یہ فلسفہ کہ طلب ورسد کی طاقتیں خود متعین کر دیتی ہیں، یہ صحیح نہیں رہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آدمی کو بھی سامان اور بھیڑ بکری تصور کر لیا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اس کی اجرت بھی رسد وطلب سے متعین ہوگی، جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بازار میں مزدور زیادہ ہیں تو اس کی اجرت کم ہوگی، آپ کو اس سے بحث نہیں کہ اگر مزدور ایک روپیہ یومیہ پر راضی ہوگیا ہے تو اس ایک روپے میں خود کیا کھائے گا اور اپنے بچوں کو کیا کھلائے گا، اور کس خستہ حال مکان میں رہے گا، فٹ پاتھ پر سوئے گا لیکن (آپ کی نظر میں) آپ کہتے ہیں کہ رسد وطلب نے اجرت کا تعین کر لیا تو بات ٹھیک ہوگئی، لیکن وہ بے چارہ سارا دن اپنے گاڑھے پسینے کی محنت کرتا ہے اور شام کو اس کو ایک روپیہ مزدوری ملتی ہے جس سے ایک روٹی بھی مشکل سے آتی ہے، وہ ایک روٹی خود کھائے یا اپنے بچوں کو کھلائے اور رات کو فٹ پاتھ پر جا کر سوئے، آپ کہتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، یہ غیر انسانی فلسفہ ہے کہ مزدور کی اجرت کو آپ نے بھیڑ بکریوں کی طرح رسد وطلب کا تابع بنا دیا۔

اشتراکیت والوں کی تیسری تنقید یہ ہے کہ آپ نے عوامل پیداوار چار مقرر فرمائے ہیں۔ زمین، سرمایہ، محنت اور آجر یا تنظیم جبکہ ہماری نظر میں عوامل پیداوار صرف دو ہیں۔ زمین اور محنت زمین کسی انسان کی ملکیت نہیں، یہ عطیۂ قدرت ہے، جب انسان دنیا میں آیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے زمین دے دی تھی، پوری زمین مشترک ہے، اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ یہ کہے کہ یہ میری زمین ہے میں اس کا اتنا کرایہ لوں گا، زمین تو عطیہ قدرت ہے اور اس زمین پر انسان محنت کرتا ہے تو اس سے پیداوار وجود میں آتی ہے۔

یہ سرمایہ کہاں سے آیا؟ یہ تنظیم کہاں سے آ گئی؟ جب سب سے پہلے انسان زمین پر اترا تھا

اس وقت اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، صرف زمین تھی اس نے زمین پر محنت کی، محنت سے گندم اگائی، تو گندم محنت اور زمین سے پیدا ہوئی، نہ کوئی سرمایہ تھا، نہ تنظیم تھی، اس واسطے ہمارے نزدیک عوامل پیداوار صرف دو ہیں۔ ایک زمین اور دوسری محنت۔ زمین کرایہ کی حق دار اس لئے نہیں کہ وہ عطیہ قدرت ہے کسی کی ملکیت نہیں، البتہ محنت اجرت کی حق دار ہے، لہٰذا آپ نے جو یہ تین، چار مزید آمدنی کی مدیں بنا رکھی ہیں کہ زمین کا کرایہ، سرمایہ کا سود اور آجر کا منافع ان کے قول کے مطابق سب ناجائز ہے، نہ کرایہ جائز، نہ سود جائز اور نہ منافع جائز ہے۔

البتہ جائز اگر ہے تو وہ محنت کی مزدوری ہے اور جو حقیقت میں آمدنی کی مستحق تھی، اس کو آپ نے رسد اور طلب کے تابع کر دیا اور وہ جتنی چاہے کم ہو کوئی حرج نہیں ہے حالانکہ حقیقی مستحق تو وہی تھا، لہٰذا آپ کا فلسفہ بالکل بیوقوفی کا فلسفہ ہے، لغویت ہے اور ناانصافی ہے، پھر صحیح بات کیا ہے؟

کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ساری زمین اور سارے وسائل و پیداوار کسی کی بھی شخصی ملکیت میں نہیں ہونی چاہئے، نہ زمین کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، نہ کارخانہ کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ سب کو سرکار کی تحویل میں دے دیا جائے، جو نمائندہ حکومت ہے جمہوری حکومت ہے، اس کی تحویل میں دے دیئے جائیں کہ زمینیں بھی تمہاری ملکیت میں اور کارخانے بھی تمہاری ملکیت میں اور آپ چاروں مسائل یعنی ترجیحات کا تعین (Determination of Priorities) وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources) آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income) اور ترقی (Development) ان کو منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کریں، یعنی منصوبہ بنائیں کہ ہمارے ملک میں کتنی آبادی ہے، فی کس کتنی گندم چاہئے، فی کس کتنے چاول چاہئے، فی کس کتنے گز کپڑا چاہئے اور فی کس کتنی چائے چاہئے؟

اس حساب سے یہ دیکھیں کہ ہمارے پاس کتنی زمینیں ہیں؟ اب منصوبہ بندی کر کے جتنی ضرورت ہو اس منصوبہ کے مطابق اتنی زمین میں گندم لگاؤ، اتنی زمین میں چاول لگاؤ اور اتنے ہی کارخانے لگاؤ، جتنے معاشی فیصلے کرو، وہ منصوبہ بندی سے کرو، اور پھر اس طرح جو پیداوار حاصل ہو وہ جو مزدور کام کر رہے ہیں ان میں تقسیم کر دو، نہ سود، نہ سرمایہ، نہ کرایہ، نہ منافع۔

تو ساری زمین، سارے کارخانے سب کچھ قومی ملکیت میں لے لیں اور منصوبہ بندی کر کے ترجیحات کا تعین کریں وسائل کی تخصیص کریں، آمدنی کی تقسیم کریں اور ترقی کے مسائل کو منصوبہ بندی سے حل کریں، یہ اشتراکیت کا فلسفہ ہے۔

اسی واسطے اشتراکیت کا دوسرا نام منصوبہ بند معیشت ہے، جسے پلینڈ اکانومی (Planned

(Economy) کہتے ہیں، اور سرمایہ دارانہ معیشت کا دوسرا نام مارکیٹ اکانومی (Market Economy) ہے یعنی بازار کی معیشت، کیونکہ وہاں بازار کا تصور ہے اور اشتراکیت میں بازار کا تصور نہیں وہ محض نام نہاد بازار ہے کیونکہ کارخانے سب حکومت کے ہیں، جو پیداوار ہورہی ہے اس کی قیمت حکومت نے مقرر کردی، بازار میں جو بیچنے کے لئے بیٹھا ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے، حکومت کا کارندہ ہے، قیمت متعین ہے بھاؤ تاؤ کا سوال نہیں بلکہ گورنمنٹ نے جو قیمت مقرر کردی اسی قیمت پر چیز ملے گی، لینا ہو لے لو، ورنہ بھاگو، لہٰذا بازار کا وہ تصور جس سے ہم متعارف ہیں کہ کمپیٹیشن (Competition) ہورہا ہے، مقابلہ ہورہا ہے، یہ نہیں ہے اس لئے اس معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں سرمایہ دارانہ نظام ہوتا ہے وہاں ہر آدمی اپنی پیداوار کو رواج دینے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتا ہے، پبلسٹی کرتا ہے، اشتہار چھاپتا ہے، شہر کے اندر اشتہارات کے بورڈ نظر آتے ہیں، اشتراکی ملک میں ان چیزوں میں سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا، نہ وہاں بورڈ ہے، نہ وہاں اشتہار ہے، اس لئے کہ کسی کو اس کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ کوئی چیز ذاتی ملکیت نہیں ہے، بازار میں جو کچھ فروخت ہورہا ہے جاکر بازار میں دیکھیں اگر پسند آجائے تو قیمت لکھی ہوئی ہے لے لیں، اگر نہیں پسند تو نہ لیں، اس لئے اس میں بازار کا تصور نہیں ہے، اس لئے کو پلینڈ اکانومی (Planned Economy) یعنی منصوبہ بند معیشت کہتے ہیں اور اس کو مارکیٹ اکانومی (Market Economy) بازار کی معیشت کہتے ہیں۔

اشتراکی نظام پر تبصرہ

جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے اس نے جو فلسفہ پیش کیا اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان کے بنیادی فلسفے کے مطابق معیشت کے جتنے مسائل ہیں ان کے نزدیک سب کا حل یہ ہے کہ تمام وسائل پیداوار قومی ملکیت میں لے کر ان کی منصوبہ بندی کی جائے، درحقیقت یہ ایک مصنوعی اور استبدادی طریقہ ہے۔

معیشت وہ بھی معاشرت کے بے شمار مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اس میں پسند اور ناپسند کے فیصلے منصوبہ بندی کی بنیاد پر نہیں ہوسکتے۔

مثال کے طور پر شادی بیاہ کا معاملہ ہے، اس میں مرد کو اپنے لئے مناسب عورت چاہئے اور

عورت کو اپنے لئے مناسب مرد چاہئے، اور ہوتا یہ ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں اور پھر آپس میں بات چیت ہو کر معاملہ طے پاتا ہے، اب اس معاملہ میں بعض اوقات فیصلوں میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور جوڑ صحیح نہیں بیٹھتا آپس میں نااتفاقی اور ناچاقی بھی پیش آتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ ناچاقیاں اس لئے ہو رہی ہیں کہ یہ باہمی پسند و ناپسند سے فیصلے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اب منصوبہ بندی کرو کہ ملک میں کتنے مرد ہیں اور کتنی عورتیں؟ اس حساب سے منصوبہ بندی کی بنیاد پر ان کی شادیاں کرائی جائیں تو ظاہر ہے یہ چلنے والی بات نہیں ہے۔ یہی معاملہ معیشت کا بھی ہے کہ اس میں ہر ایک آدمی کی افتادہ طبع ہوتی ہے، اس افتادہ طبعی کو معیشت کے معاملات میں استعمال کرنا پڑتا ہے۔

اب اگر اس کی منصوبہ بندی کر دی جائے کہ تم فلاں کارخانے میں کام کرو گے یا فلاں زمین پر کام کرو گے اور اس کو اس سے مناسبت نہیں تو اس طرح اس کی صلاحیتیں ضائع ہوں گی اور اس کی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لیا جا سکے گا۔ اور یہ نظام شدید قسم کے استبداد کے بغیر چل بھی نہیں سکتا۔

مثلاً ایک شخص کی ڈیوٹی روئی کے کارخانے میں لگا دی جائے کہ جا کر روئی کے کارخانے میں کام کرو، اس کا دل وہاں کام کرنے کو نہیں چاہ رہا ہے، وہ بھاگنا چاہتا ہے تو اسے استبداد کے ذریعے ہی روکا جا سکتا ہے۔ لہٰذا شدید قسم کی جکڑ بند اور شدید قسم کا استبداد جب تک نہ ہو اس وقت تک یہ نظام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ دنیا میں یوں تو استبداد کے بہت سے نظام آئے لیکن جتنا استبداد اشتراکیت میں تھا اتنا کسی اور نظام میں مشکل سے ملے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی بالکل سلب ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آزادی سلب ہو جائے گی اور آدمی کو مجبور کر دیا جائے گا تو وہ اپنے ذوق وشوق سے محنت کرنے سے کترائے گا۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی شخص کا ذاتی مفاد کسی چیز سے وابستہ ہوتا ہے تو اس سے اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور اگر ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو تو دلچسپی اس درجہ برقرار نہیں رہتی۔ تو وہاں اشتراکی نظام کے اندر چونکہ صنعتیں اور کارخانے ہیں وہ کسی انسان کے ذاتی ملکیت میں تو ہوتے نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنے لوگ کام کرتے ہیں ان کو ہر صورت میں تنخواہ ملتی ہے، اس صنعت کو ترقی ہو یا نہ ہو، فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، فروغ ہو یا نہ ہو۔ اب کیوں اس کے اندر زیادہ محنت کرے، کیوں زیادہ وقت صَرف کرے، نتیجہ یہ کہ دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔ ڈیوٹی تو ان کو آٹھ گھنٹے ادا کرنی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ خود اپنے ملک پاکستان میں دیکھ لیجئے کہ بھٹو صاحب کے ابتدائی دور کے

اندر انہوں نے بہت سی صنعتیں قومی ملکیت میں لیں۔ جتنی صنعتیں قومی ملکیت میں گئیں سب ڈوبیں، اور اس کا انجام بالاخر یہ ہوا کہ وہ نقصان میں گئیں، انہوں نے خسارہ اٹھایا۔ اور اب آخر کار سب مجبور ہورہے ہیں کہ دوبارہ ان کو نیلام کر کے شخصی ملکیت میں دیا جائے تاکہ وہ صنعتیں صحیح طریقہ سے کام کر سکیں۔

آجکل یونائیٹڈ بینک کا بہت بڑا اسکینڈل چل رہا ہے (جو حبیب بینک کے بعد ملک کے دوسرے نمبر کا بینک ہے) اب اس کا حال یہ ہورہا ہے کہ دیوالیہ نکلنے کے قریب ہے اور اب اس کو بالآخر افراد کے حوالے کرنے کی فکر کی جارہی ہے۔ اشتراکی ممالک میں ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا۔ کیونکہ دکاندار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ سامان زیادہ بک رہا ہے یا کم بک رہا ہے۔ دونوں حالتوں میں ان کو وہ تنخواہ ملنی ہے جو مقرر ہے۔ تو اس واسطے وہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے یا گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے فکر نہیں کرتا۔

الجزائر کا ایک چشم دید واقعہ

الجزائر میں ایک دوکان میں خود میرا ایک واقعہ پیش آیا کہ مجھے ایک تفسیر جو (التنویر والتحریر) علامہ طاہر بن عاشور کی ہے وہ خریدنی تھی، تو شام کے وقت پانچ بجنے کا وقت قریب تھا، میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں یہ تفسیر خریدنا چاہتا ہوں اور تفسیر خریدنے کے معنی یہ تھے کہ وہ بارہ سو (الجزائری) دینار کی تھی، لیکن میرے پاس الجزائری دینار نہیں تھے امریکی ڈالر تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں جاکر اس کو کھلوا کر لاتا ہوں آپ براہِ کرم اتنی دیر میرا انتظار کیجئے تو اس نے جواب دیا کہ نہیں پانچ بجے دوکان بند ہوجائے گی۔ میں نے کہا مجھے صرف پانچ منٹ مہلت دیجئے میں جلدی سے جاکر اس کو الجزائری دینار میں تبدیل کرا کے دوڑتا ہوا پہنچا۔ اور پانچ بجکر ایک یا دو منٹ ہوئے تھے کہ دوکان بند ہوگئی تھی اور دکاندار غائب، نتیجہ یہ کہ وہ الجزائری دینار آج تک میرے پاس پڑے ہوئے ہیں، کہیں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کبھی الجزائر جانا ہوا تو استعمال ہوں گے ورنہ دنیا میں کوئی اس کو لینے کو تیار نہیں۔

یہ ایک واقعہ ہے جو میں نے آپ کو بتایا، اور یہ عام ہے کہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے اشتراکی ملک میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا، اس لئے کہ سامان زیادہ بکے یا نہ بکے اس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ کہ چوہتر سال تک اشتراکی نظام نے جس ملک کے اندر اپنا تسلط قائم رکھا بالآخر وہیں اس کا برا حال ہوگیا اور لوگ اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

دوسری طرف یہ کہا گیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں نے وسائل پیداوار پر قبضہ کر رکھا ہے، زمینوں پر، کارخانوں پر اور لوگوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں، اگر دیکھا جائے تو پہلے ظلم ڈھانے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن اب جب ساری دولت سمٹ کر حکومت کے ہاتھوں میں آ گئی جس کا مطلب ہے چند سو افسران کے ہاتھوں میں، تو جب یہ افراد دولت کے اتنے بڑے تالاب پر قابض ہو گئے تو ان کی بدعنوانیاں، ان کی نوکر شاہی اور ان کی بدکرداریاں بہت زیادہ ہونے لگیں، کیونکہ اگر ایک آدمی ایک کارخانہ کا مالک ہے اور وہ لوگوں پر ظلم ڈھاتا ہے تو جو گروپ ملک کی تمام دولت پر قابض ہو وہ اس سے زیادہ ظلم کا ارتکاب کرے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جائیں گے اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آ جائے گا۔ جو دولت کے سارے وسائل کو من مانی طریقے سے استعمال کرے گا۔

چونکہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور اس کی طبعی افتاد کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا اس لئے یہ نظام ۷۴ سال چلنے کے بعد زمین پر منہ کے بل گر پڑا۔ اس نظام کا تجربہ بھی ہو گیا اور تجربہ سے بھی یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ غلط نظام تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ

سرمایہ دارانہ نظام کی غلطی کو سمجھنے کے لئے ذرا دقت نظر کی ضرورت ہے، کیونکہ جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کے اس نکتے کا تعلق ہے کہ معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کی بنیاد پر نہیں بلکہ بازار کی قوتوں کی بنیاد پر ہیں، رسد وطلب کی طاقتوں کی بنیاد پر ہیں۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر غلط نہیں اور قرآن وسنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً﴾ (۱)

"ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی ان کی دنیا کی زندگانی میں اور بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے ایک دوسرے کو خدمت گار"

کہ ہم نے ان کے درمیان معیشت کی تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت عطا کی ہے تا کہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ایسا نظام بنایا ہے کہ بازار میں پہنچنے کے بعد مختلف لوگ اپنی

---

(۱) الزخرف: ۳۲

افتادِ طبع کے مطابق لوگوں کی طلب پوری کرتے ہیں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بازار میں رسد و طلب کا نظام ہم نے قائم کیا ہے۔ ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَلَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ))(۱)

''کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے''

وہاں ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَنْ بَعْضٍ))(۲)

''لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا فرمائیں یعنی بیچ میں مداخلت نہ کرو''

اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں کو تسلیم کیا ہے، انفرادی ملکیت کو بھی تسلیم کیا ہے، منافع کے محرک کو بھی تسلیم کیا ہے، کہ آدمی اپنے منافع کے لئے کام کرے، تو بظاہر یہ بنیادی فلسفہ غلط نہیں ہے، لیکن غلطی یہاں سے لگی کہ یہ کہہ دیا کہ ذاتی منافع کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو اس طرح آزاد چھوڑ دو کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب منافع حاصل کرنا مقصود ہو تو جو بھی طریقہ چاہو استعمال کرو، چاہے سود کے ذریعے ہو، چاہے قمار کے ذریعہ ہو، چاہے سٹہ بازی کے ذریعہ ہو، حلال و حرام کی کوئی تفریق نہیں، بلکہ یہ کہا کہ جس طرح بھی تمہیں منافع ملے، کماؤ نہ تو کوئی اخلاقی پابندی ہے۔ لہٰذا ننگی فلمیں تیار کرو، اس میں منافع مل رہا ہے، عریاں رسالے اور عریاں فلمیں مغربی ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، هل يبيع حاضر لباد بغير أجر وهل يعينه أو ينصحه، رقم: ۲۰۱۳، صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه وسومه على سومه، رقم: ۲۷۹۰، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء لا يبيع حاضر لباد، رقم: ۱۱٤۳، سنن النسائي، كتاب البيوع، باب بيع الحاضر للبادي، رقم: ٤٤١٩، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في النهي أن يبيع حاضر لباد، رقم: ۲۹۸۳، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب النهي أن يبيع حاضر لباد، رقم: ۲۱٦٦، مسند أحمد، رقم: ۷۰۱۱

(۲) صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه وسومه على سومه، رقم: ۲۷۹۹، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء لا يبيع حاضر لباد، رقم: ۱۱٤۳، سنن النسائي، كتاب البيوع، باب بيع الحاضر للبادي، رقم: ٤٤١٩، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب النهي أن يبيع حاضر لباد، رقم: ۲۱٦۷، مسند أحمد، رقم: ۱۰۲۲۷

ماڈل گرل (Model Girl) کی کارکردگی

کچھ عرصہ پہلے ایک امریکی رسالہ ٹائمز (Times) میں اطلاع آئی تھی کہ امریکہ میں خدمات کے میدان میں جو سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ہے وہ ماڈل گرل (Model Girl) ہے۔ کئی ملین ڈالر یومیہ کماتی ہیں تو جب منافع کمانے کا ہر طریقہ جائز ہوگیا تو اس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں رہی۔ جائز وناجائز، اخلاقی وغیر اخلاقی مناسب اور نامناسب کی کوئی تفریق نہیں رہی۔

عصمت فروشی کا قانونی تحفظ

عصمت فروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے کاروبار کو بہت سے مغربی ملکوں میں قانونی تحفظ حاصل ہے اگرچہ بہت سے ملکوں میں اب بھی قانوناً منع ہے، لیکن بہت سے ملکوں نے اس کو قانوناً تحفظ فراہم کردیا ہے۔ پچھلے دنوں لاس اینجلس میں عصمت فروش عورتوں کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن ملکوں نے ابھی تک لائسنس نہیں دیا وہ بھی لائسنس دے دیں، تو جب منافع کمانے کے لئے ہر شخص آزاد ہے اور اس پر کوئی پابندی، کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو وہ ہر طریقہ اختیار کرے گا۔

ایک انٹرنیشنل ماڈل گرل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی کمپنیوں کے ساتھ بھی ماڈلنگ کرتی ہے اس کی فیس اس کے لگ بھگ ہوتی ہے وہ تو علیحدہ، اور دوسرے ملکوں میں جانے کا فرسٹ کلاس ٹکٹ کا کرایہ الگ، فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کا خرچہ الگ اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ تین سال تک وہ کمپنی جتنی مصنوعات بنائے گی اس کی منہ مانگی مقدار اس کو مفت فراہم کرے گی۔ اس طرح کی شرائط عائد ہوتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں اشیاء کی لاگت میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام اس کو برداشت کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ جو کہا گیا کہ ہر ایک آدمی کو آزاد چھوڑ دو اس سے اخلاقی خرابیاں بے انتہا پیدا ہوتی ہیں، اور عوام سے پیسے سمیٹنے کا ہر طریقہ جائز قرار دے دیا، وہ سمیٹ سمیٹ کر امیروں اور طاقتوروں کے پاس جارہا ہے، بیچارہ غریب آدمی پس رہا ہے اس لئے کہ وہ جو بھی چیز خریدنے جائے گا اس کے اندر ساری لاگتیں، ساری عیاشیاں شامل ہیں اور غریب آدمی ساری برداشت کرتا اور ادا کرتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں کتنی ناہمواریاں پھیلتی ہیں، اسی طرح قمار (جوا) جو نئی نئی شکلوں میں پھیل رہا ہے، یا سٹہ بازی ہو، اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کا بازار گرم ہے، اور اس

کے نتیجے میں پوری دنیا میں ایک طوفان برپا ہے۔

تو جب لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا تو انہوں نے سود، قمار اور سٹہ کے ذریعہ اپنی اجارہ داریاں (Monopolies) قائم کرلیں، اجارہ داری کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی خاص صنعت پر اس طرح قابض ہو گیا کہ لوگ مجبور ہو گئے ہوں کہ جب بھی اس صنعت کی چیز کو خریدیں تو اسی سے خریدیں اور رسد وطلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں بازار میں آزاد مسابقت (Free Competition) ہو، آزاد مقابلہ ہو، ایک شئے دس آدمیوں کے پاس مل رہی ہے، اگر ایک آدمی زیادہ پیسے وصول کرے گا تو لوگ اس کے پاس جانے کے بجائے دوسرے تاجر کے پاس چلے جائیں گے، لیکن جہاں لوگ مجبور ہو کر ایک ہی سے خریدیں تو وہاں رسد وطلب کی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں، کام نہیں کرتیں اور اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا جب لوگوں کو ہر قسم کے منافع کے حصول کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو انہوں نے اجارہ داریاں قائم کرلیں، اور ان اجارہ داریوں کے نتیجے میں بازار کی قوتیں مفلوج ہو گئیں اور چند لوگ سارے سرمایہ کی جھیل پر قابض ہو گئے، جو امیر ہے وہ امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور جو غریب ہے وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دنیا کا مہنگا ترین بازار

امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں ایک دنیا کا مہنگا گرین بازار کہلاتا، بیورلے ہلز کے علاقہ میں وہاں مجھے ہمارے کچھ ساتھی لے گئے ایک دوکان دکھائی اور کہا کہ یہ دنیا کی مہنگی ترین دوکانوں میں سے ہے، اس میں دیکھا کہ وہاں موزے ہیں، پہننے کی جرابیں ہیں، معلوم کیا قیمت کیا ہے؟ تو پتہ چلا کہ موزوں کی قیمت دوسو ڈالر ہے، دوسو ڈالر کا مطلب تقریباً بارہ ہزار روپے کے موزے۔ آگے سوٹ لٹکا ہوا تھا، پوچھا یہ کتنے کا ہے؟ معلوم ہوا کہ کوئی سوٹ دس ہزار ڈالر کا ہے کوئی پندرہ ہزار ڈالر کا ہے۔

اس کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ دوکان کا جو نیچے کا طبقہ ہے اس میں تو آپ گھوم پھر کر دیکھ لیں لیکن اوپر کے طبقہ میں اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک مالک آپ کے ساتھ نہ ہو۔

مالک کو ساتھ لے کر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ آپ کو مشورہ دے گا کہ آپ کے قد وقامت آپ کی جسامت اور آپ کے رنگ وروپ کے حساب سے فلاں سوٹ آپ کے لئے مناسب ہوگا۔ وہ مشورہ دیتا ہے اور اس مشورہ کے دس ہزار ڈالر دینا پڑتا ہے، صرف مشورہ دینے کے دس ہزار ڈالر

اور مشورہ لینے کے لئے بھی پہلے اس سے وقت (اپائنمنٹAppointment) لینا پڑتا ہے، اور اگر کوئی آدمی اپائنمنٹ لے لے تو چھ چھ مہینے کے بعد اپائنمنٹ ملتا ہے۔

برطانیہ کا شہزادہ چارلس جب امریکہ جانے والا تھا، اس نے جانے سے پہلے اپائنمنٹ لیا تو اس کو ایک مہینہ بعد کا اپائنمنٹ ملا کہ آپ ایک مہینہ بعد تشریف لائیں تو آپ کو مشورہ دیں گے، تو دس ہزار ڈالر تو صرف مشورہ کے ہیں باقی سوٹ کی قیمت اس کے علاوہ ہے یہ اس دوکان کا حال ہے۔

امیر ترین ملک میں دولت وغربت کا امتزاج

وہاں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ٹرالیاں لئے پھر رہے ہیں ان ٹرالیوں کے اندر کوکا کولا (Cocacola) سیون اپ (7-up) پیپسی کولا (Pepsi Cola) کے خالی ڈبے بھرے ہوئے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو پتہ چلا کہ یہ بیروزگار لوگ ہیں اور یہ ایسا کرتے ہیں کہ شہر میں جو "سلۃ الضوائع" ہوتی ہیں، یعنی کوڑا کرکٹ کی جو ٹوکریاں لگی ہوتی ہیں یہ ان میں سے ڈبے نکال کر علاقے کے کسی کباڑیے کے ہاں فروخت کرتے ہیں اور اسی پر گزارہ کرتے ہیں، ان کا کوئی گھر نہیں ہے، رات کو سڑک کے کنارے ٹرالی کھڑی کر کے اس کے نیچے سو جاتے ہیں۔ اور جب سردی کا موسم آتا ہے اس وقت ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ہوتی، اس واسطے زیر زمین چلنے والی ٹرین کے اسٹیشنوں پر راتیں گزارتے ہیں۔ تو ایک میل کے فاصلے پر دولت کی ریل پیل اور اس کے ضیاع کا یہ حال ہے اور دوسری طرف غربت کی انتہاء کا یہ حال ہے۔

یہی حال فرانس کے دارالحکومت پیرس کا ہے، وہ فرانس اس وقت تجارت وصنعت وٹیکنالوجی کے اعتبار سے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا ہے، اس ملک میں بھی ہزار ہا آدمیوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے، یہ خرابی درحقیقت اس طریقے سے ہوئی ہے کہ منافع کمانے کے لئے ایسا آزاد چھوڑا کہ جیسا مادر پدر آزاد چھوڑا جاتا ہے، اور اسی سے امیر وغریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوئیں۔ تقسیم دولت کا نظام ناہموار ہوا تو وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ تو یہ فلسفہ تو ٹھیک تھا کہ ذاتی منافع کے لئے لوگ کام کریں لیکن اس طرح بے مہار چھوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے اجارہ داریاں قائم کرلیں۔

معیشت کے اسلامی احکام

اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھیک ہے بازار کی قوتیں بھی درست، انفرادی ملکیت بھی درست،

ذاتی منافع کا محرک بھی درست، لیکن ان سب کو حرام وحلال کا پابند کئے بغیر معاشرہ میں انصاف قائم نہیں ہوسکتا۔ اسلام کا اصل امتیاز یہ ہے کہ اس نے حلال وحرام کی تفریق قائم کی کہ نفع کمانے کا یہ طریقہ حلال ہے اور یہ طریقہ حرام ہے۔

اسلامی نظام نے دو قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں:

خدائی پابندیاں

پہلی قسم کو میں خدائی پابندیوں کا نام دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں، حلال وحرام کی پابندیاں مثلاً سود حرام ہے، قمار حرام ہے، سٹہ حرام ہے، بیع قبل القبض حرام ہے اور اس کے علاوہ دیگر صورتیں جن کی تفصیلات ان شاء اللہ تعالیٰ بیوع کے اندر آئیں گی وہ حرام ہیں۔ یہ پابندیاں لگادیں اور اگر ان پابندیوں پر غور کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت یہ پابندیاں عائد فرمائی ہیں اور ایسے ایسے چور دروازوں پر پہرہ بٹھایا ہے جہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتیں شروع ہوتی ہیں اور اس سے فساد کے دروازے بند کردیئے، یہ خدائی پابندیاں ہیں۔

حکومتی پابندیاں

دوسری قسم کی پابندیاں وہ ہیں کہ بعض مرحلوں پر ایسا ہوتا ہے کہ جو خدائی پابندیاں عائد کی گئی ہیں بعض لوگوں نے ان کی پرواہ نہ کی ہو اور ان کے خلاف کام کیا ہو، یا معاشرہ میں کچھ غیر معمولی قسم کے حالات پیدا کئے جس کے نتیجے میں وہ پابندیاں کافی نہ ہوسکیں تو معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کچھ مباحات پر بھی پابندیاں عائد کردی جائیں تاکہ معاشرہ میں توازن برقرار رہے، یہ حکومتی پابندیاں ہیں۔

اصول فقہ کا ایک حکم امتناعی (سدِّ ذرائع)

اصول فقہ میں ''سدِ ذرائع'' کے نام سے ایک مستقل باب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کام فی نفسہٖ جائز ہو لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسدے کا سبب بن رہی ہو تو حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ جائز کام کو بھی وقتی مصلحت کے تابع ہو کر وقتی حکم کے طور پر ممنوع قرار دیدے۔ (۱)

اور اس قسم کی پابندیوں کے واجب التعمیل ہونے کا ماخذ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (۲)

”اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہو“

مثلاً عام حالات میں بازار میں اشیاء کا نرخ مقرر کرنے کے لئے رسد وطلب کی قوتوں کو کام میں لانا چاہئے لیکن جہاں کسی وجہ سے اجارہ داریاں قائم ہوگئی ہوں تو وہاں تسعیر (Control) کی بھی اجازت ہے۔ یعنی حکومت نرخ مقرر کرے اور یہ پابندی لگادے کہ فلاں چیز اس قیمت پر ملے گی، اس سے کم یا زیادہ پر نہیں۔

اس اصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کرسکتی ہے، اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ان پر مناسب پابندی عائد کرسکتی ہے۔

”کنزالعمال“ میں روایت منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بازار میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کوئی چیز اس کے معروف نرخ سے بہت کم داموں میں فروخت کررہا ہے، آپ نے اس سے فرمایا:

”اِمَّا اَنْ تَزِيْدَ فِي السِّعْرِ وَاِمَّا اَنْ تَرْفَعَ مِنْ سُوْقِنَا“(۳)

”یا تو دام میں اضافہ کرو، ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ“

روایت میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے اس پر پابندی لگائی، ہوسکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ وہ متوازن قیمت سے بہت کم قیمت لگا کر دوسرے تاجروں کے لئے جائز منافع کا راستہ بند کررہا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی کی وجہ یہ ہو کہ کم قیمت پر مہیا ہونے کی صورت میں لوگ اسے ضرورت سے زیادہ خرید رہے ہوں۔ جس سے اسراف کا دروازہ کھلتا ہو، یا لوگوں کے لئے ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نکلتی ہو۔ بہرصورت قابل غور بات یہ ہے کہ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ملکیت کی چیز جس دام پر چاہے فروخت کرسکتا ہے۔ لہٰذا کم قیمت پر بیچنا فی نفسہ جائز تھا، لیکن کسی اجتماعی مصلحت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی عائد کی۔ لہٰذا یہ وہ پابندیاں ہیں جو حکومت عائد کرسکتی ہے۔(۱)

ان دو پابندیوں کے دائرے میں رہتے ہوئے بازار میں جو مقابلہ ہوگا وہ آزاد مقابلہ ہوگا (Free Cometition) آزاد مقابلے کے نتیجے میں واقعۃً رسد وطلب کی قوتیں کام کریں گی اور

(۱) أعلام الموقعين(۲/۱٦۰)

(۲) النساء:۵۹

(۳) كنز العمال، باب الاحتكار(٤/٦٥)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، لابن أثير، رقم:٤٣٤(١/٤٣٧)، السنن الصغرى للبيهقي، رقم:٢١٠٨(٢/١٠٥)، معرفة السنن والآثار، رقم:٣٦٦٨(٩/٤٧٦)، مصنف عبد الرزاق، رقم:٤٩٠٥(٨/٢٠٧)

اس کے نتیجے میں درست فیصلے ہوں گے۔

تو سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی فلسفہ اگرچہ غلط نہیں تھا لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے دو بنیادی اصول مقرر کئے گئے۔

ایک یہ کہ ذاتی منافع کمانے کے لئے لوگوں کو بالکل آزاد چھوڑ دو، دوسرا یہ کہ حکومت کی عدم مداخلت (حکومت بالکل مداخلت نہ کرے) اگرچہ اب سرمایہ دارانہ نظام کے بیشتر مما لک میں حکومت کی عدم مداخلت والے اصول پر عمل نہیں ہے، ہر ملک نے کچھ نہ کچھ پابندیاں لگائی ہوئی ہیں، لیکن چونکہ وہ پابندیاں اپنے دماغ سے گھڑی ہوئی ہیں اس لئے ان کا وہ اثر نہیں ہے جو خدائی پابندیوں کا ہوتا ہے، یہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام سے ممتاز کرتا ہے۔

یہ تینوں نظاموں کے مابہ الامتیاز کا خلاصہ ہے، اگر یہ ذہن میں رہے تو کم از کم بنیادی اصول ذہن میں واضح رہیں گے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت نے ۷۴ سال میں دم توڑا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ نظام بذات خود غلط تھا یا خراب تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ پیش آئی کہ جو اصل نظام تھا اس پر عمل میں کوتاہی کی گئی جس کے نتیجے میں وہ تباہ ہوا۔ بعض لوگ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان ایک عرصہ تک دنیا میں حکمران رہے اور بعد میں ان پر زوال آیا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے معاذ اللہ کہ اسلام ناکام ہوگیا، تو یہ غلط ہے اس لئے کہ حقیقت میں اسلام ناکام نہیں ہوا بلکہ اسلام کی تعلیمات کو چھوڑنے پر زوال آیا، تو اشتراکیت والے بھی یہ کہتے ہیں کہ جو اصل نظام تھا اس کو چھوڑنے کے نتیجے میں یہ زوال آیا ورنہ فی نفسہ وہ نظام غلط نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات آیا کہ یہ زوال اصل نظام کو چھوڑنے سے آیا یا اصل نظام کو اختیار کرنے کے باوجود آیا، اس کا فیصلہ بڑا آسان ہے۔

اشتراکیت ایک معاشی نظام ہے، سوال یہ ہے کہ اشتراکیت کے جو بنیادی اصول تھے ان کو کس مرحلہ پر اور کہاں چھوڑا گیا تھا؟ اشتراکیت کے دو اصول قومی ملکیت اور منصوبہ بندی یہ کسی دور میں نہیں چھوٹے، چاہے وہ لینن کا دور ہو، اسٹالن کا دور ہو یا گوربا چوف کا دور ہو۔ یہ دو اصول ہر جگہ برقرار رہے ہیں کہ ساری پیداوار قومی ملکیت میں اور معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کے ذریعہ طے ہوں۔

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: تکملة فتح الملهم (۱/ ۳۱۰ تا ۳۱۲)

اب زوال جو آیا وہ اس بناء پر کہ اس کے نتیجے میں جو ملکی پیداوار گھٹی، پیداوار گھٹنے کے نتیجے میں لوگوں کے اندر بے روزگاری پھیلی اور لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

گوربا چوف جو سویت یونین کا آخری سربراہ تھا، اس نے تعمیر نو کے نام سے ایک تحریک چلائی اس کی کتاب بھی چھپی ہوئی ہے، اس نے تھوڑی سی یہ کوشش کی کہ قوم تباہ ہو رہی ہے اور اس تباہی سے بچنے کے لئے تھوڑی سی لچک دکھانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو تھوڑا سا تجارت کی طرف لایا جائے تاکہ معاشی سرگرمیوں میں دوبارہ جان پیدا ہو، لیکن اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اس کو بروئے کار لاتا، اگر اصولوں سے انحراف ہوتا تو وہ گورباچوف کے زمانے میں ہوتا کہ جب اس کا اس طرف میلان ہوتا تھا کہ ہم بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائیں، لیکن ابھی وہ یہ نہیں کر سکا تھا کہ خود لوگوں نے ہی بغاوت کر دی یہاں تک کہ قصہ ہی ختم ہو گیا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اصل اصولوں کو چھوڑنے کی وجہ سے زوال آیا یہ اس وجہ سے درست نہیں کہ جو بنیادی اصول تھے ان پر وہ اول سے آخر تک کاربند رہے اور انہی کے نتیجے میں جو دیکھا وہ دیکھا۔

رہی یہ بات کہ وہ استبداد کا نظام تھا اور ہم نے جمہوریت لانے کی کوشش کی، ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ بھی جمہوریت کا تابعدار تھا، وہ بھی جمہوریت چاہتا تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ جمہوریت یعنی مزدوروں کی قائم کردہ جمہوریت لینن کے دور میں بھی تھی، اسٹالن کے دور میں بھی تھی اور گورباچوف کے دور میں بھی تھی، کسی کے دور میں بھی سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، لینن کے دور میں بھی ایک جماعتی نظام تھا جو آخر تک رہا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ ہم اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے نتیجے میں زوال کا شکار ہوئے ہیں یہ غلط ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اصولوں کو اپناتے رہے اور اسی کے نتیجے میں زوال آیا۔

مخلوط معیشت کا نظام (Mixed Economy)

بعض ممالک میں ایک تصور پیدا ہوا ہے جس کا نام مخلوط معیشت ہے، جس میں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی بازار کی قوتوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں کچھ منصوبہ بندی بھی شامل کی گئی، مثلاً کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قومی ملکیت میں ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آزاد ملکیت میں ہیں۔ جو قومی ملکیت میں ہوتی ہیں ان کو پبلک سیکٹر (Public Sector) کہتے ہیں، مثلاً پانی، بجلی، ٹیلیفون اور ائیر لائنز وغیرہ، ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہے کہ یہ سب قومی ملکیت ہیں بعض ذاتی ملکیت (Private Sector)، تو بہت سے ملکوں میں مخلوط معیشت کا نظام چل رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا جو بنیادی اصول تھا یعنی عدم مداخلت، اس پر تو اب شاید کوئی بھی سرمایہ دارانہ ملک قائم نہیں رہا، ہر ایک نے کچھ نہ کچھ مداخلت کی ہے، کسی نے کم کسی نے زیادہ، اسی کو مخلوط معیشت (Mixed Economy) کہا جاتا ہے، اور وہ مداخلت اپنی عقل کی بنیاد پر ہے، وہ مداخلت کیا ہے؟ کہ پارلیمنٹ (Parlement) جو پابندی عائد کرے وہ عائد کی جائے گی، یعنی پارلیمنٹ کی اکثریت جس کے حق میں ووٹ دیدے وہ پابندی عائد کردی جائے گی، اور پارلیمنٹ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو خود سرمایہ دار ہیں۔ لہٰذا وہ پابندیاں عائد تو ضرور کرتے ہیں لیکن وہ پابندیاں متعصبانہ ہوتی ہیں اور کوئی غیر جانبدار نہ پابندی عائد نہیں ہوتی، اور اس کے نتیجے میں جو خرابیاں اور ناہمواریاں ہوتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں۔ کسی خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا گیا جو انسانی سوچ سے ماوراء ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے اور اس کے تحت پابندی عائد کی گئی ان میں سے خرابیاں زائل نہیں کیں۔

اگر خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا تو اس وقت تک افراط وتفریط میں مبتلا رہیں گے، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے اس کے تحت کاروبار کو چلایا جائے۔ (۱)

یہ مختصر سا خلاصہ ہے جس میں تینوں نظاموں کا فرق بتایا گیا ہے اور آجکل کی معاشیات کے متعلق کتابیں لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور ان سے خلاصہ نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن ہزارہا صفحات کی ورق گردانی کے نتیجے میں جو خلاصہ اور مغز حاصل ہوتا ہے وہ میں نے آپ کو ان تقریروں میں عرض کردیا ہے، جس سے کم از کم کچھ تھوڑے سے بنیادی معالم تینوں نظاموں کے سمجھ میں آجائیں، باقی تفصیل مختلف ابواب واحادیث کے ماتحت آجائے گی، اپنے اپنے مقام پر بیان ہوگا۔ اس کے اندر اور زیادہ وضاحت وتفصیل کے ساتھ ذکر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: تکملة فتح الملهم (۱/ ۳۱۰ تا ۳۱۳)

سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾(۱)

میرے محترم بھائیو اور بہنو! آج کی اس نشست کے لئے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے وہ ''ربا'' سے متعلق ہے۔ جس کو اردو میں ''سود'' اور انگریزی میں Usury یا Interest کہا جاتا ہے، اور غالباً اس موضوع کو اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یوں تو ساری دنیا میں اس وقت سود کا نظام چلا ہوا ہے۔ لیکن بالخصوص مغربی دنیا میں جہاں آپ حضرات قیام پذیر ہیں وہاں بیشتر معاشی سرگرمیاں سود کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو قدم قدم پر یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کس طرح معاملات کریں اور سود سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ اور آج کل مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی لوگوں کے درمیان پھیلائی جارہی ہیں، کہ آج کل معاشی زندگی میں جو Intersest چل رہا ہے وہ در حقیقت حرام نہیں ہے اس لئے کہ یہ اس ''ربا'' کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس وقت یہ موضوع دیا گیا ہے کہ میں Interset کے موضوع پر جو بنیادی معلومات ہیں وہ قرآن وسنت اور موجودہ حالات کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

سودی معاملہ کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ''سود'' کو قرآن کریم نے اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ شاید کسی اور گناہ کو اتنا بڑا گناہ قرار نہیں دیا۔ مثلاً شراب نوشی، خنزیر کھانا، زنا کاری، بدکاری وغیرہ کے لئے قرآن کریم میں وہ الفاظ استعمال نہیں کئے گئے جو ''سود'' کے لئے استعمال کئے گئے ہیں

☆ اصلاحی خطبات (۷/۱۴۷ تا ۱۷۰) ۲۴ اپریل ۱۹۹۲ء، جامع مسجد اور لینڈو، فلوریڈا، امریکہ

(۱) البقرة: ۲۷۶

چنانچہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾(۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ''سود'' کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو اگر تمہارے اندر ایمان ہے، اگر تم ''سود'' کو نہیں چھوڑو گے، یعنی سود کے معاملات کرتے رہو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو''

یعنی ان کے لئے اللہ کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہے، یہ اعلان جنگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی گناہ پر نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ شراب پیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے خلاف اعلان جنگ ہے یا جو خنزیر کھاتے ہیں ان کے خلاف اعلان جنگ ہے، اور نہ یہ کہا گیا کہ جو ''زنا'' کرتے ہیں ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ لیکن ''سود'' کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ سود کے معاملات کو نہیں چھوڑتے ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے اتنی سخت اور سنگین وعید اس پر وارد ہوئی ہے اب سوال یہ ہے کہ اس پر اتنی سنگین اور سخت وعید کیوں ہے؟ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گی۔

سود کس کو کہتے ہیں؟

لیکن اس سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ''سود'' کس کو کہتے ہیں؟ ''سود'' کیا چیز ہے اس کی تعریف کیا ہے؟ جس وقت قرآن کریم نے ''سود'' کو حرام قرار دیا اس وقت اہل عرب میں ''سود'' کا لین دین متعارف اور مشہور تھا۔ اور اس وقت ''سود'' اسے کہا جاتا تھا کہ کسی شخص کو دیئے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جائے اسے ''سود'' کہا جاتا تھا۔ مثلاً میں نے آج ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیئے۔ اور میں اس سے کہوں کہ میں ایک مہینے کے بعد یہ رقم واپس لوں گا اور تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرنا اور یہ پہلے سے میں نے طے کر دیا کہ ایک ماہ بعد ایک سو دو روپے واپس لوں گا۔ تو یہ ''سود'' ہے۔

معاہدہ کے بغیر زیادہ دینا سود نہیں

پہلے سے طے کرنے کی شرط اس لئے لگائی کہ اگر پہلے سے کچھ طے نہیں کیا ہے، مثلاً میں نے

(۱) البقرة:۲۷۶

کسی کو سو روپے قرض دے دیئے۔ اور میں نے اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرو گے۔ لیکن واپسی کے وقت اس نے اپنی خوشی سے مجھے ایک سو دو روپے دے دیئے۔ اور ہمارے درمیان یہ ایک سو دو روپے واپس کرنے کی بات طے شدہ نہیں تھی، تو یہ سود نہیں ہے اور حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے تو وہ قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ وہ قرض کچھ زیادتی کے ساتھ بڑھتا ہوا واپس فرماتے، تاکہ اس کی دلجوئی ہو جائے، لیکن یہ زیادتی چونکہ پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی اس لئے وہ ''سود'' نہیں ہوتی تھی، اور حدیث کی اصطلاح میں اس کو ''حسن القضاء'' کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا، اور ادائیگی کے وقت اچھا معاملہ کرنا، اور کچھ زیادہ دے دینا یہ ''سود'' نہیں ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

((اِنَّ خَیَارَکُمْ اَحْسَنُکُمْ قَضَاءً))(۱)

یعنی تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں، لیکن اگر کوئی شخص قرض دیتے وقت یہ طے کرلے کہ میں جب واپس لوں گا تو زیادتی کے ساتھ لوں گا، اس کو ''سود'' کہتے ہیں۔ اور قرآن کریم نے اسی کو سخت اور سنگین الفاظ کے ساتھ حرام قرار دیا، اور سورہ بقرہ کے تقریباً پورے دو رکوع اس ''سود'' کی حرمت پر نازل ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے کس ''سود'' کو حرام قرار دیا؟

بعض اوقات ہمارے معاشرے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس ''سود'' کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا، وہ درحقیقت یہ تھا کہ اس زمانے میں قرض لینے والا غریب ہوتا تھا، اور اس کے پاس روٹی اور کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے اگر وہ بیمار ہے تو اس کے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے، اگر گھر میں کوئی میت ہوگئی ہے تو اس کے پاس اس کو کفنانے اور دفنانے کے پیسے نہیں ہوتے

(۱) صحیح البخاری، کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب حسن القضاء، رقم: ۲۲۱۸، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب استسلاف الحیوان واستقراضیہ، رقم: ۴۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ۸۷۴۳

تھے، ایسے موقع پر وہ غریب بیچارہ کسی سے پیسے مانگتا تو وہ قرض دینے والا اس سے کہتا کہ میں اس وقت تک قرض نہیں دوں گا جب تک تم مجھے اتنا فیصد زیادہ واپس نہیں دو گے، تو چونکہ یہ ایک انسانیت کے خلاف بات تھی کہ ایک شخص کو ایک ذاتی ضرورت ہے اور وہ بھوکا اور ننگا ہے ایسی حالت میں اس کو سود کے بغیر پیسے فراہم نہ کرنا ظلم اور زیادتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا، اور سود لینے والے خلاف اعلان جنگ کیا۔

لیکن ہمارے دور میں اور خاص طور پر بینکوں میں جو سود کے ساتھ روپے کا لین دین ہوتا ہے اس میں قرض لینے والا کوئی غریب اور فقیر نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات وہ بڑا دولت مند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور وہ قرض اس لئے نہیں لیتا کہ اس کے پاس کھانے کو نہیں ہے، یا اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑا نہیں ہے، یا وہ کسی بیمارے کے علاج کے لئے قرض نہیں لے رہا ہے، بلکہ وہ اس لئے قرض لے رہا ہے تا کہ ان پیسوں کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگائے اور اس سے نفع کمائے۔ اب اگر قرض دینے والا شخص یہ کہے کہ تم میرے پیسے اپنے کاروبار میں لگاؤ گے اور نفع کماؤ گے تو اس نفع کا دس فیصد بطور نفع کے مجھے دو۔ تو اس میں کیا قباحت اور برائی ہے؟ اور یہ وہ "سود" نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، یہ اعتراض دنیا کے مختلف خطوں میں اٹھایا جاتا ہے۔

تجارتی قرض (Commercial Loan) ابتدائی زمانے میں بھی تھے

ایک اعتراض یہ اٹھایا ہے کہ یہ کاروباری سود (Commercial Interset) اور یہ تجارتی قرض (Commerical Loan) حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں نہیں تھے، بلکہ اس زمانے میں ذاتی اخراجات اور ذاتی استعمال کے لئے قرضے لئے جاتے تھے، لہٰذا قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جس کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جس "سود" کو حرام قرار دیا ہے وہ غریبوں اور فقیروں والا "سود" تھا، اور یہ کاروباری سود حرام نہیں ہے۔

صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی چیز کے حرام ہونے کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خاص صورت میں حضور ﷺ کے زمانے میں بھی پائی جائے اور حضور ﷺ کے زمانے میں اس انداز سے اس کا وجود بھی ہو۔ قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت اس کے

سامنے ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ حرام قرار دیتا ہے، چاہے اس کی کوئی خاص صورت حضور ﷺ کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اور شراب کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا مشروب جس میں نشہ ہو اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ صاحب! آجکل کی یہ وہسکی (Whisky) بیئر (Beer) اور برانڈی (Brandy) حضور ﷺ کے زمانے میں تو پائی نہیں جاتی تھی، لہٰذا یہ حرام نہیں ہے۔ تو یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں اگرچہ یہ اس خاص شکل میں موجود نہیں تھی، لیکن اس کی حقیقت یعنی ''ایسا مشروب جو نشہ آور ہو'' موجود تھی اور آنحضرت ﷺ نے اس کو حرار قرار دے دیا تھا، لہٰذا اب وہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی، اب چاہے شراب کی نئی شکل آجائے، اور اس کا نام چاہے وہسکی (Whisky) رکھ دیا جائے یا برانڈی رکھ لو یا بیئر رکھ لو یا کوک (Coke) رکھ لو، نشہ آور مشروب ہر شکل اور ہر نام کے ساتھ حرام ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ ''کمرشل لون'' چونکہ اس زمانے میں نہیں تھے بلکہ آج پیدا ہوئے ہیں اس لئے حرام نہیں ہیں، یہ خیال درست نہیں۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ یاد آیا ہندوستان کے اندر ایک گویّا (گانے والا) تھا، وہ ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا، حج کے بعد وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جا رہا تھا کہ راستے میں ایک منزل پر اس نے قیام کیا اس زمانے میں مختلف منزلیں ہوتی تھیں، لوگ ان منزلوں پر رات گزارتے اور اگلے دن صبح آگے کا سفر کرتے، اس لئے گویے نے راستے میں ایک منزل پر رات گزارنے کے لئے قیام کیا اور اس منزل پر ایک عرب گویا بھی آ گیا، اور اس نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کر دیا، عرب گویے کی آواز بھدی اور خراب تھی، کریہہ الصوت تھا، اب ہندوستانی گویے کو اس کی آواز بہت بری لگی، اور اس نے اٹھ کر کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور ﷺ نے گانا بجانا کیوں حرار قرار دیا تھا اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان بدوؤں کا گانا سنا تھا اس لئے حرام قرار دے دیا اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو آپ ﷺ گانا بجانا حرام قرار نہ دیتے۔

آج کل کا مزاج

آجکل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! حضور ﷺ

کے زمانے میں یہ عمل اس طرح ہوتا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس کو حرام قرار دے دیا۔ آج چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہو رہا ہے لہٰذا وہ حرام نہیں ہے کہنے والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ خنزیر وں کو اس لئے حرام قرار دیا گیا تھا کہ وہ گندے ماحول میں پڑے رہتے تھے غلاظت کھاتے تھے گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی اب تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور ان کے لئے اعلیٰ درجے کے فارم قائم کر دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اب ان کو حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

شریعت کا ایک اصول

یاد رکھئے! قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے اس کی صورتیں چاہے کتنی بدل جائیں اور اس کو بنانے اور تیار کرنے کے طریقے چاہے کتنے بدلتے رہیں، لیکن اس کی حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، اور وہ حقیقت حرام ہوتی ہے یہ شریعت کا اصول ہے۔

زمانہ نبوت کے بارے میں ایک غلط فہمی

پھر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں تجارتی قرضوں (Commercial Loan) کا رواج نہیں تھا۔ اور سارے قرضے صرف ذاتی ضرورت کے لئے لئے جاتے تھے اس موضوع پر میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے ''مسئلہ سود'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس کا دوسرا حصہ میں نے لکھا ہے۔ اس حصہ میں میں نے کچھ مثالیں پیش کی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ کے زمانے میں بھی تجارتی قرضوں کا لین دین ہوتا تھا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ عرب صحرا نشین تھے تو اس کے ساتھ ہی لوگوں کے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں حضور ﷺ تشریف لائے تھے، وہ ایسا سادہ اور معمولی معاشرہ ہوگا جس میں تجارت وغیرہ تو ہوتی نہیں ہوگی اور اگر تجارت ہوتی بھی ہوگی تو صرف گندم اور جَو وغیرہ کی ہوتی ہوگی، اور وہ بھی دس بیس روپے سے زیادہ کی نہیں ہوگی اس کے علاوہ کوئی بڑی تجارت نہیں ہوتی ہوگی عام طور پر ذہن میں یہ تصور بیٹھا ہوا ہے۔

ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی ہوتا تھا

لیکن یاد رکھئے یہ بات درست نہیں عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور ﷺ تشریف لائے

اس میں بھی آج کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں، مثلاً آج کل ''جائنٹ اسٹاک کمپنیاں'' ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے اس سے پہلے ''جائنٹ اسٹاک کمپنی'' کا تصور نہیں تھا، لیکن جب ہم عرب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہوتا تھا اس لئے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلہ کے تمام آدمی ایک روپیہ دو روپیہ لاکر ایک جگہ جمع کرتے اور وہ رقم ''شام'' بھیج کر وہاں سے سامان تجارت منگواتے آپ نے تجارتی قافلوں (Commercial Caravan) کا نام سنا ہوگا۔ وہ ''کاروان'' یہی ہوتے تھے کہ سارے قبیلے نے ایک ایک روپیہ جمع کر کے دوسری جگہ بھیجا اور وہاں سے سامان تجارت منگوا کر یہاں فروخت کر دیا چنانچہ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا:

﴿لِاِيْلَافِ قُرَيْشٍ o اِيْلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ o﴾(۱)

وہ بھی اسی بناء پر کہ یہ عرب کے لوگ سردیوں میں یمن کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں اور سردیوں کے یہ سفر محض تجارت کے لئے ہوتے تھے یہاں سے سامان لے جا کر وہاں اور وہاں سے سامان لاکر یہاں بیچ دیتے، اور بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لئے قرض لیتا تھا کہ اس کے گھر میں کھانے کو نہیں تھا؟ یا اس کے پاس میت کو کفن دینے کے لئے کپڑا نہیں تھا؟ ظاہر ہے کہ جب وہ اتنا بڑا قرض لیتا تھا تو وہ کسی کمرشل مقصد کے لئے لیتا تھا۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

جب حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

((وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَاِنَّهٗ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ))(۲)

''یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا''

(۱) القریش: ۱۔۲

(۲) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی، رقم: ۱۲۳۷، سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبی رقم: ۱۶۲۸، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب الخطبة یوم النحر، رقم: ۳۰۴۶، سنن الدارمی کتاب المناسك، باب فی سنة الحج، رقم: ۱۷۷٤

چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، اس لئے آپ نے فرمایا کہ آج کے دن میں ان کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہیں وہ ختم کرتا ہوں اور روایات میں آتا ہے کہ وہ دس ہزار مثقال سونا تھا، اور تقریباً 4 ماشے کا ایک مثقال ہوتا ہے، اور یہ دس ہزار مثقال کوئی سرمایہ (Principal) نہیں تھا۔ بلکہ یہ سود تھا جو لوگوں کے ذمے اصل رقوم پر واجب ہوا تھا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار سود لگ گیا ہو، کیا وہ قرض صرف کھانے کی ضرورت کے لئے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کے لئے لیا گیا ہوگا۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینکاری کی ایک مثال

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آجکل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لاکر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقوم بطور قرض لیتا ہوں یہ رقم میرے ذمے قرض ہے، اور پھر آپ اس رقم کو تجارت میں لگاتے، چنانچہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا، اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فَحَسِبْتُ مَا عَلَيْهِ مِنَ الدَّيْنِ فَوَجَدْتُهُ أَلْفَيْ أَلْفٍ وَمِائَتَيْ أَلْفٍ"(۱)

"یعنی میں نے ان کے ذمہ واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے"

لہٰذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تجارتی قرض نہیں ہوتے تھے، یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تجارتی قرض بھی ہوتے تھے، اور اس پر "سود" کا لین دین بھی ہوتا تھا، اور قرآن کریم نے ہر قرض پر جو بھی زیادتی وصول کی جائے اس کو حرام قرار دیا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ کمرشل لون پر انٹرسٹ لینا جائز ہے اور ذاتی قرضوں پر انٹرسٹ لینا جائز نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔

سود مرکب اور سود مفرد دونوں حرام ہیں

اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی پھیلائی جارہی ہے، وہ یہ کہ ایک سود مفرد (Simple

(۱) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، باب برکة الغازی فی ماله حیا ومیتا مع النبی وولاة الأمر، رقم: ۲۸۹۷، شرح ابن بطال، رقم: ۳۱۲۹ (۳۶۳/۹)، حلیة الأولیاء (۹۱/۱)، السنن الکبریٰ للبیهقی (۲۸٦/٦)، الطبقات لابن سعد (۱۹/۳)

Interest) ہوتا ہے اور ایک سود مرکب (Compound Interset) ہوتا ہے، یعنی سود پر بھی سود لگتا چلا جائے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مرکب سود ہوتا تھا اور قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے لہٰذا وہ تو حرام ہے، لیکن سود مفرد جائز ہے، اس لئے کہ وہ اس زمانے میں نہیں تھا اور نہ ہی قرآن نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ابھی قرآن کریم کی جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اس میں فرمایا:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰا﴾(۱)

''یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ربا کو جو حصہ بھی رہ گیا ہو، اس کو چھوڑ دو''

یعنی اس کے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں یا Rate of Interest کے کم یا زیادہ ہونے کی بحث نہیں جو کچھ بھی ہو اس کو چھوڑ دو۔ اور اس کے بعد آگے فرمایا:

﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوْسُ أَمْوَالِكُمْ﴾(۲)

یعنی اگر تم ربا سے توبہ کر لو تو پھر تمہارا جو راس المال (Principal) ہے وہ تمہارا حق ہے اور خود قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا کہ Principal تو تمہارا حق ہے لیکن اس کے علاوہ تھوڑی سی زیادتی بھی ناجائز ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود مرکب حرام ہے اور سود مفرد حرام نہیں، بلکہ سود کم ہو یا زیادہ سب حرام ہے اور قرض لینے والا غریب ہو تب بھی حرام ہے اور قرض لینے والا امیر اور مالدار ہو تب بھی حرام ہے، اگر کوئی شخص ذاتی ضرورت کے لئے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اور اگر تجارت کے لئے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

موجودہ بینکنگ انٹرسٹ بالاتفاق حرام ہے

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ تقریباً 60,50 سال تک عالم اسلام میں بینکنگ انٹرسٹ (Banking Interest) کے بارے میں سوالات اٹھائے جاتے رہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ Compound Interest حرام ہے۔ Simple Interest نہیں ہے یا یہ کہنا کہ Commercial Loan حرام نہیں ہے وغیرہ۔ یہ اشکالات اور اعتراضات عالم اسلام میں تقریباً 50 سال تک ہوتے رہے ہیں لیکن اب یہ بحث ختم ہوگئی ہے، اب ساری دنیا کے نہ صرف علماء بلکہ ماہرین معاشیات اور مسلم بینکرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے، جس طرح عام قرض کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے اور اب اس پر اجماع ہو چکا ہے کسی

(۱) البقرة:۲۷۸ (۲) البقرة:۲۷۹

قابل ذکر شخص کا اس میں اختلاف نہیں اس کے بارے میں آخری فیصلہ آج سے تقریباً 4 سال پہلے جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی (Islamic Fiqh Academy) جس میں تقریباً 45 مسلم ملکوں کے سرکردہ علماء کا اجتماع ہوا، اور جس میں، میں بھی شامل تھا۔ اور ان تمام ملکوں کے تقریباً 200 علماء نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے، اور اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں لہٰذا یہ مسئلہ تو اب ختم ہو چکا ہے کہ حرام ہے یا نہیں؟

کمرشل لون پر انٹرسٹ میں کیا خرابی ہے؟

اب ایک بات باقی رہ گئی ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ کہ شروع میں جیسا کہ عرض کیا تھا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں صرف ذاتی ضرورت کے لئے قرضے لئے جاتے تھے، اب اگر ایک شخص ذاتی ضرورت کے لئے قرض لے رہا ہے مثلاً اس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے یا میت کو دفنانے کے لئے کفن نہیں ہے اس کے لئے وہ قرض لے رہا ہے اور آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں یہ تو ایک غیر انسانی حرکت اور ناانصافی کی بات ہے، لیکن جو شخص میرے پیسے کو تجارت میں لگا کر نفع کمائے گا اگر میں نفع میں اس سے تھوڑا حصہ لے لوں گا تو اس میں کیا خرابی ہے؟

آپ کو نقصان کا خطرہ (Risk) بھی برداشت کرنا ہوگا

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اللہ کے کسی حکم میں چوں چراں کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے، اگر کسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا، وہ حرام ہو گئی لیکن زیادہ اطمینان کے لئے یہ بات عرض کرتا ہوں تاکہ یہ بات اچھی طرح دل میں اتر جائے وہ یہ کہ اگر آپ کسی شخص کو قرض دے رہے ہیں تو اس کے بارے میں اسلام یہ کہتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات متعین کر لو، کیا تم اس کی کچھ امداد کرنا چاہتے ہو؟ یا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو؟ اگر قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتے ہو تو وہ پھر آپ کی طرف سے صرف امداد ہی ہوگی۔ پھر آپ کو اس قرض پر زیادتی کے مطالبے کا کوئی حق نہیں، اور اگر اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر جس طرح نفع میں حصہ دار بنو گے اسی طرح نقصان میں بھی اس کے حصہ دار بننا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم صرف نفع میں حصہ دار بن جاؤ، نفع ہو تو تمہارا، اور اگر نقصان ہو تو وہ اس کا، لہٰذا جس صورت میں آپ اس کو کاروبار کے لئے پیسے دے رہے ہیں تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ کاروبار میں نقصان کا خطرہ (Risk) تو وہ برداشت کرے اور نفع آپ کو مل جائے بلکہ اس صورت میں آپ اس کو قرض نہ دیں بلکہ اس کے ساتھ ایک جوئنٹ

انٹر پرائز (Joint Enterprise) کیجئے۔ یعنی اس سے معاہدہ کریں کہ جس کاروبار کے لئے تم قرض لے رہے ہو، اس میں اتنا فیصد نفع میرا ہوگا، اور اتنا تمہارا ہوگا۔ اگر اس کاروبار میں نقصان ہوگا تو وہ نقصان بھی اسی نفع کے تناسب سے ہوگا لیکن یہ بالکل درست نہیں ہے کہ آپ تو اس سے یہ کہیں کہ اس قرض پر 15 فیصد نفع آپ سے لوں گا۔ چاہے تمہیں کاروبار میں نفع ہو، یا نقصان ہو، یہ بالکل حرام ہے اور سود ہے۔

آج کل کے انٹرسٹ کے نظام کی خرابی

آج کل انٹرسٹ (Interest) کا جو نظام رائج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات قرض لینے والے کو نقصان ہو گیا، تو اس صورت میں قرض دینے والا فائدہ میں رہا، اور قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والے نے زیادہ شرح سے نفع کمایا اور قرض دینے والے کو اس نے معمولی شرح سے نفع دیا۔ اب قرض دینے والا نقصان میں رہا۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔

ڈیپازیٹر ہر حال میں نقصان میں ہے

مثلاً ایک شخص ایک کروڑ روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت شروع کرتا ہے، اب وہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے اس کے پاس آیا؟ وہ ایک کروڑ روپیہ کس کا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ روپیہ اس نے بینک سے لیا۔ اور بینک کے پاس وہ روپیہ ڈیپازیٹرس کا ہے۔ گویا کہ وہ ایک کروڑ روپیہ پوری قوم کا ہے۔ اور اب اس نے قوم کے اس ایک کروڑ روپے سے تجارت شروع کی اور اس تجارت کے اندر اس کو سو فیصد نفع ہوا، اور اب اس کے پاس دو کروڑ ہو گئے، جس میں سے 15 فیصد یعنی 15 لاکھ روپے اس نے بینک کو دیئے۔ اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا کمیشن اور اپنے اخراجات نکال کر باقی 7 فیصد یا دس فیصد کھاتہ دار (Depoditors) کو دے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کا پیسہ تجارت میں لگا تھا، جس سے اتنا نفع ہوا ان کو تو سو روپے پر صرف دس روپے نفع ملا، اور یہ بیچارہ ڈیپازیٹر بڑا خوش ہے کہ میرے سو روپے اب ایک سو دس ہو گئے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ حقیقت میں اس کے پیسوں سے جو نفع کمایا گیا اس کے لحاظ سے ایک سو کے دو سو ہونے چاہئے تھے، اور پھر دوسری طرف یہ دس روپے جو نفع اس کو ملا، قرض لینے والا اس کو دوبارہ اس سے واپس وصول کر لیتا ہے، وہ کس طرح واپس وصول کرتا ہے؟

سود کی رقم مصارف میں شامل ہوتی ہے

وہ اس طرح وصول کرتا ہے کہ قرض لینے والا ان دس روپوں کو پیداواری اخراجات اور مصارف (Cost of Production) میں شامل کر لیتا ہے، مثلاً فرض کرو کہ اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر کوئی فیکٹری لگائی، یا کوئی چیز تیار کی تو تیاری کے مصارف (Cost) میں 15 فیصد بھی شامل کر دیئے جو اس نے بینک کو ادا کئے۔ لہٰذا جب وہ پندرہ فیصد بھی شامل ہو گئے تو اب وہ چیز تیار (Producer) ہوگی، اس کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ جائے گی۔ مثلاً اس نے کپڑا تیار کیا تھا، تو اب انٹرسٹ کی وجہ سے اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ گئی، لہٰذا ڈیپازیٹر جس کو ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے، جب بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد زیادہ دینی ہوگی۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فیصد منافع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ کر کے پندرہ فیصد وصول کر لیا گیا۔ یہ تو خوب نفع کا سودا ہوا، وہ ڈیپازیٹر خوش ہے کہ مجھے سو روپے کے ایک سو دس روپے مل گئے۔ لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اس کو سو روپے کے بدلے 95 روپے ملے۔ اس لئے کہ وہ پندرہ فیصد کپڑے کی کوسٹ میں چلے گئے اور دوسری طرف 85 فیصد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلے گئے۔

شرکت کا فائدہ

اور اگر شرکت پر معاملہ ہوتا، اور یہ طے پاتا کہ مثلاً 50 فیصد نفع سرمایہ لگانے والے (Financier) کا ہوگا۔ اور 50 فیصد کام کرنے والے تاجر کا ہوگا۔ تو اس صورت میں عوام کو 15 فیصد کے بجائے 50 فیصد نفع ملتا اور اس صورت میں یہ 50 فیصد اس چیز کی لاگت (Cost) میں بھی شامل نہ ہوتا اس لئے کہ نفع تو اس پیداوار کی فروخت کے بعد سامنے آئے گا، اور پھر اس کو تقسیم کیا جائے گا۔ اس لئے کہ سود (Interest) تو لاگت (Cost) میں شامل کیا جاتا ہے، لیکن نفع (Profit) لاگت (Cost) میں شامل نہیں کیا جاتا، تو یہ صورت اجتماعی نفع کی تھی۔

نفع کسی کا اور نقصان کسی اور کا

اور اگر فرض کرو کہ ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر جو تجارت کی اس تجارت میں اس کو نقصان ہو گیا وہ بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہو گیا، اب اس بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے

میں کس کا روپیہ گیا؟ ظاہر ہے کہ عوام کا گیا۔ تو اس نظام میں نقصان ہونے کی صورت میں سارا نقصان عوام پر ہے۔ اور اگر نفع ہے تو سارا کا سارا قرض لینے والے کا۔

بیمہ کمپنی سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے

قرض لینے والے تاجر کا اگر نقصان ہو جائے تو اس نے اس نقصان کی تلافی کے لئے ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے، وہ ہے انشورنس (Insurance) مثلاً فرض کرو کہ روئی کے گودام میں آگ لگ گئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کا فریضہ انشورنس کمپنی پر عائد ہوتا ہے اور انشورنس کمپنی میں کس کا پیسہ ہے؟ وہ غریب عوام کا پیسہ ہے اس عوام کا پیسہ ہے جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک اس کو انشورڈ (Insured) نہ کرالیں۔ اور عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا، اس کو آگ نہیں لگتی لیکن وہ بیمہ کی قسطیں (Premium) ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

ان غریب عوام کے بیمہ کی قسطوں سے انشورنس کمپنی کی عمارت تعمیر کی گئی، اور غریب عوام کے ڈیپازیٹ کے ذریعہ تاجر کے نقصان کی تلافی کرتے ہیں، لہٰذا یہ سارا گورکھ دھندا اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار تاجر کا ہو، اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اس کے نتیجے میں یہ صورت حال ہو رہی ہے، بینک میں جو پوری قوم کا روپیہ ہے اگر اس کو صحیح طریقے پر استعمال کیا جاتا تو اس کے تمام منافع بھی عوام کو حاصل ہوتے۔ اور اب موجودہ نظام میں تقسیم دولت (Distribition of Wealth) کا جو سسٹم ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ سود کھانا ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کاری کرنا (۱)۔ اتنا سنگین گناہ اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے پوری قوم کو تباہی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

سود کی عالمی تباہ کاری

آج سے پہلے ہم ''سود'' کو صرف اس لئے حرام مانتے تھے کہ قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے، ہمیں اس کے عقلی دلائل سے زیادہ بحث نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب حرام قرار دے دیا ہے، بس حرام ہے۔ لیکن آج اس کے نتائج کا آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، آج پوری دنیا میں انٹرسٹ کا نظام جاری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے اس ملک (امریکہ) کا دنیا میں

---

(۱) شعب الإيمان، رقم: ٥٥١٥ (٣٩٣/٤)، كنز العمال، رقم: ٩٧٧٤ (١٠٨/٤)، جامع الأحاديث، رقم: ١٢٨٢٧ (١٦٤/١٣)

طوطی بول رہا ہے۔ اور اب تو اس کا دوسرا حریف بھی دنیا سے رخصت ہو گیا، اور اب کوئی اس سے ٹکر لینے والا موجود نہیں۔ لیکن پھر بھی اقتصادی ابتری کا شکار ہے، اس کی بنیاد بھی انٹرسٹ ہے، اس لئے یہ کہنا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں غریب فقیر قسم کے لوگ سود پر قرض لیا کرتے تھے۔ ان سے سود کا مطالبہ کرنا حرام تھا، لیکن آج اگر کوئی شخص کمرشل لون پر سود لے رہا ہے تو اس کو حرام نہیں ہونا چاہئے عقلی اور معاشی اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر جانبداری سے اس نظام کا مطالعہ کرے تو اس کو پتہ چل جائے گا کہ اس نظام نے دنیا کو تباہی کے آخری کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ اور انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کھل جائے گی، اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآن کریم نے سود کے خلاف اعلان جنگ کیوں کیا تھا؟ یہ تو سود کی حرمت کا ایک پہلو تھا جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا۔

سودی طریقہ کار کا متبادل

ایک دوسرا سوال بھی بہت اہم ہے جو آجکل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ انٹرسٹ حرام ہے۔ لیکن اگر انٹرسٹ کو ختم کر دیا جائے تو پھر اس کا متبادل طریقہ کیا ہوگا جس کے ذریعہ معیشت کو چلایا جائے؟ اس واسطے کہ آج پوری دنیا میں معیشت کی روح انٹرسٹ پر قائم ہے۔ اور اگر اس کی روح کو نکال دیا جائے تو اس کو چلانے کا دوسرا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے لوگ کہتے ہیں کہ انٹرسٹ کے سوا کوئی دوسرا نظام موجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو ممکن اور قابل عمل (Practicable) نہیں ہے۔ اور اگر کسی کے پاس قابل عمل طریقہ موجود ہے تو وہ بتائے کہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے، اور ایک مجلس میں اس موضوع کا پورا حق ادا ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔ اور اس کا جواب تھوڑا سا ٹیکنیکل بھی ہے، اور اس کو عام فہم اور عام الفاظ میں بیان کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ لیکن میں اس کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے۔

ناگزیر چیزوں کو شریعت میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا کہ یہ چیز حرام ہے تو پھر ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ چیز ناگزیر ہو، اس لئے کہ اگر وہ چیز ناگزیر ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو

حرام قرار نہ دیتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا﴾(۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیتے جو اس کی وسعت سے باہر ہو''

لہٰذا ایک مومن کے لئے تو اتنی بات بھی کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام قرار دے دیا تو چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے کہ کون سی چیز انسان کے لئے ضروری ہے اور کون سی چیز ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا جب اس چیز کو حرام قرار دے دیا تو یقیناً وہ چیز ضروری اور ناگزیر نہیں ہے۔ اس چیز میں کہیں خرابی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ ضروری اور ناگزیر معلوم ہو رہی ہے۔ تو اب اس خرابی کو دور کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا اور یہ چیز ناگزیر ہے۔

سودی قرض کا متبادل قرض حسنہ ہی نہیں ہے

دوسری بات یہ ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں انٹرسٹ (Interest) جس کو قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ جب کسی کو قرض دیا جائے تو ان کو غیر سودی قرض (Interest Free Loan) دینا چاہئے۔ اور اس پر کسی منافع کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب انٹرسٹ ختم ہو جائے گا ہمیں پھر غیر سودی قرضے ملا کریں گے، پھر جتنا قرض چاہیں حاصل کریں، اور اس سے کوٹھیاں بنگلے بنائیں۔ اور اس سے فیکٹریاں قائم کریں، اور ہم سے کسی انٹرسٹ کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ اور اسی سوچ کی بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ صورت قابل عمل (Practicable) نہیں ہے اس لئے کہ جب ہر شخص کو سود کے بغیر قرض دیا جائے گا تو پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا کہ سب لوگوں کو بغیر سود کے قرضہ دے دیا جائے؟

سودی قرض کا متبادل ''مشارکت'' ہے

یاد رکھئے کہ انٹرسٹ کا متبادل (Alternative) قرض حسنہ نہیں ہے کہ کسی کو ویسے ہی قرض دے دیا جائے بلکہ اس کا متبادل ''مشارکت'' ہے یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لئے قرضہ لے رہا ہے تو وہ قرض دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں، اگر تمہیں نفع ہوگا تو اس نفع کا کچھ حصہ مجھے دینا پڑے گا اور اگر نقصان تو اس نقصان میں بھی شامل ہوں گا، تو اس

(۱) البقرة: ۲۸٦

کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں قرض دینے والا شریک ہوجائے گا، اور یہ مشارکت ہوجائے گی اور یہ انٹرسٹ کا متبادل طریقہ کار (Alternative System) ہے۔

اور ''مشارکت'' کا نظریاتی پہلو تو میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ انٹرسٹ کی صورت میں تو دولت کا بہت معمولی حصہ کھاتہ دار (Depositor) کو ملتا ہے، لیکن اگر ''مشارکت'' کی بنیاد پر کاروبار کیا جائے اور سرمایہ کاری (Financing) ''مشارکت'' کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں تجارت کے اندر جتنا نفع ہوگا اس کا ایک متناسب (Proportionate) حصہ کھاتہ داروں کی طرف بھی منتقل ہوگا اور اس صورت میں تقسیم دولت (Distribution of Wealth) کا اوپر کی طرف جانے کے بجائے نیچے کی طرف آئے گا۔ لہٰذا اسلام نے جو متبادل نظام پیش کیا وہ ''مشارکت'' کا نظام ہے۔

مشارکت کے بہترین نتائج

لیکن یہ ''مشارکت'' کا نظام چونکہ موجودہ دنیا میں ابھی تک کہیں جاری نہیں ہے اور اس پر عمل نہیں ہوا اس لئے اس کی برکات بھی لوگوں کے سامنے نہیں آرہی ہیں، ابھی گذشتہ بیس پچیس سال کے دوران مسلمانوں نے مختلف مقامات پر اس کی کوششیں کی ہیں کہ وہ ایسے مالیاتی ادارے اور بینک قائم کریں جو انٹرسٹ کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ ان کو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر چلایا جائے اور شاید آپ کے علم میں بھی یہ بات ہوگی کہ اس وقت پوری دنیا میں کم از کم ۸۰ سے لے کر ۱۰۰ تک ایسے بینک اور سرمایہ کاری کے ادارے قائم ہوچکے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر اپنے کاروبار کو چلا رہے ہیں اور انٹرسٹ سے پاک کاروبار کررہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا یہ دعویٰ سو فیصد صحیح ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں۔ لیکن بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں تقریباً ایک سو ادارے اور بینک غیر سودی نظام پر کام کررہے ہیں، اور یہ صرف اسلامی ملکوں میں نہیں بلکہ بعض مغربی اور یورپین ممالک میں بھی کام کررہے ہیں۔ ان بینکوں اور اداروں نے ''مشارکہ'' کے طریقے پر عمل کرنا شروع کیا ہے، اور جہاں کہیں ''مشارکہ'' کے طریقے کو اپنایا گیا وہاں اس کے بہتر نتائج نکلے ہیں۔ ہم نے پاکستان میں ایک بینک میں اس کا تجربہ کیا اور میں نے خود اس کی ''مذہبی نگراں کمیٹی'' کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اس کا معائنہ کیا، اور اس میں ''مشارکہ'' کے اندر بعض اوقات کھاتہ داروں کو بیس فیصد نفع بھی دیا گیا لہٰذا اگر ''مشارکہ'' کو وسیع پیمانے پر کیا جائے تو اس کے نتائج اور بھی زیادہ بہتر نکل سکتے ہیں۔

''مشارکت'' میں عملی دشواری

لیکن اس میں ایک عملی دشواری ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص مشارکہ کی بنیاد پر بینک سے پیسے لے گیا اور ''مشارکہ'' کے معنی نفع اور نقصان میں شرکت (Profit and Loss Sharing) کے ہیں کہ اگر نفع ہوگا تو اس میں بھی شرکت ہوگی اور اگر نقصان ہوگا تو اس میں بھی شرکت ہوگی تو افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود ہمارے عالم اسلام میں بددیانتی اتنی عام ہے، اور بگاڑ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اس بنیاد پر بینک سے پیسے لے کر گیا کہ اگر نفع ہوا تو نفع لا کر دوں گا، اور اگر نقصان ہوا تو نقصان بینک کو بھی برداشت کرنا پڑے گا تو وہ پیسے لے کر جانے والا شخص کبھی پلٹ کر نفع لے کر نہیں آئے گا۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرے گا کہ مجھے نقصان ہوا ہے، اور وہ بینک سے کہے گا کہ بجائے اس کے کہ آپ مجھ سے نفع کا مطالبہ کریں بلکہ اس نقصان کی تلافی کے لئے مجھے مزید رقم دیں۔

عملی پہلو کا یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے، مگر اس کا تعلق اس ''مشارکہ'' کے نظام کی خرابی سے نہیں ہے اور اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ ''مشارکہ'' کا نظام خراب ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق انسانوں کی خرابی سے ہے جو اس نظام پر عمل کر رہے ہیں، ان عمل کرنے والوں کے اندر اچھے اخلاق دیانت اور امانت نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے ''مشارکہ'' کے نظام میں یہ خطرات موجود ہیں کہ لوگ بینک سے ''مشارکہ'' کی بنیاد پر پیسے لے جائیں گے اور پھر کاروبار میں نقصان دکھا کر بینک کے ذریعہ ڈیپازیٹر کو نقصان پہنچائیں گے۔

اس دشواری کا حل

لیکن یہ مسئلہ کوئی ناقابل حل مسئلہ نہیں ہے اور ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کا حل نہ نکالا جاسکے، اگر کوئی ملک اس ''مشارکہ'' کے نظام کو اختیار کرے تو وہ بآسانی یہ حل نکال سکتا ہے کہ جس کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ اس نے بددیانتی سے کام لیا ہے اور اپنے اکاؤنٹس صحیح بیان (Declare) نہیں کئے تو حکومت ایک مدت دراز کے لئے اس کو بلیک لسٹ (Black List) کردے، اور آئندہ کوئی بینک اس کو فنانسنگ کی کوئی سہولت فراہم نہ کرے۔ اسی صورت میں لوگ بددیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے۔ آج بھی جائنٹ اسٹاک کمپنیاں کام کر رہی ہیں، اور وہ اپنے بیلنس شیٹ (Balance Sheet) شائع کرتی ہیں، اور اس بیلنس شیٹ میں اگرچہ بددیانتی بھی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود

اس میں وہ اپنا نفع ظاہر کرتی ہیں۔ اس لئے اگر ''مشارکہ'' کو پورے ملکی سطح پر اختیار کریں تو اس حل کو اختیار کیا جاسکتا ہے البتہ جب تک ''مشارکہ'' کو ملکی سطح پر اختیار نہیں کیا جاتا۔ اس وقت تک انفرادی (Individual) اداروں کو ''مشارکہ'' پر عمل کرنا دشوار ہے۔ لیکن ایسے انفرادی ادارے سلیکٹڈ (Selected) بات چیت کے ذریعہ مشارکہ کر سکتے ہیں۔

دوسری متبادل صورت ''اجارہ''

اس کے علاوہ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ اس میں ''مشارکہ'' کے علاوہ بینکنگ اور فائینانسنگ کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ اجارہ (Leasing) کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شخص بینک سے پیسہ مانگنے آیا اور بینک نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس ضرورت کے لئے پیسہ چاہئے؟ اس نے بتایا کہ مجھے اپنے کارخانے میں ایک مشینری باہر سے منگوا کر لگانی ہے، تو اب بینک اس شخص کو پیسے نہ دے۔ بلکہ خود اس مشینری کو خرید کر اس شخص کو کرایہ پر دیدے۔ اس عمل کو اجارہ (Leasing) کہا جاتا ہے، البتہ آجکل فائینانسنگ اداروں اور بینک میں فائینانشل لیزنگ کا جو طریقہ رائج ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے، اس ایگریمنٹ میں بہت سی شقیں (Clauses) شریعت کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کو شریعت کے مطابق آسانی کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں متعدد فائینانشل ادارے قائم ہیں جن میں لیزنگ ایگریمنٹ شریعت کے مطابق ہیں، اس کو اختیار کرنا چاہئے۔

تیسری متبادل صورت ''مرابحہ''

اسی طرح ایک اور طریقہ ہے۔ جس کا آپ نے نام سنا ہوگا، وہ ہے ''مرابحہ فائینانسنگ'' یہ بھی کسی شخص سے معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے جس میں نفع پر وہ چیز بیچ دی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص بینک سے اس لئے قرض لے رہا ہے کہ وہ خام مال (Raw Material) خریدنا چاہتا ہے، وہ بینک اس کو خام مال خریدنے کے لئے پیسے دینے کے بجائے وہ خود خام مال خرید کر اس کو نفع پر بیچ دے یہ طریقہ بھی شرعاً جائز ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرابحہ کی یہ صورت تو ہاتھ گھما کر کان پکڑنے والی بات ہوگئی، کیونکہ اس میں بینک سے نفع لینے کے بجائے دوسرے طریقے سے نفع وصول کرلیا۔ یہ کہنا درست نہیں، اس لئے کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے اور مشرکین مکہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے کہ بیع بھی تو ربا جیسی ہے، اس میں بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا میں بھی انسان نفع کماتا ہے، پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآن کریم نے انکا ایک ہی جواب دیا کہ یہ ہمارا حکم ہے کہ ربا حرام ہے اور بیع حلال ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جاسکتا، اور روپیہ پر منافع نہیں لیا جاسکتا۔ لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز یا مالک تجارت آجائے اور اس کو فروخت کر کے نفع حاصل کرے اس کو ہم نے حلال قرار دیا ہے۔ اور مرابحہ کے اندر درمیان میں مال آجاتا ہے اس لئے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا (Transaction) جائز ہو جاتا ہے۔

پسندیدہ متبادل کونسا ہے؟

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ مرابحہ اور لیزنگ (Leasing) مطلوبہ اور پسندیدہ متبادل (Ideal Alternative) نہیں ہیں، اور اس سے تقسیم دولت (Distribution of Wealth) پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ پسندیدہ متبادل ''مشارکہ'' ہے، لیکن آئندہ جو منفرد (Indicidual) ادارے قائم کئے جائیں ان کے لئے آزمائشی اور تجرباتی مدت (Transitory Period) میں مرابحہ اور لیزنگ پر بھی عمل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اور اس وقت بھی کچھ فائنانشیل انسٹیٹوشن ان بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔

بہرحال! یہ تو ''سود'' اور اس کے متعلقات کے بارے میں عام باتیں تھیں جو میں نے عرض کر دیں۔

''سود'' سے متعلق ایک مسئلہ اور ہے جس کی صدائے بازگشت باربار سنائی دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دارالحرب جہاں غیر مسلم حکومت ہو وہاں سود کے لین دین میں کوئی قباحت نہیں، وہاں غیر مسلم حکومت سے سود لے سکتے ہیں، اس مسئلہ پر بھی بہت لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چاہے دارالحرب ہو یا دارالسلام، جس طرح سود دارالسلام میں حرام ہے اسی طرح دارالحرب میں بھی حرام ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عام آدمی کو چاہئے کہ اپنا پیسہ بینک کے اندر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھے، جہاں پیسوں پر سود نہیں لگتا، لیکن اگر کسی شخص نے غلطی سے سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) میں پیسے رکھ دیئے ہیں اور اس رقم پر سود مل رہا ہے تو پاکستان میں

(۱) البقرة: ۲۷۵

تو ہم لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ سود کی رقم بینک میں چھوڑ دو، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں ایسی رقم اسلام کے خلاف کام پر خرچ ہوتی ہے، وہاں اس شخص کو چاہئے کہ وہ سود کی رقم بینک سے وصول کر کے کسی مستحق زکوٰۃ شخص کو ثواب کی نیت کے بغیر صرف اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کر دے اور خود اپنے استعمال میں نہ لائے۔

عصر حاضر میں اسلامی معیشت کے ادارے

ایک بات اور عرض کر دوں وہ یہ کہ یہ کام نسبتاً ذرا مشکل لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم مسلمانوں کو اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ ہم خود ایسے مالیاتی ادارے قائم کریں جو اسلامی بنیادوں پر کام کریں اور جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے عرض کیا کہ ''مشارکہ'' 'مرابحہ'' اور ''لیزنگ'' کی مکمل اسکیمیں موجود ہیں، اور ان بنیادوں پر مسلمان اپنے ادارے قائم کر سکتے ہیں، اور یہاں کے مسلمان ماشاء اللہ اس بات کو سمجھتے ہیں اور اس میں خود ان کے مسائل کا بھی حل ہے، ان کو چاہئے کہ یہاں رہ کر فائینانشیل انسٹیٹوٹ قائم کریں۔ امریکہ میں میرے علم کے مطابق کم از کم ہاؤسنگ کی حد تک دو ادارے موجود ہیں اور وہ صحیح اسلامی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔ ایک ٹورنٹو میں اور ایک لاس اینجلس میں ہے، اب ان اداروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے اور مسلمانوں کو اپنے طور پر ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں، لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ماہر فقہاء اور مفتی حضرات سے مشورہ کر کے اس کا نظام قائم کریں۔ اور اس سلسلے میں اگر آپ مجھ سے بھی خدمات لینا چاہیں تو میں ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہوں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں تقریباً 100 ادارے کام کر رہے ہیں، اور تقریباً 50 سال سے میں ان اداروں میں خدمت کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس کی توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں کے لئے کوئی بہتر راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

سود کی حرمت اور موجودہ نظام بینکاری ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ "لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ" (۱)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، سودی معاملے میں گواہ بننے والے اور سود کا معاملہ لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے''

اس حدیث سے پتہ چلا کہ جس طرح سود کا معاملہ کرنا ناجائز اور حرام ہے اسی طرح سود کے معاملے میں دلالی کرنا یا سود کا حساب کتاب لکھنا بھی ناجائز ہے۔ اسی حدیث کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا جاتا ہے کہ آج کل بینکوں کی ملازمت جائز نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی کسی نہ کسی درجے میں سود کے معاملات میں ملوث ہو جاتا ہے۔

کاتبِ سود کا حکم شرعی

اس کی تفصیل میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ کاتب سود سے مراد وہ شخص جو کہ عقد سود کے وقت سود وغیرہ کا حساب لکھ کر عاقدین کی اس عقد میں معاونت کرتا ہے، وہ اس وعید میں داخل ہے لیکن اگر کوئی شخص عقد سود کے انعقاد کے وقت یہ حساب و کتاب نہیں لکھتا بلکہ عقد کے بعد جب وہ پچھلے عرصہ کے تمام حسابات اور کارگزاری اور رپورٹیں وغیرہ لکھتا ہے گو اس کے ذیل میں سود کے

☆ تقریر ترمذی (۱/ ۳۸ تا ۵۷)، زیر نظر بیان سنن ترمذی شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے سود کی حرمت اور موجودہ نظام بینکاری پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) سنن الترمذی، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء فی آكل الربا، رقم: ۱۱۲۷، سنن أبی داؤد، كتاب البيوع، باب فی آكل الربا ومؤكله، رقم: ۲۸۹۵، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ فی الربا، رقم: ۲۲٦۸

حسابات بھی اسے لکھنے پڑھتے ہیں، غرض یہ کہ اس حساب و کتاب سے عقد سود میں معاونت نہیں ملتی تو وہ شخص اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔ اگر اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو اس سے ان حضرات کی الجھن دور ہوسکتی ہے جن کا کام اکاؤنٹس اور آڈٹ وغیرہ کا ہے، ان لوگوں کو مختلف فرموں، اداروں اور کمپنیوں کے پورے سال کے حسابات لکھنے پڑتے ہیں اور اس کی چیکنگ کرنی ہوتی ہے، اس میں انہیں سود وغیرہ جس کا کمپنی نے عقد کیا ہوتا ہے اسے بھی لکھنا پڑتا ہے، لیکن ان کا یہ لکھنا محض ایک سالانہ رپورٹ اور کارگزاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے کمپنی کی سودی لین دین میں کوئی معاونت نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ حضرات اس وعید میں داخل نہیں ہوں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

بینک کی ملازمت کیوں جائز نہیں؟

البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ بینک کی ملازمت کیوں حرام ہے؟ اس لئے کہ آجکل تو ہر جگہ سے پیسہ بینک ہی کے واسطے سے آتا ہے، کوئی بھی چیز سود سے پاک نہیں، لہٰذا پھر تو ہر چیز حرام ہونی چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہر چیز کی حد مقرر کردی ہے کہ اس حد تک جائز ہے اور اس حد کے آگے ناجائز ہے۔ لہٰذا بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینک کے اندر سودی لین دین ہوتا ہے، اور جو شخص بھی بینک میں ملازم ہے وہ کسی نہ کسی درجے میں سودی لین دین میں تعاون کر رہا ہے۔ اور کسی بھی گناہ کے کام میں تعاون کرنا قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے؟ فرمایا:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾(۱)

اس وجہ سے بینک کی ملازمت حرام ہے۔ جہاں تک اس اشکال کا تعلق ہے کہ ہر پیسہ بینک ہی کے واسطے سے ہم تک پہنچتا ہے لہٰذا ہر پیسہ حرام ہونا چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بینک سے پیسے جائز اور حلال طریقے سے آرہے ہیں تو ان پیسوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر ناجائز اور حرام طریقے سے آرہے ہیں تو ان کا استعمال بھی حرام ہوگا۔

ربوا القرآن اور ربوا الحدیث

لفظ ''الربوا'' لغت میں زیادتی کے معنی میں آتا ہے، اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا اطلاق پانچ قسم کے معانی کے لئے ہوا ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کا استعمال دو معنوں کے لئے ہوتا ہے۔

(۱) المائدۃ: ۲، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو''

ایک ''ربوا النسیہ'' کے لئے اور دوسرے ''ربوا الفضل'' کے لئے۔ ''ربوا النسیہ'' کی تعریف یہ ہے:

"هو القرض المشروط فيه الاجل وزيادة مال على المستقرض"

اس کو ''ربوا القرآن'' بھی کہتے ہیں، اور ''ربوا الفضل'' کی تعریف یہ ہے کہ دو ہم جنس چیزوں میں آپس کے تبادلے کے وقت کمی زیادتی کرنا۔ اس کو ''ربوالحدیث'' بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ پہلی قسم کے ربا کو قرآن کریم نے اور دوسری قسم کے ربا کو حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔

سود مفرد اور سود مرکب دونوں حرام ہیں

بعض لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے صرف سود مرکب کو حرام قرار دیا ہے، سود مفرد کو حرام نہیں کہا۔ اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً﴾ (۱)

اس آیت میں ربا کے ساتھ "أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً" کی قید لگی ہوئی ہے، اور نہی قید پر داخل ہوئی ہے، لہٰذا صرف وہ ربا ممنوع ہوگا جس میں سود کی رقم راس المال سے کم از کم دوگنی ہو جائے۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ "أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً" کی قید باجماع امت احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے، اور یہ قید بالکل ایسی ہے جیسے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلاً﴾ (۲)

اس آیت میں اگرچہ ''ثمن قلیل'' کی قید لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی بھی عقلمند انسان اس آیت کا یہ مطلب نہیں لیتا کہ آیات قرآنی کو ''ثمن قلیل'' کے ساتھ فروخت کرنا تو جائز نہیں لیکن ''ثمن کثیر'' کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے۔ اور اس قید کے اتفاقی ہونے کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

-1 قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ (۳)

اس آیت میں لفظ ''ما'' عام ہے، جو ربا کی ہر قلیل اور کثیر مقدار کو شامل ہے۔

-2 خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے یہ اعلان فرمادیا:

---

(۱) آل عمران: ۱۳۰

(۲) البقرة: ۴۱، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''میری آیات کو تھوڑے سے عوض کے بدلے مت بیچو''

(۳) البقرة: ۲۷۸، آیت کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان رکھتے ہو''

((وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَاِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ))(۱)

''یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا''

اس حدیث میں لفظ ''کلہ'' ہر مقدار ربا کی حرمت پر صریح ہے۔

-3 حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا))(۲)

اس حدیث میں لفظ ''نفعا'' اس بات پر دال ہے کہ نفع کی ہر مقدار حرام ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت میں "أضعافا مضعفة" کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے۔

سود خور سے اللہ تعالیٰ کا اعلان جنگ

حرمت ربا کی آیات قطعی الدلالت ہیں، اور ربا کا معاملہ کرنے والوں کے بارے میں جو شدید وعید قرآن کریم میں آئی ہے ایسی شدید وعید شاید کسی دوسرے گناہ پر نہیں آئی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾(۳)

اس آیت میں صاف اعلان فرمادیا کہ اگر تم سودی لین دین نہیں چھوڑ و گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔

کیا موجودہ بینکوں کا سود حرام نہیں؟

آج پوری دنیا سود کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی تو بنیاد ہی سود پر

(۱) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبى، رقم: ۱۲۳۷، سنن ابى داؤد، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبى رقم: ۱٦۲۸، سنن ابن ماجه، كتاب المناسك، باب الخطبة يوم النحر، رقم: ۳۰٤٦، سنن الدارمى كتاب المناسك، باب فى سنة الحج، رقم: ۱۷۷٤

(۲) كشف الخفاء، رقم: ۱۹۹۱ (۱۲٥/۲)، بريقة محمودية فى شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية (۲۲٥/٦)، الكبائر للذهبى (٦۱/۱)

(۳) البقرة: ۲۷۸-۲۷۹

قائم ہے۔ سارے بینک سود کی بنیاد پر چل رہے ہیں، ساری تجارتیں سود کی بنیاد پر ہو رہی ہیں، بڑے بڑے سرمایہ دار اور بڑی بڑی کمپنیاں سودی بنیادوں پر بینک سے قرضہ لیتی ہیں اور اس سے اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔

چنانچہ عالم اسلام میں بعض عناصر ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ بینکوں کا سود وہ سود نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے قرض لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس کھانے کے پیسے نہ ہوتے تو وہ بھوک کی حالت میں کسی صاحب استطاعت کے پاس جاتا اور اس کو جا کر کہتا کہ میں بھوکا ہوں، مجھے کچھ پیسے قرض دے دو تا کہ بیوی بچوں کو کھانا کھلا سکوں۔ جواب میں صاحب استطاعت کہتا کہ میں سود پر قرض دوں گا، لہٰذا تم یہ وعدہ کرو کہ اس قرض کے ساتھ اتنا سود ادا کرو گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ظلم کی بات تھی کہ ایک آدمی بھوکا ہے اور اس بھوک کو مٹانے کے لئے آپ سے قرض مانگ رہا ہے تو آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کا اصل فرض تو یہ تھا کہ آپ اپنی طرف سے اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کرتے، نہ یہ کہ اس کو قرض دے کر الٹا اس سے سود کا مطالبہ کریں۔ ایسے سود کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ اگر تم اس کو نہیں چھوڑو گے تو تمہارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

یا مثلاً ایک شخص کے گھر میں میت ہوگئی، اور اس کے پاس کفن دفن کے لئے پیسے نہیں ہیں وہ دوسرے شخص کے پاس جاتا ہے اور اس سے قرض مانگتا ہے تا کہ میت کے کفن دفن کا انتظام کر سکے، اس موقع پر قرض دینے والا یہ مطالبہ کرے کہ میں اس وقت تک تمہیں قرض نہیں دوں گا جب تک تم اتنا سود ادا نہیں کرو گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر سود کا مطالبہ کرنا انسانیت اور مروّت کے خلاف بات تھی، اس لئے اس قسم کے سود کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

تجارتی قرضوں پر سود کی حقیقت

لیکن جہاں تک موجودہ دور کے بینکوں کے سود کا تعلق ہے، اس میں قرض لینے والے غریب غرباء نہیں ہوتے جن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا، اور جن کے پاس میت کے کفن دفن کے انتظام کے لئے پیسے نہیں ہوتے، ایسے غریب غرباء کو تو بینک قرض دیتا ہی نہیں۔ اگر ہم اور آپ میں سے کوئی بینک سے قرض لینے جائیں گے تو بینک والے ہمیں مار کر باہر نکال دیں گے۔ بلکہ بینک سے قرض لینے والے بڑے بڑے سرمایہ دار اور دولت مند ہوتے ہیں جو بھوک مٹانے اور کفن دفن کے

لئے قرض نہیں لیتے بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بینک سے قرض لے کر اس رقم کو اپنی تجارت میں لگا کر اس کو اور زیادہ ترقی دیں گے اور زیادہ نفع کمائیں گے۔ مثلاً ایک لاکھ روپیہ بینک سے قرض لے کر اس سے دو لاکھ بنائیں گے۔

دوسری طرف وہ روپیہ جو سرمایہ دار بینک سے بطور قرض لیتا ہے وہ عوام کا روپیہ ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی کمائی سے بچا بچا کر یہ روپیہ بینک میں بطور امانت کے رکھوایا ہے۔ لہٰذا جو سرمایہ دار بینک سے قرض لے رہا ہے اگر اس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس قرض کے ذریعہ تجارت کر کے جو نفع کماؤ گے اس نفع میں سے اتنا فیصد تم بینک کو بطور سود ادا کر دو تو اس میں کون سا ظلم ہو جائے گا؟ اور اس زمانے میں جو سود رائج تھا اس میں قرض لینے والے پر ظلم ہوتا تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سود کو حرام قرار دے دیا۔ لہٰذا موجودہ دور کے بینکوں کا سود حرام نہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک قرض وہ ہے جس کو انسان اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لئے لیتا ہے، ایسے قرض کو ''صرفی'' کہتے ہیں، دوسرا قرض وہ ہے جس کو انسان تجارت کرنے اور نفع کمانے کے لئے لیتا ہے۔ ایسے قرض کو ''تجارتی قرض'' یا ''پیداواری قرض'' کہتے ہیں۔ سود کے جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ قرآن کریم نے ''صرفی قرض'' پر لئے جانے والے سود کو حرام کہا ہے۔ ''تجارتی قرض'' پر لیا جانے والا سود اس حرمت میں داخل نہیں۔

سود کے جواز پر استدلال

سود کے جواز کے قائلین قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾(۱)

اس آیت میں لفظ ''الربوا'' معرف باللام ہے اور الف لام میں اصل یہ ہے کہ وہ عہد کے لئے ہو۔ لہٰذا لفظ ''ربا'' سے وہ مخصوص ''ربا'' مراد ہوگا جو زمانہ جاہلیت میں اور حضور ﷺ کے ابتدائی دور میں رائج تھا۔ اور اس زمانے میں صرف ''صرفی قرض'' اور اس پر سود لینے کا رواج تھا۔ ''تجارتی قرض'' اور اس پر سود لینے کا اس وقت رواج نہیں تھا۔ اور جو چیز اس زمانے میں رائج ہی نہیں تھی قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے؟ لہٰذا حرمت سود کا اطلاق صرف ''صرفی قرض'' پر لئے جانے والے سود پر ہوگا۔ ''تجارتی قرض'' پر لئے جانے والے سود پر نہیں ہوگا۔

(۱) البقرة: ۲۷۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام''

سود کے جواز کے قائلین

یہ وہ استدلال ہے جو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے کیا گیا۔ اور جس کی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ بینکوں کا سود جائز ہے۔ یہاں تک کہ مصر کے موجودہ مفتی اعظم نے بھی بینکوں کے سود کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اور اس فتویٰ کی وجہ سے پوری عالم عرب میں ایک غلغلہ برپا ہے اور اس کا چرچا ہے۔ ان کے علاوہ عالم اسلام کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی اس موقف کا حامل کھڑا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں سرسید احمد خان، عرب میں مفتی عبدہ، رشید رضا بھی اس موقف کے حامل گزرے ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا موقف بھی یہی تھا۔ اور جسٹس قدیر الدین نے اس کے جواز پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ اگر آدمی غور سے نہ دیکھے تو بظاہر جواز کے قائلین کا استدلال دل کو اپیل کرتا ہے کہ اگر ایک سرمایہ دار بینک سے قرض لے کر نفع کما رہا ہے تو اس سے سود کا مطالبہ کرنے میں کون سے ظلم اور جرم کی بات ہے؟ چنانچہ نو تعلیم یافتہ طبقہ اس استدلال سے مرعوب ہو کر ان کا حامی بن جاتا ہے۔

حکم حقیقت پر لگتا ہے، صورت پر نہیں

حقیقت یہ ہے کہ جواز کے قائلین کا استدلال زبردست مغالطے پر مبنی ہے، ان کے استدلال کا صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ہیں۔ ان کے استدلال کا صغریٰ یہ ہے کہ عہد رسالت میں تجارتی سود رائج نہیں تھا۔ اور کبریٰ یہ ہے کہ جو چیز عہد رسالت میں رائج نہ ہو اس پر حرمت کا اطلاق نہیں ہوسکتا یہ صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ہیں، لہٰذا ان کا استدلال درست نہیں۔

پہلے کبریٰ کو سمجھ لیں کہ یہ کبریٰ غلط ہے۔ دیکھئے اصول یہ ہے کہ قرآن یا حدیث جب کسی چیز پر حلت یا حرمت کا حکم لاتے ہیں تو وہ حکم اس چیز کی کسی خاص شکل یا صورت پر نہیں لگاتے بلکہ اس چیز کی حقیقت پر لگاتے ہیں۔ لہٰذا جہاں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں وہ حکم آجائے گا۔

مثلاً شراب کو لے لیں، جس زمانے میں شراب حرام ہوئی، اس زمانے میں اس زمانے کے لوگ اپنے گھروں میں انگور کا شیرہ اپنے ہاتھوں سے نکال کر اس کو سڑا کر شراب بناتے تھے، لہٰذا اب موجودہ دور میں کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ اس زمانے میں لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں میں شراب بناتے تھے اور اس میں حفظان صحت کے اصولوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا، اس لئے شراب حرام قرار دے دی گئی تھی۔ اب چونکہ موجودہ دور میں شاندار مشینوں کے ذریعہ حفظان صحت کے تمام

اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی صفائی ستھرائی کے ساتھ شراب بنائی جاتی ہے اس لئے شراب کی حرمت کا اطلاق موجودہ دور کی شراب پر نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال بالکل احمقانہ ہے اس لئے کہ شریعت نے شراب کی کسی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ اس کی حقیقت کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس چیز میں شراب کی وہ حقیقت پائی جائے گی اس پر حرمت کا اطلاق ہو جائے گا۔ چاہے اس کی وہ مخصوص صورت حضور ﷺ کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں وہسکی، بیئر اور برانڈی نہیں تھی، اس لئے یہ حرام نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں اگرچہ اس نام سے اور اس شکل میں موجود نہیں تھی، مگر اس کی حقیقت یعنی ''ایسا مشروب جو نشہ آور ہو'' موجود تھی، اور آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کو حرام قرار دیا تھا، اب یہ حقیقت ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی، چاہے کسی زمانے میں بھی ہو، اور کسی بھی نام سے پائی جائے۔

ایک لطیفہ، گانا بجانا حرام نہ ہوتا

ہندوستان کا ایک گویا (گانے والا) ایک مرتبہ حج کرنے گیا، حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہا تھا تو اس زمانے میں راستے میں قیام کے لئے منزلیں ہوتی تھیں، اس نے بھی رات گزارنے کے لئے ایک منزل پر قیام کیا، تھوڑی دیر کے بعد اسی منزل پر ایک عرب گویا آ گیا، اور عرب گویے نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کر دیا۔ اس عرب گویے کی آواز بہت خراب اور بھدی تھی۔ ہندوستانی گویے کو اس کی آواز سے بہت کراہیت اور وحشت ہوئی جب اس نے گانا بجانا بند کیا تو ہندوستانی گویے نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور ﷺ نے گانا بجانا کیوں حرام قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ آپ نے اس جیسے بدوؤں کا گانا سنا تھا، اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو کبھی حرام قرار نہ دیتے۔

پھر تو خنزیر بھی حلال ہونا چاہئے!

آج کل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! چونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں یہ چیز یا یہ عمل اس طرح ہوتا تھا، اس لئے آپ نے اس کو حرام قرار دیا تھا، لیکن آج کل چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہو رہا ہے اس لئے یہ حرام نہیں۔ حتیٰ کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ شریعت نے خنزیر کو اس لئے حرام قرار دیا تھا کہ اس زمانے میں خنزیر گندے رہتے تھے،

غلاظت کھاتے تھے، گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی، لیکن آجکل تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے، اوران کی پرورش کے لئے اعلیٰ درجے کے فارم قائم کردیئے گئے ہیں، لہٰذا اب ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لئے حلال ہونے چاہئیں۔

بالکل اسی طرح سود کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ ''تجارتی سود'' حضور ﷺ کے زمانے میں ہوتا تو حضور ﷺ اس کو حرام قرار نہ دیتے، اس کا جواب پہلے دیا جاچکا ہے کہ شریعت جس چیز کو حرام قرار دیتی ہے اس کی حقیقت کو حرام قرار دیتی ہے، اس کی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیتی، اسی طرح سود کی بھی حقیقت کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے اس ''سود'' کی مخصوص شکل حضور ﷺ کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو۔

''سود'' کی حقیقت

اب دیکھنا یہ ہے کہ ''سود'' کی حقیقت کیا ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اور یہ حقیقت موجودہ دور کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ سود کی حقیقت یہ ہے کہ ''کسی شخص کو دیئے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادتی کا مطالبہ کرنا'' مثلاً میں نے ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیئے، اور اس کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ ایک ماہ بعد تم سے ایک سو پانچ روپے واپس لوں گا تو یہ سود ہے، البتہ اگر طے نہیں کیا بلکہ میں نے اس کو ویسے ہی سو روپے قرض دیدئے لیکن قرض واپس کرتے وقت اپنی خوشی سے ایک سو پانچ روپے واپس کئے تو یہ سود اور حرام نہیں۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے اور قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ اس کا قرض کچھ زیادتی کے ساتھ واپس کرتے تا کہ اس کی دل جوئی ہوجائے، لیکن چونکہ یہ زیادتی پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی، اس لئے وہ سود نہیں ہوتی تھی، حدیث کی اصطلاح میں اس کو ''حسن القضاء'' کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا، بلکہ حضور ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

((اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحْسَنُکُمْ قَضَآءً))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب حسن القضاء، رقم:۲۲۱۸، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب استسلاف الحیوان واستقراضہ، رقم: ۴۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ۸۷۴۳

''یعنی تم سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں''

اس سے معلوم ہوا کہ طے کر کے زیادہ ادا کرنا تو سود ہے اور طے کئے بغیر زیادہ ادا کرنا سود نہیں، بلکہ ''حسن قضاء'' ہے۔ بہرحال چونکہ ''سود'' کی مندرجہ بالا حقیقت موجودہ بینکوں کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے، اس لئے تجارتی سود بھی حرام ہوگا۔ مندرجہ بالا تفصیل سے تجارتی سود کے جواز کے قائلین کی دلیل کا کبریٰ غلط ثابت ہو گیا۔

حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی پھیلاؤ

ان کی دلیل کا صغریٰ یہ تھا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی سود موجود نہیں تھا، یہ صغریٰ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور ﷺ تشریف لائے اس میں بھی آج کے دور کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں۔

مثلاً آج کل مشترکہ کمپنیاں قائم ہوتی ہیں، جن کو ''جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں'' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے، اس سے پہلے اس کا وجود نہیں تھا لیکن جب ہم عرب کی تاریخ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلے کے تمام افراد اپنا ایک ایک درہم اور ایک ایک دینار لا کر ایک جگہ جمع کر دیتے پھر اس رقم کو قافلے والے شام لے جا کر اس سے مال تجارت لا کر فروخت کرتے۔ چنانچہ آپ نے ''تجارتی قافلوں'' کا نام سنا ہوگا وہ یہی کام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ جو آیت ہے:

﴿ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ۝ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ﴾(۱)

اس آیت میں گرمیوں اور سردیوں کے جن سفروں کا ذکر ہے اس سے مراد یہی تجارتی قافلے ہیں جو سردیوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے۔ اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ یہاں مکہ مکرمہ سے سامان لے جا کر وہاں فروخت کر دیتے اور وہاں سے سامان تجارت لا کر مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیتے، ان قافلوں میں بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا۔ ظاہر ہے وہ یہ قرض کھانے پینے کی ضرورت کے لئے یا کفن دفن کے انتظام کے لئے نہیں لیتا تھا۔ بلکہ وہ تجارتی مقصد ہی کے لئے لیتا تھا۔

---

(۱) القریش: ۱

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جس تجارتی قافلے کے ساتھ شامل مکہ مکرمہ سے آرہے تھے، جس پر مسلمانوں نے حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ بدر پیش آئی، اس قافلے کے بارے میں محدثین اور اصحاب السیر نے لکھا ہے:

"لَمْ يَبْقَ قَرُشِيٌّ وَلَا قَرُشِيَّةٌ عِنْدَهٗ دِرْهَمٌ اِلَّا وَبَعَثَ بِهٖ فِي الْبَعِيْرِ"

''جس قریش مرد یا عورت کے پاس ایک درہم بھی تھا وہ اس نے اس تجارتی قافلے میں بھیج دیا تھا''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ قبیلے اس طرح مشترک سرمائے سے تجارت کرتے تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ بنومغیرہ اور بنوثقیف کے درمیان آپس میں قبائلی سطح پر سود کا لین دین ہوتا تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے سود پر قرض لیتا اور دوسرا قرض دیتا تھا۔ ایک قبیلہ سود کا مطالبہ کرتا اور دوسرا قبیلہ اس سود کو ادا کرتا تھا۔ اور یہ سب تجارتی قرض ہوتے تھے۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو اس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا:

((وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَاِنَّهٗ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ))(۱)

''یعنی آج کے دن جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا''

چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض کر دیا کرتے تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ میں آج کے دن ان کا وہ سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہے وہ ختم کرتا ہوں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ سود دس ہزار مثقال سونا تھا۔ اور ایک مثقال تقریباً ۴ ماشے کا ہوتا ہے۔ اور یہ دس ہزار مثقال سونا کوئی سرمایہ اور راس المال نہیں تھا بلکہ یہ وہ سود تھا جو اصل رقم پر واجب ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ وہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی، رقم: ۲۱۳۷، سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبی رقم: ۱۶۲۸، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب الخطبة یوم النحر، رقم: ۳۰۴۶، سنن الدارمی کتاب المناسك، باب فی سنة الحج، رقم: ۱۷۷٤

قرض جس پر دس ہزار مثقال سونے کا سود لگ گیا ہو کیا وہ صرف کھانے پینے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کی غرض سے لیا گیا ہوگا۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینک کاری کی مثالیں

صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ ان کے پاس بطور امانت بڑی بڑی رقمیں رکھوانے کے لئے آتے تو وہ ان سے کہتے:

"لٰكِنَّهُ سَلَفٌ"(۱)

''یہ امانت نہیں بلکہ یہ قرض ہے''

یعنی میں یہ رقم تم سے بطور قرض لیتا ہوں، یہ میرے ذمے قرض ہے، لیکن وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ قرض کی صورت میں طرفین کا فائدہ تھا، امانت رکھوانے والوں کا تو یہ فائدہ تھا کہ اگر یہ رقم امانت کے طور پر رکھی ہوتی تو اس صورت میں حفاظت کے باوجود اگر ہلاکت ہوجاتی یا چوری ہوجاتی تو اس کا ضمان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر نہ آتا۔ کیونکہ امانت کا ضمان نہیں ہوتا، اس کے برخلاف قرض کی رقم اگر ہلاک ہوجائے یا چوری ہوجائے تو اس کا ضمان قرض لینے والے پر آتا ہے۔ لہٰذا امانت رکھوانے والوں کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کی رقم محفوظ اور مضمون ہوگئی۔ اور دوسری طرف حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کو اس بات کا اختیار حاصل ہوگیا کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہیں صرف کریں یا تجارت میں لگائیں۔ اس لئے کہ اگر وہ رقم امانت ہوتی تو امانت محضہ کو تجارت میں لگانا جائز نہیں۔

جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کے قرضوں کا حساب لگایا، چنانچہ فرماتے ہیں:

"فَحَسِبْتُ مَا عَلَيْهِ مِنَ الدُّيُوْنِ فَوَجَدْتُهُ أَلْفَيْ وَمِائَتَيْ أَلْفٍ"(۲)

(۱) صحيح البخاري، كتاب فرض الخمس، باب بركة الغازي في ماله حيا وميتا مع النبي وولاة الأمر، رقم: ۲۸۹۷

(۲) صحيح البخاري، كتاب فرض الخمس، باب بركة الغازي في ماله حيا وميتا مع النبي وولاة الأمر، رقم: ۲۸۹۷، شرح ابن بطال، رقم: ۳۱۲۹ (۳۶۳/۹)، حلية الأولياء (۹۱/۱)، السنن الكبرى للبيهقي (۲۸٦/٦)، الطبقات لابن سعد (۱۹/۳)

''یعنی جب میں نے اپنے والد کے ذمے واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے''

ظاہر ہے کہ اتنا بڑا قرض ''تجارتی قرض'' ہی تھا، صرفی قرض نہیں تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی قرضوں کا رواج تھا۔

تاریخ طبری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے حالات میں لکھا ہے کہ ہند بنت عتبہ جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور بیت المال سے قرض دیئے جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرض کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اس قرض کی رقم سے ''بلاد کلب'' میں جا کر تجارت کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرض بھوک مٹانے کے لئے یا میت کی تدفین کے لئے نہیں لیا گیا تھا، بلکہ تجارت کے لئے گیا تھا، اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں عہد رسالت اور عہد صحابہ میں موجود ہیں جو میں نے ''تکملہ فتح الملہم'' میں تفصیل کے ساتھ لکھ دی ہیں وہاں دیکھ لیا جائے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوا کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عہد رسالت میں تجارتی قرضے نہیں لئے جاتے تھے بلکہ تجارتی قرضوں کا رواج تھا، البتہ حضور ﷺ کے ''ربا'' کی حرمت کے اعلان کے بعد ان پر سود کا لین دین موقوف ہو گیا تھا۔ لہٰذا تجارتی سود کو جائز کہنے والوں نے جو دلیل پیش کی تھی اس کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ثابت ہو گئے۔

سود کو جائز کہنے والوں کا ایک اور استدلال

''سود'' کو جائز قرار دینے والوں کی طرف ایک اور استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذاتی ضرورت کے لئے یا کھانے پینے کی ضرورت کے لئے قرض مانگتا ہے اور قرض دینے والا شخص قرض دینے سے پہلے اس سے ''سود'' کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ ظلم اور ناانصافی کی بات ہے اور ایک غیر انسانی حرکت ہے، لیکن جو شخص تجارت کی غرض سے قرض مانگتا ہے تا کہ اس قرض کی رقم کو تجارت میں لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع کمائے اگر اس سے ''سود'' کا مطالبہ کیا جائے تو اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس استدلال کی تائید میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾(۱)

''یعنی اگر تم ''سود'' سے توبہ کرلو تو پھر تمہارا جو راس المال ہے وہ تمہارا حق ہے نہ تم

---

(۱) البقرة:۲۷۸

ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے''

اس آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ''سود'' کی حرمت کی علت ''ظلم'' ہے اور یہ ظلم صرفی سود میں تو پایا جاتا ہے لیکن تجارتی سود میں نہیں پایا جاتا، اس لئے ''تجارتی سود'' حرام نہ ہونا چاہئے۔

علت اور حکم میں فرق

اس دلیل کے اندر چند در چند مغالطے ہیں۔ پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اس دلیل میں ''ظلم'' کو ربا کی حرمت کے لئے علت قرار دیا ہے، حالانکہ ظلم دور کرنا ربا کی حرمت کی علت نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت ہے۔ اور حکم کا دار و مدار ''علت'' پر ہوتا ہے حکمت پر نہیں ہوتا۔ اس کی سادی سی مثال یہ سمجھئے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں پر سگنل لگے ہوتے ہیں اس میں تین رنگ کی بتیاں ہوتی ہیں، سرخ، پیلی، سبز جس وقت سرخ بتی جل رہی ہو اس وقت حکم یہ ہے کہ رک جاؤ۔ اور جس وقت سبز بتی جلے اس وقت چل پڑو۔ اور سگنل کا یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ٹریفک میں نظم وضبط قائم کیا جائے اور حادثات کی روک تھام کی جائے اور تصادم کا خطرہ کم سے کم کیا جائے۔ اس میں یہ جو کہا گیا کہ ''سرخ بتی پر رک جاؤ'' یہ حکم ہے اور ''سرخ بتی'' اس حکم کی ''علت'' ہے۔ اور اس کے ذریعے حادثات کی روک تھام، اس حکم کی ''حکمت'' ہے۔ اب ایک شخص رات کے بارہ بجے گاڑی چلاتا ہوا سگنل کے پاس پہنچا تو سرخ بتی جل رہی تھی، لیکن چاروں طرف سے کوئی گاڑی اور ٹریفک نہیں آ رہی تھی۔ اور تصادم اور حادثے کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس وقت میں اگرچہ اس حکم کی ''حکمت'' نہیں پائی جا رہی تھی لیکن پھر بھی اس ڈرائیور کے لئے گاڑی روکنا ضروری ہے اس لئے کہ رکنے کے حکم کی جو علت ہے، یعنی ''سرخ بتی کا جلنا'' وہ پائی جا رہی ہے لہٰذا اگر وہ نہیں رکے گا تو قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں پکڑا جائے گا۔

شراب حرام ہونے کی حرمت

اس طرح شریعت کے جتنے احکام ہیں ان سب میں حکم کا مدار ''علت'' پر ہوتا ہے، ''حکمت'' پر نہیں ہوتا، دنیا کے قوانین میں بھی یہی اصول کارفرما ہے، اور شریعت کے قانون میں بھی یہی اصول جاری ہے، قرآن کریم نے شراب کے بارے میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴾(۱)

---

(۱) المائدۃ:۹۱

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کی حرمت کی ایک حکمت یہ بیان فرمائی کہ اس کے نتیجے میں آپس میں بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور انسان اس کی وجہ سے اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ شراب اور جوا اسی وقت حرام ہے جب اس کے نتیجے میں عداوت اور بغض پیدا ہو، اور اگر عداوت اور بغض پیدا نہ ہو تو حرام نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال درست نہیں، اس لئے کہ عداوت اور بغض کا پیدا ہونا شراب اور جوئے کی حرمت کی ''حکمت'' ہے ''علت'' نہیں۔

ورنہ آجکل تو لوگ کہتے ہیں کہ شراب عداوت پیدا کرنے کے بجائے محبت اور دوستی پیدا کرتی ہے، چنانچہ آجکل جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو شراب کے جام ایک دوسرے کے جام سے ٹکراتے ہیں، اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان دوستی قائم ہو گئی ہے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے:

پیمانہ　وفا　برسر　پیمانہ　ہوا　تھا

پہلے ''پیمانہ'' سے مراد ''عہد'' اور دوسرے پیمانہ سے مراد ''جام شراب'' یعنی جام شراب پر عہد وفا ہوا تھا، سوال یہ ہے کہ اگر شراب بغض اور عداوت پیدا کرنے کے بجائے دوستی کا ذریعہ بن رہی ہو تو اس صورت میں شراب حلال ہو جائے گی؟ یا کوئی شخص یہ کہے کہ میں شراب تو پیتا ہوں لیکن اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا، اس لئے میرے لئے شراب حلال ہے، تو کیا اس شخص کے لئے شراب حلال ہو جائے گی؟ ظاہر ہے کہ حلال نہیں ہوگی، اس لئے کہ اللہ کے ذکر سے غفلت شراب کی حرمت کی ''حکمت'' ہے علت نہیں، اور حکم کا دارومدار ''علت'' پر ہوتا ہے ''حکمت'' پر نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح سود کی حرمت کے بارے میں قرآن کریم نے یہ جو فرمایا:

﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ (۱)

یہ بطور حکمت کے بیان فرمایا ہے، بطور ''علت'' کے بیان نہیں فرمایا۔ لہٰذا ''ربا'' کے حرام ہونے کا دارومدار ظلم کے ہونے یا نہ ہونے پر نہیں بلکہ ''ربا'' کی حقیقت پائے جانے پر ہے۔ جہاں ربا کی حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے وہاں ظلم پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ یہ تو پہلا مغالطہ تھا۔

شرعی احکام میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ سود کو جائز کہنے والے کہتے ہیں کہ ''صرفی قرضوں'' میں اگر کوئی شخص

(۱) البقرة: ۲۷۹

سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو چونکہ صرفی قرض طلب کرنے والا غریب ہوتا ہے، اس لئے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے، بخلاف تجارتی قرضوں کے کیونکہ اس میں قرض طلب کرنے والا سرمایہ دار اور امیر ہوتا ہے، اور اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم نہیں۔ یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ ایک جگہ سود لینا ظلم ہے اور دوسری جگہ ظلم نہیں، حالانکہ اصل سوال یہ ہے کہ قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز نہیں تو پھر اس میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں کہ جیسے ایک نان بائی روٹی فروخت کر رہا ہے ایک روٹی کی لاگت بارہ آنے آتی ہے۔ اور چار آنے وہ اپنے نفع کے رکھ کر ایک روپیہ کی روٹی فروخت کر رہا ہے اور اس نے غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں رکھا کہ غریب کو کم قیمت پر روٹی دے اور امیر کو زیادہ قیمت پر روٹی دے، بلکہ سب کو ایک ہی قیمت پر دے رہا ہے، لیکن کوئی بھی شخص اس سے یہ نہیں کہتا کہ تم غریب آدمی کو ایک روپے کی روٹی فروخت کر کے ظلم کر رہے ہو اس لئے کہ وہ اپنا حق وصول کر رہا ہے اور امیر اور غریب دونوں سے نفع کا مطالبہ کرنا درست ہے کوئی ظلم نہیں۔

بالکل اسی طرح ایک غریب شخص دوسرے سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسرا شخص اس قرض پر سود کا مطالبہ کرتا ہے تو آپ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرض لینے والا غریب ہے اس لئے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص غریب آدمی کو ایک روپے کی روٹی فروخت کر رہا ہے تو یہ ظلم نہیں اور دوسرا شخص اس غریب سے قرض پر سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ یہ ظلم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کی علت معاملہ کرنے والی ''غربت'' نہیں بلکہ ظلم کی اصل علت ''روپیہ'' ہے اور یہ علت غریب کے قرض میں جس طرح پائی جا رہی ہے امیر کے قرض میں بھی موجود ہے۔ حاصل یہ ہے کہ روٹی پر نفع کا مطالبہ کرنا لاگت پر زیادتی کر کے فروخت کرنا ظلم نہیں بلکہ جائز ہے اور انصاف کے مطابق ہے۔ لیکن ''روپے'' پر زیادتی کا مطالبہ کرنا انصاف کے بھی خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ ''روپیہ'' ایسی چیز نہیں کہ جس پر منافع کا مطالبہ کیا جائے لہٰذا روپیہ قرض لینے والا امیر ہو یا غریب ہو، دونوں صورتوں میں حرمت کا حکم عائد ہوگا۔

نفع اور نقصان دونوں میں شرکت کریں

تجارتی سود کو جائز کہنے والے ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ تجارتی سود میں ظلم نہیں۔ یہ بھی بالکل غلط بات ہے، اس کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھئے! شریعت نے یہ اصول بتایا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو کوئی رقم قرض دے رہے ہو تو تم پہلے یہ فیصلہ کرلو کہ اس رقم کے ذریعہ اس کی

امداد کرنا چاہتے ہو یا اس کے کاروبار میں شریک ہونا چاہتے ہو؟ اگر قرض دینے سے تمہارا مقصد اس کی امداد کرنا ہے تو پھر وہ محض امداد ہی رہنی چاہئے۔ اس پر پھر تمہیں کسی زیادتی کے مطالبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور اگر اس رقم کے ذریعہ اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر اس صورت میں تمہیں اس کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا پڑے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ یہ کہہ دیں کہ منافع میں تو ہم حصہ دار بنیں گے اور نقصان میں حصہ دار نہیں بنیں گے۔

تجارتی سود میں قرض دینے والا بینک سرمایہ دار سے کہتا ہے کہ میں اس قرض پر تم سے پندرہ فیصد سود لوں گا، چاہے تمہیں اس تجارت میں نفع ہو یا نقصان ہو۔ مجھے تمہارے نفع ونقصان سے کوئی سروکار نہیں مجھے تو اپنے سود سے مطلب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شریعت کے اصول کے خلاف ہے۔

قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہے

اس تجارتی سود کا ایسا گورکھ دھندا ہے کہ اس کی ہر صورت میں ظلم ہے، اگر سرمایہ دار تاجر کو نفع ہو تب بھی ظلم ہے، اگر نقصان ہو تب بھی ظلم ہے، نفع کی صورت میں قرض دینے والے پر ظلم ہے اور نقصان کی صورت میں قرض لینے والے پر ظلم ہے آج کی دنیا میں بینکوں کے اندر جس طرح کا مالیاتی نظام جاری ہے اس میں قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہو رہا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ عام طور پر بینکوں کے اندر عوام کی رکھی ہوئی امانتیں ہوتی ہیں، گویا عوام کی رقم سے بینک وجود میں آتے ہیں۔ لیکن اگر یہی عوام بینک سے قرضہ لینے جائیں تو بینک ان کو قرض نہیں دے گا۔ بلکہ بینک ان سرمایہ داروں کو قرض دیتا ہے جن کے پاس پہلے سے سرمایہ موجود ہو۔ لیکن بینک سے قرضہ لے کر بہت بڑے بڑے پیمانے پر تجارت کرنا چاہتے ہیں، یا وہ سرمایہ دار جن کی فیکٹریاں اور ملیں قائم ہیں وہ ان میں مزید اضافہ کرنے کے لئے بینک سے قرض لیتے ہیں۔

اب ہوتا یہ ہے کہ مثلاً ایک سرمایہ دار نے بینک سے ایک لاکھ روپیہ پندرہ فیصد سود کی بنیاد پر قرض لیا، اور اس میں کچھ رقم اپنی طرف سے ملا کر کاروبار شروع کیا، بعض اوقات کاروبار میں سو فیصد نفع بھی ہوجاتا ہے اور بعض اوقات کم بھی ہوتا ہے۔ اب فرض کریں کہ اس سرمایہ دار کو اس کاروبار میں سو فیصد نفع ہوا، جس کے نتیجے میں ایک لاکھ کے دو لاکھ ہوئے، ایک لاکھ اصل سرمایہ اور ایک لاکھ نفع کے۔ اس نفع میں سے اس نے پندرہ ہزار روپے بینک کو بطور سود ادا کئے اور باقی ۸۵ ہزار روپے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اور پھر بینک نے ان ۱۵ ہزار روپے میں سے اپنے اخراجات اور مصارف نکالنے

کے بعد صرف سات ہزار روپے ان عوام کو دیئے جن کے پیسوں سے تاجر نے تجارت کر کے ایک لاکھ روپے کمائے تھے، اور اس میں سے خود تاجر نے ۸۵ ہزار روپے رکھ لئے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اس عوام پر کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن وہ عوام بہت خوش ہے کہ اس کو ایک لاکھ روپے پر سات ہزار روپے نفع کے مل گئے۔ حالانکہ اس کے ایک لاکھ روپے پر ایک لاکھ روپے کا نفع ہوا تھا۔

پھر دوسری طرف عوام کو جو سات ہزار روپے ملے، سرمایہ دار وہ سات ہزار روپے بھی دوسری طرف سے وصول کر لیتا ہے، وہ اس طرح کہ تاجروں کا اصول یہ ہے کہ تاجر جو سود بینک کو ادا کرتا ہے وہ اس سود کو اپنی تیار کردہ اشیاء کی لاگت اور مصارف میں شامل کر دیتا ہے۔ مثلاً فرض کریں کہ اس تاجر نے اس ایک لاکھ روپے سے کپڑا تیار کیا، اس کپڑے کی قیمت مقرر کرنے سے پہلے وہ اس کپڑے کی تیاری پر آنے والی لاگت کا حساب لگائے گا۔ اور اس لاگت میں اس پندرہ ہزار کو بھی شامل کرے گا جو اس نے بطور سود کے بینک کو ادا کئے تھے، اور پھر اس پر اپنا نفع رکھ کر اس کپڑے کی قیمت مقرر کرے گا، اس طرح کپڑے کی قیمت میں خود بخود پندرہ فیصد کا اضافہ ہو جائے گا، اور بازار میں جب عوام اس کپڑے کو خریدیں گے تو پندرہ فیصد سود کی رقم ادا کر کے کریں گے جو پندرہ فیصد تاجر نے بینک کو ادا کئے تھے۔ اس طرح سرمایہ دار ایک طرف تو عوام کو صرف سات فیصد منافع دے رہا ہے، لیکن دوسری طرف وہ ان عوام سے پندرہ فیصد وصول بھی کر رہا ہے، لیکن وہ عوام خوش ہیں کہ مجھے سات فیصد نفع مل گیا، حالانکہ حقیقت میں اس کو ایک لاکھ روپے کے ۹۲ ہزار روپے وصول ہوئے۔

یہ تفصیل تو اس صورت میں تھی جب تاجر کو نفع ہو، اور اگر نقصان ہو جائے تو نقصان کی صورت میں وہ نقصان کی تلافی کے لئے مزید قرض بینک سے وصول کرتا ہے، اور قرض کی رقم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بینک دیوالیہ ہو جاتا ہے، اور بینک کے دیوالیہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس بینک میں رقمیں رکھوائی تھیں وہ اب واپس نہیں ملیں گی۔ جیسے گذشتہ چند سال پہلے "بی سی سی آئی" بینک میں ہوا۔ گویا کہ اس صورت میں نقصان سارا عوام کا ہوا، تاجر کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ "تجارتی سود" کے نتیجے میں جو ظلم ہوتا ہے اس نے "صرفی سود" کے ظلم کو بھی مات کر دیا ہے۔ اس لئے کہ تجارت میں پیسہ سارا عوام کا استعمال ہو رہا ہے، پھر اگر نفع ہو تو سرمایہ دار کا اور اگر نقصان ہو تو عوام کا۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ تو نقصان کی وہ صورت تھی جس میں بینک ہی دیوالیہ ہو جائے، لیکن اگر اس تجارت کے دوران سرمایہ دار کا جزوی نقصان ہو جائے۔ مثلاً اس نے کپڑا بنانے کے لئے روئی خریدی تھی اس روئی میں آگ لگ گئی تو اس نقصان کی تلافی کے لئے اس سرمایہ دار نے ایک دوسرا راستہ نکالا ہے۔ وہ

ہے ''انشورنس کمپنی'' وہ انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی، اور انشورنس کمپنی میں جو روپیہ ہے وہ بھی غریب عوام کا ہے۔ وہ عوام جو اپنی گاڑی اس وقت تک روڈ پر نہیں چلا سکتے جب تک انشورنس نہ کرالیں۔ عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، لیکن وہ بیمہ کی قسطیں ہر ماہ جمع کرانے پر مجبور ہیں۔ لہٰذا وہ سرمایہ دار انہی عوام کے پیسوں سے اپنے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔

سود کا ادنیٰ شعبہ اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے

یہ سارا گورکھ دھندا اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار کا ہو، اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اور اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جا رہی ہے، جو مالدار ہے وہ مالدار تر ہوتا جا رہا ہے، اور جو غریب ہے وہ غریب تر بنتا جا رہا ہے، انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ بَابًا أَدْنَاهَا كَالَّذِیْ يَقَعُ عَلٰى أُمِّهٖ))(۱)

''یعنی ربا کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، اور اس کا ادنیٰ ترین شعبہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرنا''

اَلْعِيَاذُ بِاللهِ، لہٰذا یہ کہنا کہ تجارتی سود میں ظلم نہیں یہ بالکل غلط ہے، اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ اجتماعی طور پر پوری قوم کو معاشی بدحالی کے اندر مبتلا کیا جا رہا ہے، آج پوری دنیا میں سودی نظام جاری ہے اور اس نظام نے پوری دنیا کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے، اور انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کھل جائے گی، اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآن کریم نے سود کے خلاف اعلان جنگ کیوں کیا تھا؟

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) الترغيب والترهيب، رقم: ۲۸٤۷ (۳/۵)، شعب الإيمان، رقم: ۵۵۲۰ (٤/۳۹٤)

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''سود لینے سے بخل بڑھتا ہے، کیونکہ سود لینے کا سبب ہی بخل ہے، جتنا سود لیتا ہے بخل اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرسکتا''(۱)

''بخل'' کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ مال کے بڑھنے سے اس سے استغناء پیدا ہو، اس کی حرص اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور مال کی محبت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ یعنی انسان کو کتنا ہی مال مل جائے وہ اس مال پر قناعت کرنے کے بجائے اور زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اور قاعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب مال بڑھ جائے تو طبیعت میں استغناء پیدا ہوجائے لیکن استغناء بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی خرچ کرنے کا داعیہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ مال کی محبت اور بڑھ جاتی ہے۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ وَادِيَانِ، وَلَوْ كَانَ لَهٗ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ))(۲)

''اگر ابن آدم کو سونے کی بھری ایک وادی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں، اور اگر دو وادیاں سونے کی بھری مل جائیں تو اس کی خواہش ہوگی کہ تین مل جائیں'' پھر آخر

☆ اصلاحی مجالس (۱۱۰/۵ تا ۱۲۱)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی۔

(۱) أنفاس عیسی: ص ۱۹۱

(۲) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال، رقم: ۵۹۵۹، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب لو أن لابن آدم واديين لابتغى ثالثا، رقم: ۱۷۳۸، سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء لو كان لابن آدم واديان من مال، رقم: ۲۲۵۹، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۵۶

میں خوبصورت حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ))

یعنی آدم کا پیٹ قبر کی مٹی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔ انسان کا پیٹ اسی وقت بھرے گا جب اس کے اندر مٹی بھرے گی، جب تک انسان قناعت پیدا نہ کرے اور مال کی محبت اس کے دل میں ترقی کرتی چلی جائے تو اس کے نتیجے میں اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

ایک سوداگر کا عجیب واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آں شنیدہ استی کہ در صحرائے غور
رختِ سالار افتادہ اسپ طور
گفت چشم تنگ دنیادار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

"میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں کہ غور کے صحراء میں ایک بہت بڑے سوداگر کا سامان خچر سے گرا پڑا تھا اور وہ خچر بھی مرا ہوا پڑا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوتھا۔ اور وہ سامان جو بکھرا پڑا تھا، وہ زبان حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو صرف دو چیزیں بھر سکتی ہیں، یا قناعت یا قبر کی مٹی، تیسری کوئی چیز اس کو پر نہیں کر سکتی"

بہر حال! بخل کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی حرص بڑھتی چلی جاتی ہے اور اتنی مال ہی مال کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے اور خرچ کرنے میں اور زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

ایک بڑے سرمایہ دار کا قول

کراچی میں ایک بہت بڑے سرمایہ دار ہیں اور پاکستان کے مشہور دو چار سرمایہ داروں میں سے ایک ہیں، ارب پتی اور کھرب پتی ہوں گے، ایک دن وہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت پیسہ دیا ہے، آپ نے بہت سے کارخانے بنائے، فیکٹریاں لگائیں، سب کچھ کر لیا، اب کچھ کام نفع کی خاطر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر کر لو، وہ یہ کہ تم ایک ایسا بینک قائم کر دو جو سود

کے بغیر کام کرے، تمہارے پاس چونکہ پیسہ ہے، اس لئے تم یہ کام کر سکتے ہو، وہ کہنے لگے کہ مولانا صاحب! وہ بینک پھر کیسے چلے گا؟ میں نے کہا ان شاء اللہ چلے گا، لیکن تم یہ سوچ کر قائم کر دو کہ جو پیسہ تم نے اس بینک میں لگا دیا وہ گیا، جب اللہ کے فضل سے تمہارے پاس اربوں کھربوں روپیہ موجود ہے، تو اگر اس بینک کے قیام پر چند کروڑ روپے لگا دو گے تو کیا فرق پڑے گا اور چند کروڑ روپے لگا کر ان کو بھول جاؤ۔ کہنے لگے کہ میں ان کو پھر بھول جاؤں؟ میں نے کہا کہ تم تو بھول جاؤ کہ وہ چند کروڑ روپے کہاں گئے، البتہ اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اس میں نفع بھی عطا فرما دیں گے لیکن تم اس کو بھول جاؤ۔ وہ آخر میں کہنے لگے کہ مولانا صاحب! بات تو آپ صحیح کہتے ہو مگر ہاتھ کی کھجلی کو میں کیا کروں!!

غریب اور امیر کے خرچ کرنے میں فرق

یہ ہے مال کو بڑھانے کی کھجلی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ یہ "بخل" بھی پھر رفتہ رفتہ کھجلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، پھر انسان کے پاس کتنا ہی پیسہ آجائے مگر اس کی حرص نہیں مٹتی، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جتنا غریب آدمی دو پانچ روپے اطمینان اور خوش دلی سے چندہ دیتا ہے، وہ مالدار جس کے پاس اربوں کھربوں روپیہ ہے، وہ اتنی خوش دلی سے نہیں دیتا، حالانکہ اس مالدار کے پاس گنجائش زیادہ ہے اور اس غریب کے پاس گنجائش بالکل نہیں، یہ سب حبِّ مال کا نتیجہ ہے۔

سود کی ذہنیت بخل پیدا کرتی ہے

اس "بخل" کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے، کیونکہ سود کا مطلب یہ ہے کہ کام کچھ نہ کرو اور نہ کوئی خطرہ مول لو اور پیسے کے اوپر پیسہ بناؤ۔ یہ بخیل کا کام ہے اور سود کی ذہنیت خود انسان کے اندر بخل پیدا کرتی ہے، دنیا میں جتنی سود خور قومیں گذری ہیں، سب سے زیادہ کنجوس بھی وہی قومیں ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم "یہودی" ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ﴾(۱)

"اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی"

آج بھی دنیا کا سارا سودی کاروبار ان یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اور یہی سب سے زیادہ کنجوس قوم ہے اور ساری دنیا میں ان کی کنجوسی کی شہرت ہے۔

---

(۱) النساء: ۱۶۱

یہودی ''شائی لاک'' کا قصہ

آپ نے ''شائی لاک'' کا قصہ سنا ہوگا، یہ روم کے بادشاہ کے زمانے کا قصہ ہے، ایک شخص یہودی تھا، اس کا نام ''شائی لاک'' تھا، ایک ضرورت منداس کے پاس پیسے لینے آیا، شائی لاک نے کہا کہ میں سود پر قرض دوں گا، چنانچہ اس نے سود پر اس سے کہا کہ اتنے دنوں کے اندر ادا کر دینا۔ قرض لینے والا غریب آدمی تھا، وہ اپنے کھانے پینے کی ضرورت کے لئے قرض لے رہا تھا، جب وہ دن پورے ہوگئے اور ادئیگی کی تاریخ آگئی تو شائی لاک اس کے گھر پیسے وصول کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ اس غریب نے کہا کہ میرے پاس تو اس وقت تھوڑے پیسے ہیں، چنانچہ اس نے اس کو کچھ پیسے دے دیئے اور کہا کہ اور نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں دے دیتا، شائی لاک نے کہا کہ اچھا وہ سود اب ڈبل ہوگیا اور ادا کرنے کی تاریخ مقرر کر دی۔ جب دوبارہ وہ تاریخ آئی تو شائی لاک پھر اس کے گھر پہنچ گیا، اس غریب نے کہا کہ تم نے تو سود ڈبل کر دیا، اس لئے اصل رقم لے لو، اس نے کہا کہ نہیں، میں تو پورا سود لوں گا اور اب میں تمہاری مدت نہیں بڑھاؤں گا، اس غریب نے کہا کہ میرے پاس ادا کرنے کے لئے رقم ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں، شائی لاک نے کہا کہ میں ایک اور تاریخ مقرر کرتا ہوں، اگر اس تاریخ پر تم نے روپیہ ادا نہ کیا تو تمہارے جسم کا ایک پونڈ گوشت نکالوں گا اور اس کو کھاؤں گا اور پیسے الگ لوں گا، جب وہ تاریخ آگئی اور وہ غریب سود ادا نہیں کر سکا تو شائی لاک اس کے گھر پر چھری چاقو لے کر پہنچ گیا۔

وہ غریب آدمی پریشان ہوگیا اور کسی طرح بچتے بچاتے روم کے بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا اور بادشاہ سے کہا کہ شائی لاک میرا گوشت کاٹنے آرہا ہے، چنانچہ اس کے بعد عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کو جیل میں بند کر دیا گیا، شائی لاک نے عدالت میں بڑی زوردار تقریر کی، اور اس تقریر میں اس نے کہا کہ میرے ساتھ آپ انصاف کریں، یہ شخص اتنے دونوں سے ٹال مٹول کر رہا ہے اور میرے پیسے نہیں دے رہا ہے، اور پھر اس نے آخر میں خود اپنی رضامندی سے اپنا گوشت کاٹنے کے لئے کہا تھا، اب عدالت کو چاہئے کہ وہ مجھے اس بات کی ڈگری دے کہ اس کا گوشت نکال لوں، اس لئے کہ انصاف کا تقاضا یہی ہے۔

وہ غریب مقروض تو جیل میں بند تھا اور عدالت میں نہیں آسکتا تھا، اس لئے اس کی بیوی عدالت میں آئی اور اس نے عدالت میں تقریر کی، اس تقریر میں اس نے کہا کہ شائی لاک یہ کہتا ہے کہ انصاف دلاؤ اور اس کے کہنے کے مطابق انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مقروض کا گوشت نکال کر کھایا

جائے، میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر ہم سب لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے لگیں تو ہمارا کہاں ٹھکانہ ہوگا، اس دنیا میں انصاف ہی سب کچھ نہیں، بلکہ ایک چیز رحم بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں گے تو تب ہم نجات پائیں گے، اس کے بغیر نجات نہیں پائیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس غریب کے حق میں رحم کی بنیاد پر فیصلہ دیا۔ بہرحال! شائی لاک کی طرح یہودی قوم ساری دنیا میں بخیل مشہور ہے۔

ہندو، سود خور قوم

دنیا میں دوسری سب سے بڑی سود خور قوم "ہندو" ہے۔ ہندو "بنیا" مشہور ہے، ہندوستان کے ہندو تاجر "بنیا" کہا جاتا ہے، ان کو "مہاجن" بھی کہتے ہیں، یہ سود لے کر کھانے والے ہیں، ان کی کنجوسی ضرب المثل ہے، ان کے ہاں ایک ایک پائی کا حساب و کتاب ہوتا ہے۔

ہندی زبان کی ایک ضرب المثل

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی ایک بڑے مزے کی "ضرب المثل" سنایا کرتے تھے، وہ یہ کہ:

"لالہ جی گئے پاؤنے، چار دن میں آئے، لالہ جی کے گھر آگئے چار پاؤنے، لالہ جی نہ گئے نہ آئے"

ہندو بنیے کو "لالہ جی" کہا جاتا تھا، "پاؤنے" کے معنی ہیں "مہمان"۔ یعنی لالہ جی کسی کے گھر مہمان بن کر چلے گئے اور چار دن اس کے گھر قیام فرمایا اور چار دن کے بعد واپس آئے، اس طرح چار دن کے کھانے کا خرچ بچ گیا، پھر ایک دن لالہ کے گھر چار مہمان آگئے، اب جو کچھ چار دن کے کھانے کی بچت ہوئی تھی وہ برابر ہوگئی، اس لئے لالہ جی نہ گئے اور نہ آئے۔

بہرحال! ان کے ہاں اس طرح کنجوسی کا حساب و کتاب رہتا ہے کہ ایک پائی نہ جانے پائے، درحقیقت سود کی ذہنیت یہ کنجوسی پیدا کرتی ہے۔

مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں

یاد رکھئے! جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پرواہ نہیں، اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے پاس جتنا پیسہ بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی اس کا بخل بڑھتا چلا جائے گا، اتنی ہی کی

اس کی حرص بڑھے گی اور پیسے خرچ کرتے ہوئے اس کی اتنی ہی جان نکلے گی۔ غریب آدمی اطمینان سے پیسہ خرچ کردے گا، لیکن بڑا سرمایہ دار جو سرمایہ پر سانپ بن کر بیٹھا ہے، وہ خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ یاد رکھئے! یہ مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں اور بخل کے نتیجے "حب مال" اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ دعا کثرت سے کریں

اس سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی اپنے آپ کو شریعت کا تابع بنائے اور قناعت دل میں پیدا کرے اور یہ دعا کرے کہ اے اللہ! جائز اور حلال طریقے سے آپ مجھے جتنا عطا فرمادیں گے، میرے لئے وہی نعمت ہے اور یہ دعا کرے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاخْلُفْ عَلٰی کُلِّ غَائِبَةٍ لِیْ مِنْكَ بِخَیْرٍ))(۱)

نبی کریم ﷺ کے ایک ایک لفظ پر آدمی قربان ہو جائے، فرمایا کہ اے اللہ! جو کچھ رزق آپ نے عطا فرمایا ہے، مجھے اس پر قناعت عطا فرمائیے اور مجھے اس میں برکت دے دیجئے، جب تھوڑے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمادیتے ہیں تو پھر وہ لاکھوں کروڑوں سے زیادہ فائدہ پہنچا دیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق میں برکت نہ ہو تو پھر کروڑوں اور لاکھوں بھی بیکار ہو جاتے ہیں، ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ آگے فرمایا کہ اے اللہ! جو مال میرے پاس موجود نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو، یعنی میں کتنا بھی غور و فکر کرلوں کہ میرے لئے کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری ہے، لیکن میری محدود فکر اور میری محدود سوچ کبھی بھی حقیقت حال تک پہنچنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی، لہٰذا اے اللہ! یہ معاملہ میں آپ کے اوپر چھوڑتا ہوں، یا اللہ! جو چیز میرے پاس نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو۔

حلال طریقے سے مال میں اضافے کی کوشش کرنا جائز ہے

لیکن یہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ سے قناعت کی دعا تو کریں لیکن جائز اور حلال طریقے سے اس مال میں اضافے کی کوشش کرنا قناعت کے منافی نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ خود حضور ﷺ نے

---

(۱) مصنف ابن أبی شیبة(۱۰۳/۷)، کنز العمال، رقم: ۵۰۹۴(۶۹۰/۲)، المستدرك علی الصحیحین، رقم: ۱۸۳۱(۴۲۴/٤)، الأدب المفرد، رقم: ۷۰۲(٤۹۲/۲)

تجارت کی ترغیب بھی عطا فرمائی، اگر حلال طریقے سے مال بڑھانا قناعت کے خلاف ہوتا تو آپ تجارت کی ترغیب نہ دیتے، اس سے پتہ چلا کہ حلال طریقے سے مال کو بڑھانے کی اجازت ہے۔ مگر یہ سوچتے ہوئے کہ جائز اور حلال طریقے سے اللہ تعالیٰ جتنا عطا فرمائیں گے وہ نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے استعمال کریں گے اور ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی فکر دل میں کبھی بھی پیدا نہیں کریں گے اور اس مال کی محبت کو دل پر غالب نہیں ہونے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ



اشیاء کی حلت وحرمت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّا نُرْسِلُ كِلَابًا لَنَا مُعَلَّمَةً قَالَ((كُلْ مَا أَمْسَكْنَ عَلَيْكَ)) قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَإِنْ قَتَلْنَ؟ قَالَ((وَإِنْ قَتَلْنَ مَا لَمْ يَشْرَكْهَا كَلْبٌ مِنْ غَيْرِهَا)) قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّا نَرْمِيْ بِالْمِعْرَاضِ قَالَ((مَا خَزَقَ فَكُلْ وَمَا أَصَابَ بِعَرْضِهٖ فَلَا تَأْكُلْ))(۱)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، یہ حاتم طائی کے بیٹے ہیں جو اپنی سخاوت میں مشہور ہیں، یہ پہلے نصرانی تھے بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شکار کا مشغلہ زیادہ رہتا تھا، اس وجہ سے صید کے باب میں ان سے کثرت سے روایات مروی ہیں۔

فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اپنے سدھائے ہوئے کتے جن کو شکار کی تربیت دی ہوئی ہوتی ہے شکار کرنے کے لئے چھوڑتے ہیں جب وہ کتے اس شکار کے جانور کو ہمارے پاس لاتے ہیں تو بعض اوقات وہ جانور اس وقت تک مر چکا ہوتا ہے تو اب شکار کو ہمارے لئے کھانا جائز ہے یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

☆ تقریر ترمذی (۱۲۵/۲ تا ۱۳۰) زیر نظر بیان سنن ترمذی شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے اشیاء کی حلت وحرمت کے اسلامی نظریہ پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الصيد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء ما يؤكل من صيد الكلب وما لا يؤكل، رقم: ١٣٨٥، صحيح البخاري، كتاب الذبائح والصيد، رقم: ٥٠٥٣، صحيح مسلم، كتاب الصيد والذبائح وما يؤكل...... ، رقم: ٣٥١٠، سنن النسائي، كتاب الصيد والذبائح، رقم: ٤١٩٠، سنن أبي داؤد، كتاب الصيد، رقم: ٢٤٦٤، سنن ابن ماجه، كتاب الصيد، رقم: ٣١٩٩، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ١٧٥٣٤، سنن الدارمي، كتاب الصيد، رقم: ١٩١٨

جس جانور کو وہ کتے تمہارے لئے روک کر لائے ہوں ان کو تم کھا سکتے ہو، یعنی کتے نے شکار کرنے کے بعد شکار کے جانور کھایا نہیں بلکہ اس کو تمہارے لئے روک کر رکھا ہے وہ تم کھا سکتے ہو، لیکن اگر کتے نے اس جانور میں سے خود کچھ کھالیا ہے تو اب اس شکار کو تم نہیں کھا سکتے''

اس لئے کہ اس صورت میں وہ جانور وَمَـآ اَكَـلَ السَّبُـعُ میں داخل ہو جائے گا۔ جس کے کھانے کی ممانعت قرآن میں آچکی ہے، اور اس کتے کا خود کھالینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ تمہارے لئے شکار نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نے اپنے لئے شکار کیا تھا، اس لئے اس کا کھانا تمہارے لئے جائز نہیں۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! چاہے ان کتوں نے اس جانور کو قتل ہی کر دیا ہو اور ہمیں ذبح کرنے کا موقع نہ ملا ہو تب بھی یہی حکم ہے، کہ اس جانور کا کھانا ہمارے لئے حلال ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اگر چہ ان کتوں نے جان سے مار دیا ہو تب بھی تمہارے لئے کھانا جائز ہے، جب تک ان کتوں کے ساتھ کوئی اور کتا شریک نہ ہو گیا ہو''

یعنی تم نے اپنا کتا ''بسم اللہ'' پڑھ کر شکار کی طرف چھوڑا اور جب اس نے جانور پر حملہ کیا تو اس وقت ایک دوسرا کتا بھی حملہ کرنے میں شریک ہو گیا اور دونوں نے ملکر شکار کو ہلاک کیا تو اس صورت میں وہ جانور کھانا تمہارے لئے جائز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تم نے اپنے کتے پر تو ''بسم اللہ'' پڑھی تھی لیکن دوسرے کتے پر نہیں پڑھی تھی، جبکہ جانور دونوں کے مشترکہ حملے سے ہلاک ہوا اس لئے یہ جانور تمہارے لئے حلال نہیں۔

اگر مشروع اور غیر مشروع دو سبب پائے جائیں تو جانور حلال نہیں

اس حدیث سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ اگر کسی جانور کی ہلاکت میں دو سبب جمع ہو گئے ہوں جس میں سے ایک سبب مشروع ہو اور دوسرا سبب غیر مشروع ہو تو اس صورت میں وہ جانور حلال نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک پرندے کو تیر مارا اور تیر کے لگنے کے بعد وہ پرندہ پانی میں گر گیا اور پانی کے اندر وہ مردہ ملا تو اب یہ معلوم نہیں کہ اس کی موت تیر لگنے کی وجہ سے واقع ہوئی یا پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے موت ہوئی۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر تیر لگنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی تو وہ جانور حلال ہوگا اور اگر پانی کی وجہ سے موت واقع ہوئی تھی تو وہ پرندہ حرام ہوگا لیکن چونکہ یہاں دو

سبب ہلاکت ایک ساتھ جمع ہوگئے تھے اس لئے وہ جانور حرام ہوگا اور اس کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔

حلت اور حرمت کے بارے میں بنیادی اصول

اس مسئلہ کی بنیاد ایک بنیادی اصول پر ہے، وہ یہ کہ گوشت میں اصل حرمت ہے اور گوشت کے علاوہ دوسری اشیاء میں اصل حلت اور اباحت ہے، لہٰذا دوسری اشیاء اس وقت تک جائز اور مباح سمجھی جائیں گی جب تک ان میں دلیل حرمت یقینی طور پر نہ پائی جائے۔ مثلاً روٹی کے اندر اصل حلت اور اباحت ہے، چاہے وہ روٹی تم نے کسی کافر سے خریدی ہو اس روٹی کو کھانا تمہارے لئے حلال ہے جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کہ اس میں کوئی نجس اور حرام چیز شامل کی گئی ہے، البتہ جب یہ ثابت ہوجائے کہ اس میں فلاں حرام یا نجس چیز شامل کی گئی ہے تو اس وقت وہ روٹی حرام ہوجائے گی، لیکن گوشت میں اصل حرمت ہے، جب تک اس بات پر دلیل قائم نہ ہوجائے کہ یہ جانور مشروع طریقے سے ذبح کیا گیا ہے اس وقت تک اس جانور کے گوشت کو حرام سمجھا جائے گا، لہٰذا اگر کوئی کافر گوشت فروخت کررہا ہو تو جب تک دلیل شرعی سے ہمیں یہ معلوم نہ ہوجائے کہ یہ جانور مشروع طریقے سے ذبح کیا گیا ہے اس وقت تک اس گوشت کو خرید کر کھانا ہمارے لئے جائز نہیں، لہٰذا گوشت کو حلال کہنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور دوسری اشیاء کو حرام قرار دینے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوگی، حلت اور حرمت کے بارے میں یہ بہت اہم اصول ہے جو ذہن میں رہنا چاہئے۔

صرف احتمال کی بنیاد پر اشیاء کو حرام نہیں کہا جائے گا

آج کل غیر مسلم ممالک میں خاص طور پر یہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے اور اللہ بچائے اب تو مسلم ملکوں میں بھی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، وہ یہ کہ غیر مسلم ممالک میں بہت سی ایسی چیزیں فروخت ہوتی ہیں جن کے اندر کسی نجس یا حرام چیز کے شامل ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ان اشیاء میں مندرجہ بالا اصول سے یہ مسئلہ نکل آئے گا کہ اگر گوشت کے علاوہ کوئی چیز ہے اور اس چیز کے بارے میں شک ہورہا ہے کہ اس میں کوئی ناجائز چیز تو نہیں ملی ہوئی، تو جب تک اس میں حرام یا ناجائز چیز شامل ہونے کا یقین حاصل نہ ہوجائے اس وقت تک اس چیز کو کھانا جائز ہے۔ مثلاً ڈبل روٹی ہے، بعض ڈبل روٹیوں کے بارے میں یہ سننے میں آیا ہے کہ اس میں کوئی نجس یا حرام چیز شامل ہوتی ہے، مثلاً بعض اوقات ڈبل روٹی پر مردار کی چربی لگادیتے ہیں، لیکن ڈبل روٹی میں چونکہ اصل حلت ہے لہٰذا جب

تک ہمیں یقین سے یہ معلوم نہیں ہو جائے گا کہ اس ڈبل روٹی میں فلاں حرام اور نجس چیز شامل ہے اس وقت تک ڈبل روٹی کھانے کی گنجائش ہے اور ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ڈبل روٹی کو کھا سکتے ہیں، اور بہت زیادہ کنج کاؤ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر یقین سے یہ معلوم ہو جائے کہ بازار میں کوئی بھی ڈبل روٹی ایسی نہیں ہے جو کسی نہ کسی نجس اور حرام چیز کی آمیزش سے خالی ہو تو اس صورت میں ڈبل روٹی کھانا جائز نہیں ہوگا۔

ڈبوں میں پیک شدہ گوشت

لیکن گوشت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لئے کہ جب تک یقین سے معلوم نہ ہو جائے کہ یہ گوشت مشروع طریقے پر ذبح کئے ہوئے جانور کا ہے اس وقت تک اس گوشت کو کھانا جائز نہیں۔ لہٰذا آجکل ڈبوں میں جو پیک شدہ گوشت آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ سے آتے ہیں افسوس یہ کہ آجکل سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں بھی ان کا بہت رواج ہے، ان ڈبوں پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہوتی ہے:

"مذبوح علی الطریقة الاسلامیة"

اس عبارت سے دھوکہ کھا کر مسلمان اس گوشت کو استعمال کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس ڈبے کے اوپر صرف اس عبارت کے لکھے ہونے سے یہ یقین حاصل نہیں ہوتا کہ واقعۃً اس کو اسلامی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے۔ جب تک یہ تحقیق نہ کر لی جائے کہ یہ عبارت لکھنے والا کون ہے؟ اور کس بنیاد پر اس نے یہ لکھا ہے اور واقعۃً اس کو شرعی طریقے پر ذبح کیا گیا ہے یا نہیں؟ اس وقت تک اس ڈبے میں پیک شدہ گوشت کو کھانا جائز نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک مہر ہوتی ہے جو ڈبے پر لگا دیتے ہیں، حتیٰ کہ مچھلی کے ڈبے پر بھی "مذبوح علی الطریقة الاسلامیة" کی مہر لگی ہوئی دیکھی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی مہر کا کیا اعتبار ہے۔

اب مندرجہ بالا مسئلہ غیر مسلم ممالک کے گوشت کا ہے لیکن جہاں مسلمان ہوں تو چونکہ مسلمانوں کے ظاہر حال کے مشروع طریقے پر ہی محمول کیا جاتا ہے، اس لئے وہاں ظاہر حال سے یہی سمجھا جائے گا کہ یہ مذبوح گوشت ہے، لہٰذا اس کی تحقیق کرنا واجب نہیں۔ البتہ ایسے شہر میں جہاں زیادہ تر غیر مشروع گوشت کا رواج ہے اور وہ مسلمانوں کا شہر ہے اس صورت میں بھی تحقیق کرنا واجب ہے، بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

گوشت اور دوسری اشیاء میں فرق کی وجہ

یہ جو اصول میں نے بتایا کہ دوسری اشیاء میں اصل حلت ہے اور گوشت ہی اصل حرمت ہے، ان دونوں میں فرق کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ گوشت جانور کا ہوتا ہے اور زندہ جانور باجماع حرام ہے اور جانور اس وقت حلال ہوتا ہے جب وہ مشروع طریقے پر ذبح کرلیا جائے، لہٰذا جانور میں اصل حرمت ہے۔ اس حرمت کو زائل کرنے کے لئے شریعت نے ذبح کا ایک مخصوص طریقہ بتادیا کہ یہ طریقہ اختیار کرو گے تو جانور حلال ہوجائے گا، اور یہ طریقہ اختیار نہیں کرو گے تو جانور حلال نہیں ہوگا بلکہ حرمت باقی رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانور میں اصل حرمت ہے، جب تک اس کو صحیح طریقے پر ذبح کئے جانے کا علم نہ ہوجائے۔

بہرحال! حدیث باب میں حضور ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے یہ جو فرمایا کہ تم اپنے کتے کے شکار کئے ہوئے جانور کو کھاسکتے ہو جب تک اس کتے کے ساتھ کوئی دوسرا کتا شریک نہ ہوگیا ہو۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ چونکہ جانور میں اصل حرمت ہے اور جب شکار کے وقت دوسرا کتا بھی شامل ہوگا تو اب یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اس جانور کی ہلاکت آپ کے بھیجے ہوئے کتے کے حملہ کرنے سے ہوئی یا کسی دوسرے کتے کی وجہ سے ہلاکت واقع ہوئی تو اب شبہ پیدا ہوگیا کہ وہ جانور مشروع طریقے سے ہلاک ہوا یا غیر مشروط طریقے سے ہلاک ہوا۔ اس شبہ کی وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ جانور میں حرمت آجائے گی اس لئے کہ وہ تو پہلے سے حرام تھا بلکہ حلت آنا بند ہوجائے گی۔

صرف شک وشبہ کی وجہ سے حرمت نہیں آتی

اور جن اشیاء میں اصلاً اباحت ہوتی ہے ان میں صرف شک وشبہ کی وجہ سے حرمت نہیں آتی جب تک کہ حرمت کا یقین نہ ہوجائے، چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں مشہور واقعہ آیا ہے کہ آپ ایک جنگل اور بیابان سے گزر رہے تھے، راستے میں وضو کے لئے پانی کی ضرورت پیش آئی تو ایک حوض راستے میں نظر آیا، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ سامنے سے حوض کا مالک آرہا ہے، اس سے آپ نے یہ پوچھنا شروع کردیا:

"يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ؟"

''کیا تمہارے حوض پر درندے پانی پینے کے لئے آتے ہیں؟''

ان کے سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر درندے پانی پینے کے لئے آتے ہوں گے تو ان کا جھوٹا اس حوض کے پانی میں گرتا ہوگا اور اس کی وجہ سے حوض کا پانی ناپاک ہوگا تو اس سے وضو کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اس سے پہلے کہ حوض والا کچھ جواب دیتا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

"يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ، لَا تُخْبِرْنَا"

''ہمیں یہ مت بتانا کہ اس حوض پر درندے آتے ہیں یا نہیں؟'' (۱)

آپ نے اس کو بتانے سے اس لئے منع فرمادیا کہ پانی کے اندر اصل طہارت ہے اور اصلاً اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے، لیکن یہ حوض کھلا ہوا تھا اس لئے شک پیدا ہوگیا کہ اس پر درندے پانی پینے کے لئے آتے ہوں، اس شک کی وجہ سے طہارت اصلیہ زائل نہیں ہوگی، اس لئے اس پانی کو نجس نہیں کہا جائے گا جب تک کہ نجس ہونے کا یقین حاصل نہ ہوجائے۔ لہٰذا اگر حضرت عمرو بن العاصؓ کے سوال کے جواب میں صاحب حوض یہ کہہ دیتا کہ ہاں کبھی کبھار درندے حوض پر آتے ہیں تو اس کی وجہ سے بھی شک پیدا ہوجاتا اور شک کی بنیاد پر پانی تو ناپاک نہ ہوتا لیکن خوامخواہ دل میں وسوسے پیدا ہوتے کہ معلوم نہیں وضو درست ہوا یا نہیں؟ اس لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے "يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ، لَا تُخْبِرْنَا" کہہ کر اس شک اور وسوسے کی جڑ ہی کاٹ دی۔

زیادہ تحقیق میں بھی نہیں پڑنا چاہئے

اس سے معلوم ہوا کہ اشیاء مباحہ میں اگر شک پیدا ہوجائے تو اس شک کی وجہ سے وہ چیز حرام نہیں ہوتی، اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے پتہ چلا کہ کسی چیز کی بہت زیادہ تحقیق اور کاوش کرنا بھی ضروری نہیں کہ انسان ہر چیز کی کھود کرید میں لگ جائے کہ اس چیز کے اندر کیا حرام چیز شامل ہے؟ فلاں چیز میں کیا اجزاء ہیں؟ اس لئے کہ جب شریعت نے تمہیں شک کے باوجود اس چیز کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو پھر یہ ناواقفیت بھی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کو تحقیق کرکے زائل کرنے کی کوشش مت کرو۔

بعض لوگوں کو اس کا ذوق ہوتا ہے کہ ہر چیز کی بال کی کھال نکالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، مثلاً یہ کہ ڈالڈا گھی میں فلاں چیز شامل ہے اور اب اس کی تحقیق کے پیچھے پڑ گئے، حضرت والد

(۱) مؤطا امام مالك، كتاب الطهارة، باب لا بأس به الا أن يرى على فمها نجاسة، رقم: ۳۹

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ اس تحقیق میں لگے ہوئے تھے کہ ڈالڈا گھی میں ایسی چیز شامل ہے جو نجس یا حرام ہے۔ روزانہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کبھی اخبار لاکر دکھاتے، کبھی کچھ لاکر دکھاتے اور بتاتے کہ دیکھئے اخبار میں یہ آیا ہے، فلاں رسالے میں یہ آیا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ میں اس کو نہیں پڑھتا، اس کو واپس لے جاؤ، تم خود پڑھ لینا۔

بہر حال ان اشیاء میں عموم بلوئی ہے، ساری قوم اس کے اندر مبتلا ہے اور ہم اس کے مامور بھی نہیں کہ بلا وجہ بہت زیادہ کھود کرید کریں اس لئے کہ اگر بہت زیادہ کھود کرید کی جائے گی تو دنیا میں کوئی چیز حلال نہیں رہے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



حرام مال سے بچیں اور ہمیشہ سچ بولیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((أَرْبَعٌ إِذَا كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا حُسْنُ خَلِيْقَةٍ وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ وَصِدْقُ حَدِيْثٍ وَحِفْظُ أَمَانَةٍ))(۱)

''حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں یہ چار صفات موجود ہوں اسے دنیا کی کسی چیز کی محرومی نقصان نہیں پہنچا سکتی، پہلی چیز امانت کی حفاظت، دوسری بات کی سچائی، تیسری اچھے اخلاق اور چوتھی حلال کھانا''

یہ چار خصلتیں جو بیان فرمائیں کہ اگر عطا ہو جائیں تو دنیا کی اور کوئی نعمت نہ ملے تب بھی تمہاری بھلائی کے لئے یہ چار چیزیں کافی ہیں۔

ان میں سے پہلی چیز یعنی حسن اخلاق اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دوسری چیز جو بیان فرمائی گئی وہ ہے لقمہ کی پاکیزگی، آدمی جو کچھ کھا رہا ہے جو رزق اس کو ملا ہوا ہے وہ پاکیزہ ہو۔

مال کی پاکیزگی سے کیا مراد ہے؟

پاکیزہ ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض دیکھنے میں صاف ستھرا ہو جراثیم سے پاک ہو یہ چیز

☆ ضبط و تحریر: محمد اویس سرور تاریخ ضبط: ۲۳ مارچ ۲۰۰۹ء

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند عبد الله بن عمرو بن العاص، رقم: ٦٣٦٥، كنز العمال، رقم: ٤٣٤١٣ (١٥/٨٥٨)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (١٠٧/٢)، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، رقم: ١٨١٢٣ (١١/٢٠٥)، شعب الإيمان، رقم: ٤٨٠١ (٤/٢٠٥)، الترغيب والترهيب، رقم: ٤٤٣٩ (٣/٣٦٥)، الدر المنثور (٢/٥٧٢)

تو ہونی ہی چاہئے کہ انسان صاف ستھرا کھانا کھائے۔ لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ وہ حلال ہونا جائز اور حرام کھانے سے انسان پرہیز کرے۔ اور رزق حلال کو حاصل کرنا اور اپنے رزق میں حلال ہونے کا اہتمام کرنا یہ ایمان کے بنیادی ستونوں میں سے ہے۔ کہ آدمی اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ جو لقمہ میں کھا رہا ہوں وہ حلال لقمہ ہو، کیونکہ حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّهُ لَا يَرْبُو لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ إِلَّا كَانَتِ النَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ)) (۱)

''انسان کے جسم پر جو گوشت حرام کھا کر بنا ہوگا ہو وہ جہنم کا ایندھن ہے''

ظاہر ہے کہ انسان جب حرام کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی بڑھوتی ہوتی ہے، نشوونما ہوتی ہے۔ اسی سے گوشت بنے گا، جسم کے دوسرے اعضاء بنیں گے، اس سے جسم کے اندر قوت آئے گی۔ تو جو کوئی گوشت حرام مال سے اور حرام کھانے سے بنا گا ہو تو جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے وہ جہنم کا ایندھن بنے گا، اس واسطے ہر مومن کو اس بات کا اہتمام لازم ہے کہ جو کچھ وہ کھا رہا ہے اس کے حلال ہونے کا پورا اطمینان حاصل ہو کہ کوئی حرام چیز اپنے حلق سے پیٹ میں نہ جائے۔

حرام مال کی دنیاوی بے برکتی

حرام رزق کا جو وبال آخرت میں ہے وہ تو ہے، جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ گوشت جہنم کا ایندھن بنے گا۔ لیکن اس دنیا میں بھی حرام کی بے برکتی اللہ تبارک وتعالیٰ دکھا دیتے ہیں۔ حرام طریقے سے کمایا ہوا پیسہ اور حرام کھانا دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو ایک عذاب بنا دیتے ہیں۔ بظاہر انسان کے پیسے بہت اکٹھے ہو گئے، بینک بیلنس بہت ہو گیا لیکن مصیبتیں آ رہی ہیں، آفتیں آ رہی ہیں، کبھی چوریاں ہو رہی ہیں، کبھی ڈاکے پڑ رہے ہیں، کبھی کوئی اغوا ہو رہا ہے، کبھی بیماریاں کھڑی ہو گئی ہیں اور کبھی کوئی پریشانیاں کھڑی ہو رہی ہیں تو یہ ساری بے برکتیاں پیدا ہو رہی ہیں حرام رزق سے اور حرام مال سے۔

تو ایک نقصان دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ انسان کے مال میں برکت نہیں ہوتی، پیسے گنتی میں تو بہت ہو گئے لیکن برکت نہیں۔ آج کل اچھے بڑے کھاتے پیتے لوگ جن کی آمدنیاں بہت ہیں مگر یہ شکوہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ پورا نہیں ہوتا، پورا اس لئے نہیں ہوتا کہ اس بات کا دھیان نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق رزق حاصل ہو اس کے خلاف جو حاصل ہوگا وہ تو پورا نہیں ہوگا اس میں تو برکت نہیں ہوگی۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الجمعة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، كتاب ما ذكر في فضل الصلاة، رقم: ٥٥٨، مسند أحمد، رقم: ١٣٩١٩، ١٤٧٤٦

حرام مال کا سب سے بڑا نقصان

دوسری اس سے بھی خطرناک بے برکتی یہ ہے کہ حرام گوشت حرام کھانا حرام رزق انسان کے اندر سے ایمان کی حِس سلب کر لیتا ہے، اللہ بچائے۔ ایمان کا جو شعور ہے جو حس ہے وہ چھن جاتی ہے، اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، عقل خراب ہو جاتی ہے عقل الٹی ہو جاتی ہے، برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اچھے کو برا سمجھنے لگتا ہے، اور اس کا احساس ان حضرات کو ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کا شعور عطا اور نور عطا فرمایا، ان کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم سے کیا چیز چھن گئی۔ اگر حرام کا ذرا سا بھی غبار آ جائے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ دل کے اندر ایک تاریکی اور ظلمت چھا گئی، اندھیرا چھا گیا۔

مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے ان کا واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جا کر کھانا کھا لیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے، فرماتے ہیں کہ میں مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے، اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کر لوں فلاں گناہ کر لوں، حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم میں بہترین انداز میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً﴾ (۱)

"اے رسولو پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب انسان حلال کھانے کا اہتمام کرتا ہے تو اس میں نیک کام کرنے کے جذبے اور شوق پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر حرام رزق کھا رہا ہے تو اس سے انسان کے دل میں برائیوں کے اور گناہ کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک کام کو برا سمجھ رہے ہیں کہ یہ کام اچھا نہیں ہے پھر بھی چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی حوصلہ نہیں ہوتا، وہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اپنے رزق اور لقمہ کو حلال کرنے کی فکر نہیں اور نہ جانے کن کن طریقوں سے ناجائز رزق منہ میں جاتا ہے اور پیٹ میں

---

(۱) المومنون: ۵۱

جاتا ہے، تو وہ گناہ کے تقاضے پیدا کرتا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک کنکشن رکھا ہے رزق حلال میں اور نیکیوں میں اور رزق حرام میں اور گناہوں میں۔ جب رابطہ جوڑ لیا رزق حرام سے تو گویا کہ گناہوں سے رابطہ جوڑ لیا، گناہوں کے ساتھ رشتہ لگ گیا گناہ کے تقاضے پیدا ہوگئے چھوڑنا آسان نہیں رہتا۔

تو دنیا کے اندر رزق حرام کے جو نقصانات ہیں ان میں تو ایک ہے بے برکتی، روپیہ تو بہت جمع ہوگیا لیکن کام پورے نہیں ہورہے، اور دوسرا خطرناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں گناہوں کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں ظلمت اور تاریکی آتی ہے اور ظلمت کا احساس شروع میں ہوتا ہے ان لوگوں کو جن کے دل پاک صاف ہوتے ہیں ذرہ سی بھی ظلمت آگئی تاریکی آگئی تو پتہ چلتا ہے، لیکن اللہ بچائے جب حس ہی مٹ جائے بے حس ہوجائے تو اس ظلمت کا تاریکی کا پتہ ہی نہیں چلتا، آدمی کے گناہ کے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اسے احساس ہی نہیں ہوتا۔

حرام مال بے حسی پیدا کرتا ہے

صاحب ایمان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی صاحب ایمان سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے، انسان ہے کبھی کوئی گناہ ہوگیا، تو اس کے دل میں اتنی ندامت ہوتی ہے شرمندگی ہوتی ہے کہ اس کو وہ اپنا کیا ہوا گناہ ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے، اور ندامت وشرمندگی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے روتا ہے گڑگڑاتا ہے، یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ لیکن جب بے حسی پیدا ہوجائے غفلت پیدا ہوجائے تو اسوقت حالت یہ ہوتی ہے کہ گناہ کرتا ہے دل میں یہ خیال آیا کہ بھائی تم نے یہ گناہ کا کام کیا فوراً اس خیال کو جھٹک دیا جیسے ایک مکھی ناک پر آکر بیٹھی اور اس کو اڑادیا۔ تو پھر رفتہ رفتہ بے پرواہ ہوجاتا ہے غافل ہوجاتا ہے، اور گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور ذرا سا بھی احساس باقی نہیں رہتا۔

حرام کھانے والے کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں

تیسرا نقصان حرام رزق کا نبی کریم ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ جب آدمی کا رزق حلال نہ ہو تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے بال پراگندہ اور جسم غبار آلود اور بڑی لجاجت سے اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں کہ یا اللہ یہ کام کردیجئے یا رب یہ کام کردیجئے، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان کا کھانا حرام کا ہے، ان کا لباس حرام کا اور ان کا جسم حرام

روپے سے پرورش پایا ہوا تو بتاؤ ایسے لوگوں کی دعا کیسے قبول ہو؟"(۱)

تو تیسرا نقصان دنیا ہی میں یہ ہے کہ دعائیں مانگ رہا ہے لیکن قبول نہیں ہورہیں، اب کتنے لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ دعائیں تو بہت کیں لیکن قبول نہیں ہوتیں کسی بھی طرح، تو بتاؤ قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دھیان نہیں ہے کہ رزق جو کھا رہا ہے اس کے اندر حرام کی آمیزش ہے، تو اس کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ تو دنیا ہی میں بے برکتی تاریکی اور گناہوں کا جذبہ پیدا ہونا اور تیسرا دعاؤں کا قبول نہ ہونا دنیا ہی کے اندر یہ انجام ظاہر ہو جاتے ہیں آخرت میں جو عذاب ہوگا وہ علیحدہ ہے۔

رزق کے حرام ہونے کی مختلف صورتیں

رزق کے حرام ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض حرام تو ایسے ہیں جو ہر انسان جانتا ہے۔ مثلاً چوری کرکے مال حاصل کرے ڈاکہ ڈال کے کرے، سود کھائے جوا کھیلے یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان جانتا ہے کہ حرام ہیں۔ لیکن بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں ہمیں اندازہ نہیں خیال نہیں توجہ نہیں دھیان نہیں کہ یہ رزق حرام کا آرہا ہے، ہے حرام مگر دھیان نہیں توجہ نہیں۔

جھوٹ بول کر چیز بیچنا حرام ہے

مثلاً تاجر ہے تجارت کر رہا ہے سامان بیچ رہا ہے اور اس میں غلط بیانی کرکے ملاوٹ کی اور غلط قسم کا سامان دھوکہ دیکر بیچ دیا، تو دھوکہ دیکر جو سامان بیچا تو اس سے جو پیسے حاصل ہوئے جو آمدنی آئی وہ حرام کی ہوئی، کیونکہ دھوکہ دیکر حاصل کی گئی۔ ایک چیز کسی ملک کی بنی ہوئی نہیں ہے اور آپ نے یہ جھوٹ بولا کہ یہ فلاں ملک کی بنی ہوئی ہے اور وہ سامان بیچ دیا، تو جھوٹ بولا دھوکہ دیا تو اس کے نتیجے میں جو آمدنی حاصل ہوئی ہو حلال نہ ہوئی، تو اب جو کھانا کھا رہے ہیں وہ حلال نہیں کھا رہے ہیں تو رزق حرام ہوگیا۔ اس کی طرف بھی دھیان نہیں۔

ملازمت میں کام چوری حرام ہے

مثلاً ایک شخص کسی جگہ ملازم ہے تو جو ڈیوٹی کے جو اوقات ہیں آٹھ گھنٹے ہیں وہ پورے کے

(۱) صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، رقم: ١٦٨٦، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب من سورة البقرة، رقم: ٢٩١٥، مسند أحمد، رقم: ٧٩٩٨، سنن الدارمي، كتاب الرقاق، باب في أكل الطيب، رقم: ٢٦٠١

پورے ملازمت کے کام میں صَرف کرے، اب کوئی آدمی ان آٹھ گھنٹوں میں سے وقت بچاتا ہے، دیر سے جاتا ہے اور جلدی واپس آجاتا ہے اور بیچ میں بھی اپنے ذاتی کام کررہا ہے محکمے کے کام کرنے کے بجائے یا ملاقات کرنے کے لئے اٹھ کر چلا گیا چاہے نفل پڑھنے کے لئے چلا گیا تو اس کے لئے یہ ناجائز ہے حرام ہے۔ فرض نماز تو ٹھیک ہے لیکن نوافل پڑھنے کے لئے یا اگر کوئی تلاوت کرنے کے لئے آگیا ڈیوٹی کے اوقات میں تو یہ اس کے لئے حرام ہے۔ اتنی مدت کی جو تنخواہ ہوئی وہ حرام ہے ناجائز ہے۔ جب وہ تنخواہ میں شامل ہوگیا تو آپ کو پتہ ہے اگر ایک بالٹی رکھی ہوئی ہو پانی کی اور اس میں ایک قطرہ پیشاب کا ڈال دیا جائے تو وہ ایک چھوٹا سا قطرہ لیکن پوری بالٹی کو گندا کرے گا کہ نہیں؟ پوری بالٹی کو ناپاک بنادے گا تو یہ حرام مال چاہے تھوڑا سا ہی ہو لیکن جب انسان کے رزق میں شامل ہوگیا تو اس نے حرام ہونے کی نجاست پھیلا دی اور نجاست کے پھیلانے کے نتیجے میں انسان جو رزق کھا رہا ہے وہ حرام ہوگیا اور حرام کی بے برکتی شامل ہوگئی۔

اب دیکھیں کہ ہم لوگ کتنے اس میں مبتلا ہیں کہ نوکری کی ہوئی ہے اور نوکری کے اندر وقت پورا نہیں دیتے۔ اپنے ذمے جو فرائض ہیں ان کو پوری طرح ادا نہیں کرتے، تو وہ جو تنخواہ مل رہی ہے وہ تنخواہ حلال نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، لیکن کتنے مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔ ہم لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ ہم یہ غلط کررہے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے کا اصول

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مدرسہ تھا جس میں اساتذہ تھے اور ان کو تنخواہیں ملتی تھیں، تو وہاں پہلے دن سے یہ قاعدہ تھا کہ ہر استاد جس کے ذمے کوئی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے کہ وہ ایک گھنٹہ سبق پڑھائے گا، تو اگر کوئی مدرسے کے اوقات میں ملنے کے لئے آگیا تو اسی وقت ٹائم نوٹ کرلیا کہ اتنے وقت سے لے کر اتنے وقت تک میں اپنے مہمان کے ساتھ ذاتی گفتگو میں مصروف رہا، اور مدرسے کا کام چھوڑ دیا اور اپنے ذاتی کام میں لگا رہا۔ تو جب تنخواہ لینے کا وقت آتا تو پورا حساب کرکے تنخواہ دینے والے کو دیتے تھے کہ اتنے دن میں نے اپنے کام میں صَرف کئے تھے، لہٰذا اتنے پیسے میری تنخواہ میں سے کاٹ لئے جائیں۔ کیونکہ یہ میری تنخواہ حلال نہیں ہوگی۔ یہ کام حضرت کے ہاں مستقل تھا ہر شخص یہ کام کرتا تھا۔

الحمد للہ ہمارے ہاں دارالعلوم میں بھی یہ کام ہے کہ جو استاد ہے وہ اپنا آنے کا وقت رجسٹر میں درج کرتا ہے کہ فلاں وقت میں حاضر ہوا اتنی دیر ہوگئی، تو پورے مہینے کا حساب لگا کر اتنے وقت

کی تنخواہ کاٹی جاتی ہے۔ تو یہ اس لئے کہ اگر اس وقت یہ تنخواہ آدمی وصول کرلے تو وہ تنخواہ حرام ہوگئی۔ اور حرام ہونے کے نتیجے میں یہ ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

آج زمانہ ایسا آگیا کہ ہر شخص اپنے فائدے کی چیز حاصل کرنے کی فکر میں ہے حقوق مانگتا ہے کہ ہمارے حقوق ملنے چاہئے لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس کے ذمے جو دوسروں کے حقوق ہیں وہ پورے کر رہا ہے کہ نہیں۔ آج لوگوں کو یہ حدیث تو بڑی یاد ہے:

((أَعْطُوا الَاجِيرَ أُجرَهُ قَبْلَ أَنْ يَّجُفَّ عَرَقُهُ)) (۱)

"یعنی مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"

تو کوئی کہیں مزدوری کرتا ہے نوکری کرتا ہے تو یہ حدیث خوب یاد ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے میری مزدوری ملنی چاہئے۔ تو ایک صاحب نے مجھ سے یہ ذکر کیا تو میں نے کہا ٹھیک ہے بھائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو لیکن تم یہ دیکھو کہ پسینہ نکلا بھی ہے کہ نہیں اگر پسینہ نکلا ہی نہیں تو خشک ہونے سے پہلے کہاں سے ادا کرو، تو جتنی تمہاری ذمہ داری ہے وہ تو پوری کرو، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے بعد اجرت کا مطالبہ کرو تمہیں حق پہنچتا ہے، لیکن یہ کہ اپنے فرائض میں تو ہے کوتاہی، اپنے فرائض تو صحیح طور سے ادا نہیں کر رہے دیر سے پہنچ رہے ہیں وقت ضائع ہو رہا ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں ہمارے حقوق ملنے چاہئے، تو قرآن اور حدیث اس طریق کار کی اجازت نہیں دیتے یہ حرام راستہ ہے۔ تو اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے آدمی یہ دیکھے کہ جو بھی میرا ذریعہ آمدنی ہے چاہے وہ تجارت ہو چاہے ملازمت ہو یا کسی خدمت کے ذریعے ہو کسی ڈیوٹی کے ذریعے ہو میں اس کا حق ادا کر رہا ہوں کہ نہیں؟ اگر کر رہا ہے تو بیشک رزق حلال ہے اور اگر نہیں کر رہا ہے تو رزق کے اندر حرام شامل ہو رہا ہے، اور یہ ساری بے برکتیاں پیدا ہو رہی ہیں جو معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔

بے برکتی اور بدعنوانی کا عذاب

اب کئی مرتبہ لوگ آکر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ جی ہمارے محکمے میں لوگ ہیں وہ آتے ہیں اور دو تین گھنٹے گزارتے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں کہ حاضری پوری لگاؤ اور وقت پورا درج کرو۔ تو ہمیں حاضری لگانے پر مجبور کرتے ہیں، تو جب میں نے ان کو بتایا کہ یہ جائز نہیں کہ کام کچھ ہوتا نہیں اور تنخواہ لینے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ساری حرام آمدنی ہے اور یہ جو بے برکتی آپ دیکھ رہے ہیں یہ

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب أجر الأجراء، رقم: ٢٤٣٤

سب اس حرام آمدنی کی وجہ سے ہے۔ یہ جو لوٹ مار مچی ہوئی ہے کسی کی جان مال آبرو محفوظ نہیں یہ ویسے تو نہیں آتے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان دیکھے اسباب ہوتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں وہ اسباب نظر نہیں آرہے لیکن حقیقت میں یہ عذاب ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہے اس حرام خوری کا۔ قوم کی قوم کرپشن میں مبتلا ہوگئی ہے، قوم کی قوم رشوت خور ہوگئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ساری قوم سزا بھگت رہی ہے اور یاد رکھو اس حرام آمدنی کا فائدہ حقیقت میں دیکھو تو کسی کو نہیں پہنچتا سب مصیبت کا شکار رہتے ہیں۔ جو آدمی ایک جگہ سے رشوت لیتا ہے اسے دس جگہ پر رشوت دینی بھی پڑتی ہے، اگر حساب لگا کہ دیکھو تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ بھی نہیں ملا، یہاں ایک جگہ کسی نے رشوت لی ہے اور دس جگہ دینی پڑی، نتیجہ بے برکتی اور ظلمت علیحدہ گناہ کا ایک سیلاب اُنڈا ہوا ہے اس کی وجہ سے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے اس کی اہمیت ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے۔ لقمہ ہمارے منہ میں جارہا ہے کم از کم اس کی فکر ہو کہ وہ حلال کا ہو حرام نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ کی شدتِ احتیاط

ایک مرتبہ حضور ﷺ ایک جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے، وہاں سے واپس آرہے تھے تو قریب میں ایک خاتون کا گھر پڑتا تھا، اس خاتون کے دل میں یہ بات آئی کہ حضور ﷺ یہاں قریب میں تشریف لائے ہوئے ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ حضور ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کردوں کہ آپ کچھ دیر کے لئے میرے گھر میں تشریف لے آئیں اور کچھ تناول فرمالیں، تو حضور ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے گھر میں تشریف لے آئیے، حضور ﷺ نے قبول فرمالیا۔ تو اب اس خاتون نے چاہا کہ میں حضور ﷺ کی کچھ خاطر تواضع کروں کچھ کھانا وغیرہ پیش کروں۔ چنانچہ اس نے حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ آپ ﷺ نے پہلا لقمہ لیا تو ابھی منہ میں ڈالا تھا کہ ایک دم سے آپ نے روک دیا چھوڑ دیا اور فرمایا کہ یہ بکری جو ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اجازت کے حاصل کی گئی ہے، لہٰذا اس خاتون کو بلایا گیا اور اس سارے واقعے کی تفصیل دریافت کی گئی، اس پر اس نے بتایا کہ میں نے بکری منگوانے کے لئے کسی کو بھیجا تھا لیکن بکری نہ ملی، پھر میں نے اپنے پڑوسی سے بکری خریدنا چاہی، اس نے تو انکار کردیا لیکن میں نے اس کی بیوی سے کہا کہ مجھے بکری بیچ دو، اس کی بیوی نے شوہر کی اجازت کے بغیر بکری بیچ دی تھی، اس بکری کا گوشت آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بکری کا گوشت قیدیوں کو کھلادو۔ (۱)

نبی پاک ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِیءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ))(۲)

’’کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے‘‘

کسی کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں

غور سے سمجھئے کہ کسی کا مال خوش دلی کے بغیر حلال نہیں، کہ اگر آپ نے زبردستی اصرار کر کر کے لے بھی لیا کسی طرح لیکن وہ دل سے راضی نہیں تھا، تو بھی آپ کے لئے حلال نہیں چاہے اس نے آپ کو دے دیا۔ کسی کے سر پہ جا کے سوار ہو گئے آپ اور کہہ رہے ہو دو، اب وہ دینا نہیں چاہ رہا مگر آپ اصرار کر رہے ہیں، اور اصرار کرنے کے نتیجے میں اس نے کہا کہ بھائی دے دو اس کو جان چھوٹے اس سے۔ تو اگر اس طرح کسی سے لیا آپ نے اور اس نے بظاہر آپ کو دے بھی دیا لیکن چونکہ خوش دلی نہیں ہے اس واسطے وہ حلال نہیں۔ اسی طرح بعض اوقات خرید وفروخت کے اندر یہ معاملہ ہو جاتا ہے، مثلاً آپ کچھ خریدنے گئے اور اس نے آپ کو قیمت بتائی آپ نے اس میں کمی کروائی، اور کمی اتنی کروائی کہ وہ بیچارہ اس کمی پر دینے کو تیار نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ نہیں جی آپ کو تو دینا ہی ہوگا، اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اتنی کم قیمت پر دینے کا لیکن آخر میں مجبور ہو کر کسی طرح اس نے آپ کو دے دیا کم قیمت پر، لیکن اس نے یہ کمی خوش دلی سے نہیں کی مجبوراً کی، تو یہ جو مجبوری میں کمی کرائی گئی یہ آپ کے لئے حلال اور پاکیزہ نہیں۔ کیونکہ اس آدمی کی خوش دلی کے بغیر آپ نے یہ حاصل کی، اسی طرح چندہ وغیرہ جمع کیا جاتا ہے۔

چند معاشرتی برائیوں پر تبصرہ

چندے میں بعض اوقات آدمی محض لوگوں کے اس خطرے سے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو لوگوں میں میری بدنامی ہوگی دل نہیں چاہ رہا دینے کو لیکن اس ڈر سے دے دیا تو لینے والے کے لئے وہ حلال نہیں۔

شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ تحفہ دیا جاتا ہے، اندر سے دل نہیں چاہ رہا تھا دینے کو لیکن اس

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في اجتناب الشبهات، رقم: ۲۸۹٤، مسند أحمد، رقم: ۲۱٤۷۱

(۲) كنز العمال، رقم: ۳۹۷ (۹۱/۱)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، جامع الأحاديث، رقم: ۱۷٦۱٥ (۸۰/۱۷)، كشف الخفاء، رقم: ۳۱۰۱ (۳۷۰/۲)

واسطے دے دیا کہ اگر نہیں دوں گا تو یہ برا مانے گا اور میری ناک کٹ جائے گی، تو وہ خوش دلی سے نہیں دیا جارہا ہے۔ تو خوش دلی سے نہیں دیا جارہا اس واسطے وہ حلال نہیں پاکیزہ نہیں ہے۔

صرف یہ بات نہیں کہ اجازت ہو بلکہ اجازت بھی خوش دلی کے ساتھ ہو، اگر خوش دلی کے بغیر ہے تو وہ حلال نہیں کسی طرح سے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حرام وہ ہے جو چوری سے لیا جائے ڈاکے سے لیا جائے اور جوا کھیل کے لیا جائے، لیکن یہ جو باتیں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں کثرت سے خوش دلی کے بغیر۔

ایک اور وبا جو ہمارے ہاں کثرت سے پھیلی ہوئی ہے کہ کسی سے کرائے پر مکان لیا اب مالک مکان یہ چاہتا ہے کہ تم یہ مکان خالی کرو مجھے اس کی ضرورت ہے یا کوئی اور وجہ ہے، آپ کہتے ہیں کہ جی میں خالی نہیں کرتا، تو اب جتنے دن مالک کی اجازت کے بغیر اس مکان میں رہ رہے ہو وہ رہائش حرام اور ناجائز ہے۔ اس واسطے کہ مالک کی اجازت اور خوش دلی کے بغیر اس کو استعمال کررہے ہیں۔

اب یہ چیز سارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ میں یہ حرام کام کررہا ہوں صبح سے شام تک حرام ہورہی ہے، جاگنے کے وقت سے لے کر سونے کے وقت تک سارا کا سارا حرام گزر رہا ہے۔ لیکن کسی کو اس کا خیال نہیں آتا اور کررہے ہیں۔ تو رزق حرام میں صرف یہ چوری ڈاکے داخل نہیں یہ سب چیزیں داخل ہیں، کسی کی چیز اٹھالی اور اس کو اس کی اجازت کے بغیر خوش دلی کے بغیر استعمال کرلیا تو اس کا استعمال حرام اور ناجائز ہے۔ چاہے تھوڑی دیر کے لئے ہو، تو کسی کی خوش دلی کے بغیر اس کی چیز کو استعمال کرنا جائز نہیں۔ چاہے آپس میں قریبی تعلقات ہی کیوں نہ ہوں، لیکن جس چیز کے بارے میں سو فیصد یقین نہ ہو کہ یہ خوش دلی سے میرے استعمال کرنے پر راضی ہوگا اس وقت تک استعمال کرنا جائز نہیں۔

عام طور پر لوگوں کے اندر یہ بیماری ہے، کسی کے گھر گئے ٹیلی فون رکھا ہوا ہے اور اٹھا کر فون کرنا شروع کردیا پوچھا تک نہیں کہ میں کرسکتا ہوں کہ نہیں کروں یا نہ کروں۔ اور ٹیلی فون کرکرا کے اپنا الو سیدھا کرتے ہوئے چل دیئے، یہ کام اجازت کے بغیر ہورہا ہے اس واسطے حرام ہے ناجائز ہے۔ تو ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دھیان نہیں تو یہ سب کام حرام ہورہے ہیں۔ تو یہ سارا کا سارا وبال اسی کا پھیلا ہوا ہے۔

تو بھائی خدا کے لئے ہم اپنی جانوں پر رحم کریں کم از کم اتنا تو ہو کہ جو کھا رہے ہیں وہ حلال ہو، جو برت رہے ہیں وہ حلال ہو اور اس میں کوئی ظلم کا پہلو نہ ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناراض کرنے کا پہلو نہ ہو۔ اطمینان کرلو کہ جو لقمہ پیٹ میں جارہا ہے وہ حلال ہے۔

حلال وحرام کی تمیز مٹتی جارہی ہے

ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے اندر حلال وحرام کی تمیز ہوتی تھی کہ یہ جولقمہ پیٹ میں جارہا ہے کہیں حرام کا تو نہیں، لوگوں کو اگر پتہ چل جائے کہ صدقہ کا گوشت کھایا ہے تو اسے ایک بدنامی کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی مسلمان صدقہ کا گوشت کھائے۔ اب سارے مسلم ملکوں کے اندر امپورٹڈ (Imported) گوشت آرہا ہے، کوئی آسٹریلیا سے کوئی نیوزی لینڈ سے کوئی برازیل سے کوئی کہیں سے کوئی کہیں سے اور گوشت کے بارے میں کوئی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو پرواہ نہیں کہ حلال طریقے سے ذبح ہوا کہ نہیں اور حرام کھارہے ہیں۔

جب یہاں پر کراچی میں مکڈ ولنڈ کھلا تو معلوم ہوا کہ ایک طوفان ہے انسانوں کا جو کھانے کے لئے پہنچ گیا اور ایسے افراد جو یہ پوچھ رہے ہیں کہ آخر یہ ایک یہودی کمپنی ہے تو اس نے جو گوشت رکھا ہے حلال ہے یا حرام ہے، اس کو پوچھنے والا شاید ہزار میں کوئی ایک ہوا کا دکا کسی نے پوچھ لیا تو ہم نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ الحمد للہ ایسا کھلا حرام نہیں ہے کیونکہ جہاں سے منگوایا جارہا ہے تو میں نے پتہ کیا کہ حرام نہیں حلال ہے۔ لیکن میں کہہ رہا ہوں کہ فکر لیکن وہاں جانے سے پہلے ہجوم لگانے سے پہلے ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ تو معلوم کیا ہوتا کہ آیا یہ ہمارے لئے کھانا حلال ہے کہ نہیں، مگر وہ حلال وحرام کی فکر مٹ گئی اس کے نتیجے میں کسی کو دھیان ہی نہیں یہ پتہ نہیں کہ حرام چیز ہمارے حلق میں جائے گی تو اندر جاکر کیا فساد پھیلائے گی، ہماری زندگیوں میں اہمارے اخلاق میں ہمارے اعمال میں ہماری ہر چیز میں فساد مچائے گی۔

تو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت فرمارہے ہیں کہ اگر یہ خصلت تمہارے دل میں پیدا ہوگئی کہ حلال کھانے کا اہتمام کہ میرے منہ میں کوئی حرام چیز نہ جائے، جس دن یہ مل گیا تو سمجھ لو کہ دنیا کی ساری نعمتیں تمہارے لئے جمع ہوگئیں، سب سے پہلے دیکھو کہ وہ چیز حلال ہے کہ نہیں، حلال طریقے سے حاصل ہوئی ہے کہ نہیں، جن پیسوں سے وہ چیز خریدی گئی ہے وہ پیسے حلال کے تھے یا حرام کے، اس کی فکر پیدا کرلیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی برکات اور انوارات تمہیں دکھائیں گے، ایک ایک پیسے کے اندر نور معلوم ہوگا، ایک ایک پیسے میں برکت معلوم ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

سچائی کو اپنا شعار بنائیے

تیسری صفت یہ بتائی کہ بات میں سچائی ہو، کہ جو بات منہ سے نکلے قلم سے نکلے وہ پکی ہو اس میں جھوٹ کا شائبہ نہ ہو، اور یہ جھوٹ اتنی بری بلا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مشرکین اور کافر بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے۔ ابوسفیان کہتے ہیں جو اس وقت حضور ﷺ کے دشمن تھے، ہرقل کے دربار میں گئے اس نے حضور ﷺ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی چاہیں تو ان کو بلایا، تو کہتے ہیں کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات حضور ﷺ کے خلاف ان کے سامنے کہہ دوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی بات حضور ﷺ کے خلاف کہتا ہوں تو وہ جھوٹ ہوتی۔ اور مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کہ لوگ یہ کہیں کہ ابوسفیان نے جھوٹ بولا۔(۱)

کفر کی حالت میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ تو جھوٹ بولنے کو کافر بھی اور مشرک بھی برا سمجھتے ہیں۔ اور آج معاشرے کے اندر جھوٹ عام ہو گیا، زبان سے بات نکالتے ہوئے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ واقعہ کے مطابق بات نکل رہی ہے یا واقعہ کے خلاف، جھوٹ پھیلا ہوا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

((اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِكُ))(۲)

''سچائی نجات دینی والی چیز ہے اور جھوٹ بربادی لانے والی چیز ہے''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سخت سے سخت حالات میں بھی زبان سے جھوٹ نکالنے سے پرہیز کیا۔ جب حضور ﷺ ہجرت کے لئے تشریف لے جارہے تھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ساتھ ہیں اور مکہ کے مشرکین نے ہرکارے دوڑائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح حضور ﷺ کو پکڑ کر لے آئیں، اور آپ کے سر کی قیمت لگی ہوئی ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سو اونٹ کا انعام ملے گا۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرکین کو پتہ چل جائے کہ حضور ﷺ کہاں ہیں اور آ کر پکڑ لیں تو راستہ میں ایک

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی، رقم:٦، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب کتاب النبی إلی هرقل یدعوه إلی الإسلام، رقم:٣٣٢٢، مسند أحمد، رقم:٢٢٥٢

(۲) "الصدق ینجی" کے لئے دیکھئے: کنز العمال، رقم:٧٢٩٤ (٣/٤٢٩)، کشف الخفاء، رقم: ١٣٠٧ (١/٤٠٧)، الکذب یهلك کے الفاظ احادیث کی کتابوں میں نہیں مل سکے۔ البتہ بہت سی احادیث میں الکذب ریبة کے الفاظ آئے ہیں۔

شخص ملا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتا تھا، تو اس نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟ اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بتاتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ جا کر راز فاش نہ کر دے، اور اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائیں، اور اگر نہیں بتاتے غلط بتاتے ہیں تو غلط بیانی ہوتی ہے، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ ایمان والے کی مدد فرماتے ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا یہ میرے راہنما ہیں مجھے راستہ دکھاتے ہیں، اس وقت بھی جبکہ جان پر بنی ہوئی ہے صریح جھوٹ نہیں بولا۔ وہ شخص مطمئن ہو کر چلا گیا کہ ساتھ میں راہنما لے کر جا رہے ہیں۔(۱)

ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے دین کا راستہ دکھاتے ہیں دین میں میری راہنمائی کرتے ہیں۔

تو زبان سے جھوٹ کا کلمہ نکالنا یہ مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔ حالانکہ بعض حالات میں جب انسان کی جان پر بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی بھی ہے، لیکن مسلمان حتی الامکان جھوٹ نہیں بولے گا، نہ بولے یہ مومن کا کام نہیں، اور جھوٹ یہ نہیں ہوتا کہ جان بوجھ کر جھوٹ کی غرض سے بولا جائے بلکہ وہ تمام باتیں جو خلاف واقعہ ہیں وہ سب جھوٹ میں آتی ہیں۔ چھٹیاں لینے کے لئے یہ جو جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ چلتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ اور یہ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح زبان سے جان بوجھ کر جھوٹ بولنا۔ جھوٹے سرٹیفکیٹ چل رہے ہیں، جھوٹی شہادتیں دی جا رہی ہیں، یہ جو سرٹیفکیٹ ہوتا ہے یہ درحقیقت شہادت اور گواہی ہوتا ہے۔ اور قرآن نے جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم پلہ قرار دیا ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾(۲)

''بت پرستی سے بچو اور جھوٹی گواہی سے بچو''

جھوٹے سرٹیفکیٹ جھوٹی گواہی ہیں

یہ جو جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں جھوٹے غلط یہ جھوٹی گواہی ہیں۔ اور جھوٹی گواہی کے اوپر اتنا زبردست وبال ہے کہ العیاذ باللہ۔ پھر بھی ہم لوگ شکوے کرتے ہیں کہ پیچھے جا رہے ہیں، قومیں آگے بڑھ رہی ہیں روز ہماری پٹائی ہو رہی ہے، اس کا شکوہ کرتے ہیں جبکہ یہ ساری چیزیں معاشرے کے اندر ہم نے اپنے اوپر مسلط کی ہوئی ہیں، تو بتائیں ذلت نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا، پٹائی

(۱) حیاۃ الصحابۃ (۴۵۱/۱)

(۲) الحج: ۳۰

نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا، جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی ہو۔ تو جھوٹ بولنا جھوٹی شہادتیں دینا جھوٹے گواہ لانا جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرنا یہ سب اس کے اندر داخل ہیں۔ انسان کی زبان سے قلم سے قدم سے کوئی بات خلاف واقعہ نہیں نکلنی چاہئے۔ اچھے اچھے بڑے دیندار لوگ نمازوں کے پابند تہجد کے پابند جب یہاں معاملہ آتا ہے تو اس میں سب پھسل جاتے ہیں۔ کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ بنوالو کوئی بات نہیں، جھوٹ بول دو کوئی بات نہیں۔ مسلمان کا یہ کام نہیں۔

دوسروں کے راز کی حفاظت کیجئے

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں کہ دوسری صفت جو انسان کے اندر ہونی چاہئے وہ ہے سچائی۔ اور آخری بات فرمائی:

((حِفظُ اَمَانَۃٍ))

''امانت کی حفاظت''

کسی کے پاس کوئی چیز امانت ہے تو اس میں خیانت نہ ہو، اس میں انسان ناجائز تصرف نہ کرے، مثلاً آپ کے پاس کسی شخص نے پیسے رکھوائے تو اس کی حفاظت کرو یہ بھی امانت میں داخل ہے۔ لیکن بہت سی امانتیں ایسی ہیں کہ جن کے امانت ہونے کا ہمیں خیال نہیں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ))(۱)

''مجلسیں امانت ہوتی ہیں''

اگر کسی نے آپ کو اپنے کسی راز کی بات بتائی ہے تو وہ راز بھی آپ کے پاس امانت ہے، اور اگر آپ اس راز کو دوسرے لوگوں کے سامنے ظاہر کریں گے تو یہ بھی امانت میں خیانت ہوگی۔ کسی شخص نے آپ پر اعتماد کر کے آپ سے کوئی بات کہہ دی اور ذہن میں یہ خیال ہے کہ یہ اسی حد تک رہے گی تو جب آپ اس سے اجازت نہ لے لیں کہ دوسروں سے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں اس وقت تک آپ کے لئے دوسری جگہ کہنا جائز نہیں۔ یہ بھی امانت میں شامل ہے۔ مثلاً کسی شخص سے آپ نے کوئی چیز عاریتاً لی ہے تو وہ اس کی امانت ہے اس کو واپس پہنچانا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(۲)

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث، رقم:٤٢٢٦، مسند أحمد، رقم:١٤١٦٦

(۲) النساء:٥٨

''امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچاؤ یہ تمہارا فریضہ ہے''

لوگ قرضے لیتے ہیں ادائیگی کے اندر ٹال مٹول کرتے ہیں، امانتیں لیتے ہیں اس کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں یہ سب خیانت کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان بداعمالیوں سے نجات عطا فرمائے اور جو چار صفتیں حضرت عبداللہ عمرو رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کے اندر پیدا فرمادے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

☆☆☆

حرام مال سے بچاؤ☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَأۡكُلُوۡٓا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَآ اِلَى الۡحُكَّامِ لِتَاۡكُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾(۱)

''اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ، اور ان (کے جھوٹے مقدمے) کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ گناہ کے طریقے پر کھا جاؤ، جبکہ تم کو اپنے جھوٹ اور ظلم کا علم بھی ہو''

قرآن کریم کی اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت بڑے جامع انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یوں تو ہر قوم اور ہر مذہب وملت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مال حاصل کرنے کے کچھ طریقے پسندیدہ اور جائز ہیں، اور کچھ ناپسندیدہ اور ممنوع ہیں، مثلاً چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب کو ساری ہی دنیا برا سمجھتی ہے۔ لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی ایسا معیار نہ کسی قوم کے پاس ہے اور نہ ہوسکتا ہے جو پوری دنیا کے لئے معقول اور قابل قبول ہو، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہوسکتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، کیونکہ خالقِ کائنات ہی اپنے بندوں کی حقیقی مصلحتوں سے باخبر ہوسکتا ہے، چنانچہ اسلام نے حلال اور حرام اور جائز وناجائز کا جو قانون بنایا ہے وہ صراحۃً وحی الٰہی سے ماخوذ یا مستفاد ہے، اس قانون میں ہر قدم پر اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی جدوجہد کے مطابق ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کردے، بلکہ جو بھی ملکیت کسی کو حاصل ہے وہ قانون الٰہی کے مطابق ہے۔

☆ نشری تقریریں، ص ۱۰۹ تا ۱۱۲، فرد کی اصلاح، ص ۱۰۲ تا ۱۰۴

(۱) البقرۃ: ۱۸۸

آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں کو شامل ہے ان میں سود، قمار، رشوت خوری، ملاوٹ، دھوکہ فریب، جھوٹے مقدمات، غرض ان تمام ناجائز ذرائع آمدنی کو شامل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ناجائز قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾

''یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر''

اس میں ایک بات تو قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے ''اموالکم'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے اصل معنی یہ ہیں کہ ''نہ کھاؤ اپنے مال'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت ہوگی جیسی تمہیں اپنے مال سے محبت ہے۔ اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچتا ایسا ہی دکھ دوسرے کو بھی پہنچے گا۔ اس بات کا احساس اس وقت بھی اسی طرح کرو جیسے کہ وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ آیت کے ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتا ہے اور یہ رسم چل پڑی ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے مال میں ایسا ہی ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے۔

غور کیجئے کہ جب اشیاء ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے تو ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرتا ہے لیکن جب اس کو دودھ خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے تو دودھ والا اس میں پانی ملا کر دیتا ہے، مسالے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس میں ملاوٹ ملتی ہے، دوا لینے جاتا ہے تو وہاں کھوٹ ملتا ہے، اس طرح جتنے زائد پیسے اس نے ایک جگہ ملاوٹ کر کے حاصل کئے دوسرے افراد دسیوں جگہ ملاوٹ کر کے اس کی جیب سے نکال لیتے ہیں، یہ بے چارہ اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا؟ اور حقیقت میں جو کوئی شخص دوسرے کا مال غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ خود اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

یوں تو ناجائز ذرائع آمدنی ہر وقت اور ہر زمانے میں ناجائز ہیں، لیکن کسی مقدس زمانے میں یا مقدس مقام پر ان کا ارتکاب کیا جائے تو ان کی قباحت اور بڑھ جاتی ہے خاص طور سے رمضان کے مبارک مہینے میں کیونکہ اس مہینے میں ایک مسلمان اللہ کے حکم کی خاطر ناجائز اور مباح چیزوں (مثلاً

کھانے پینے) کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ بات بڑی شرم کی ہے کہ جو چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں انہیں ترک نہ کرے، لہٰذا اس مبارک مہینے میں اکل حلال کا زیادہ اہتمام لازمی ہے۔

حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن وسنت میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں کی گئی ہیں، ایک آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اچھے اخلاق واعمال کی توقع مشکل ہے، ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾(۱)

''اے گروہ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے باخبر ہوں''

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمال صالحہ کا صدور اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو۔

آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی، فرمایا کہ بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام تو ان کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟(۲)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرما دیجئے کہ میری ہر دعا قبول ہوا کرے، آپ نے فرمایا:

''اے سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو، تمہاری دعائیں قبول ہونے لگیں گی، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے، بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی

(۱) المؤمنون: ۵۱

(۲) صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، رقم: ۱٦٨٦، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب من سورة البقرة، رقم: ۲۹۱۵، مسند أحمد، رقم: ۷۹۹۸، سنن الدارمي، كتاب الرقاق، باب في أكل الطيب، رقم: ۲٦۰۱

زیادہ لائق ہے"(۱)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرام مال سے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے محفوظ رکھے اور رزق حلال کی توفیق کامل عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

(۱) جامع العلوم والحکم (۱/۱۰۰)

ناپ تول میں کمی اور اس کا وبال ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ o يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ o﴾ (۱)

کم تولنا، ایک عظیم گناہ

بزرگان محترم اور برادران عزیز! میں نے آپ حضرات کے سامنے سورۃ مطففین کی ابتدائی آیات تلاوت کیں، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بہت بڑے گناہ اور معصیت کی طرف متوجہ فرمایا ہے، وہ گناہ ہے ''کم ناپنا اور کم تولنا'' یعنی جب کوئی چیز کسی کو بیچی جائے تو جتنا اس خریدنے والے کا حق ہے اس سے کم تول کر دے، عربی میں کم ناپنے اور کم تولنے کو ''مطففین'' کہا جاتا ہے، اور یہ ''تطفیف'' صرف تجارت اور لین دین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ''تطفیف'' کا مفہوم بہت وسیع ہے، وہ یہ کہ دوسرے کا جو بھی حق ہمارے ذمے واجب ہے اس کو اگر اس کا حق کم کر کے دیں تو یہ ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔

آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ کم ناپنے اور کم تولنے والوں کے لئے افسوس ہے (اللہ تعالیٰ نے ''ویل'' کا لفظ استعمال فرمایا ''ویل'' کے ایک معنی تو ''افسوس'' کے آتے ہیں دوسرے معنی اس کے ہیں ''دردناک عذاب'' اس دوسرے معنی کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا'' کہ ان لوگوں پر دردناک

☆ اصلاحی خطبات (۶/۱۱۴ تا ۱۳۷) ۱۶ اگست ۱۹۹۳ء، قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد نعمان، لسبیلہ چوک، کراچی

() المطففین: ۱-۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے خود کوئی چیز ناپ کر لیتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں، اور جب وہ کسی کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سوچتے کہ انہیں ایک بڑے زبردست دن میں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے''

عذاب ہے جو دوسروں کا حق کم دیتے ہیں۔ اور کم ناپتے اور تولتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنا حق وصول کرنے کا موقع آتا ہے تو اس وقت اپنا حق پورا لیتے ہیں۔ (اس وقت تو ایک دمڑی بھی کر دینے کا موقع مل جائے تو اس وقت (ڈنڈی مار دیتے ہیں) کم کر دیتے ہیں، (جتنا حق دینا چاہئے تھا اتنا نہیں دیتے) (آگے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ) ''کیا ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ ایک عظیم دن میں دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، جس دن سارے انسان رب العالمین کے سامنے پیش ہوں گے'' (اور اس وقت انسان کو اپنے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں ہوگا، اور اس دن ہمارا اعمال نامہ ہمارے سامنے آجائے گا، تو کیا ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ اس وقت کم ناپ کر اور کم تول کر دنیا کے چند ٹکوں کا جو تھوڑا سا فائدہ اور نفع حاصل کر رہے ہیں یہ چند ٹکوں کا فائدہ ان کے لئے جہنم کے عذاب کا سبب بن جائے گا۔ اس لئے قرآن کریم نے بار بار کم ناپنے اور کم تولنے کی برائی بیان فرمائی۔ اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی، اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا واقعہ بھی بیان فرمایا)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا جرم

حضرت شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اس وقت ان کی قوم بہت سی معصیتوں اور نافرمانیوں میں مبتلا تھی، کفر، شرک اور بت پرستی میں تو مبتلا تھی، اس کے علاوہ پوری قوم کم ناپنے اور کم تولنے میں مشہور تھی۔ تجارت کرتے تھے لیکن اس میں لوگوں کا حق پورا نہیں دیتے تھے، دوسری طرف وہ ایک انسانیت سوز حرکت یہ کرتے تھے کہ مسافروں کو راستے میں ڈرایا کرتے اور ان پر حملہ کر کے لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو کفر، شرک اور بت پرستی سے منع کیا۔ اور توحید کی دعوت دی، اور کم ناپنے کم تولنے اور مسافروں کو راستے میں ڈرانے اور ان پر حملہ کرنے سے بچنے کا حکم دیا۔ لیکن وہ قوم اپنی بداعمالیوں میں مست تھی، اس لئے حضرت شعیبؑ کی بات ماننے کے بجائے ان سے یہ پوچھا:

﴿أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ﴾(۱)

''یعنی کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دے رہی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباء واجداد عبادت کرتے تھے، یا ہم اپنے مال میں جس طرح

(۱) ھود: ۸۷

چاہیں تصرف کرنا چھوڑ دیں"

یہ ہمارا مال ہے ہم اسے جس طرح چاہیں حاصل کریں، چاہے کم تول کر حاصل کریں یا کم ناپ کر حاصل کریں، یا دھوکہ دے کر حاصل کریں۔ تم ہمیں روکنے والے کون ہو؟ ان باتوں کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام ان کو محبت اور شفقت کے ساتھ سمجھاتے رہے اور اللہ کے عذاب سے اور آخرت کے عذاب سے ڈراتے رہے، لیکن یہ لوگ باز نہ آئے۔ اور بالاخر ان کا وہی انجام ہوا جو نبی کی بات نہ ماننے والوں کا ہوتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا عذاب بھیجا جو شاید کسی اور قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب

وہ عذاب ان پر اس طرح آیا کہ پہلے تین دن متواتر پوری بستی میں سخت گرمی پڑی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آسمان سے انگارے برس رہے ہیں، اور زمین آگ اگل رہی ہے، حبس اور تپش نے ساری بستی والوں کو پریشان کر دیا، تین دن کے بعد بستی والوں نے دیکھا کہ اچانک ایک بادل کا ٹکڑا بستی کی طرف آ رہا ہے اور اس بادل کے نیچے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، چونکہ بستی کے لوگ تین دن سے سخت گرمی کی وجہ سے بلبلائے ہوئے تھے، اس لئے سارے بستی والے بہت اشتیاق کے ساتھ بستی چھوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوئے، تاکہ یہاں ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھائیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بادل کے نیچے اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ سب پر ایک ساتھ عذاب نازل کر دیا جائے، چنانچہ جب وہ سب وہاں جمع ہو گئے تو وہی بادل جس میں سے ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں اس میں سے آگ کے انگارے برسنا شروع ہو گئے، اور ساری قوم ان انگاروں کا نشانہ بن کر جھلس کر ختم ہو گئی، اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ سے اشارہ فرمایا:

﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ (۱)

"یعنی انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا اس کے نتیجے میں ان کو سائبان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا"

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾ (۲)

"یعنی یہ ان کی بستیاں دیکھو، جو ان کی ہلاکت کے بعد آباد بھی نہیں ہو سکیں مگر

---

(۱) الشعراء: ۱۸۹ (۲) القصص: ۵۸

بہت کم، ہم ہی ان کے سارے مال و دولت اور جائیداد کے وارث بن گئے"

وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کم ناپ کر، کم تول کر، ملاوٹ کر کے، دھوکہ دے کر ہم اپنے مال و دولت میں اضافہ کریں گے، لیکن وہ ساری دولت دھری کی دھری رہ گئی۔

یہ آگ کے انگارے ہیں

اگر تم نے ڈنڈی مار کر ایک تولہ، یا دو تولہ، ایک چھٹا نک یا دو چھٹا نک مال خریدار کو کم دے دیا اور چند پیسے کما لئے دیکھنے میں تو یہ پیسے ہیں لیکن حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں۔ جس کو تم اپنے پیٹ میں ڈال رہے ہو، حرام مال اور حرام کھانے کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾(۱)

"یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، جو لقمے حلق سے نیچے اتر رہے ہیں یہ حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں"

اگرچہ دیکھنے میں وہ روپیہ پیسہ اور مال و دولت نظر آ رہا ہے، کیونکہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی کر کے یہ پیسے حاصل کئے گئے ہیں، یہ پیسے اور یہ مال و دولت دنیا میں بھی تباہی کا سبب ہے اور آخرت میں بھی تباہی کا ذریعہ ہے۔

اجرت کم دینا گناہ ہے

اور یہ کم ناپنا اور کم تولنا صرف تجارت کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ کم ناپنا اور کم تولنا اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو امام المفسرین ہیں سورۃ مطففین کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شِدَّةُ الْعَذَابِ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ مِنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّيَامِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْعِبَادَاتِ"(۲)

"یعنی قیامت کے روز سخت عذاب ان لوگوں کو بھی ہوگا جو اپنی نماز، زکوۃ اور

(۱) النساء: ۱۰

(۲) تنوير المقباس من تفسير ابن عباس، سورة المطففين (۱۳۲/۲)

روزے اور دوسری عبادات میں کمی کرتے ہیں"

اس سے معلوم ہوا کہ عبادات میں کوتاہی کرنا اس کو پورے آداب کے ساتھ ادا نہ کرنا بھی تطفیف کے اندر داخل ہے۔

مزدور کو مزدوری فوراً دے دو!

ایک آقا مزدور سے پورا پورا کام لیتا ہے، اس کو ذرا سی بھی سہولت دینے کو تیار نہیں ہے، لیکن تنخواہ دینے کے وقت اس کی جان نکلتی ہے، اور پوری تنخواہ نہیں دیتا، یا صحیح وقت پر نہیں دیتا، ٹال مٹول کرتا ہے، یہ بھی ناجائز ہے حرام ہے۔ اور تطفیف میں داخل ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَعْطُوا الْاَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجُفَّ عَرَقُهُ))(۱)

"یعنی مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"

اس لئے کہ جب تم نے اس سے مزدوری کرالی کام لے لیا تو اب مزدوری دینے میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔

نوکر کو کھانا کیسا دیا جائے؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک نوکر رکھا اور نوکر سے یہ طے کیا کہ تمہیں ماہانہ اتنی تنخواہ دی جائے گی، اور روزانہ دو وقت کا کھانا دیا جائے گا، لیکن جب کھانے کا وقت آیا تو خود خوب پلاؤ زردے اڑائے، اعلیٰ درجے کا کھانا کھایا، اور بچا کچا کھانا جس کو ایک معقول اور شریف آدمی پسند نہ کرے وہ نوکر کے حوالے کردیا تو یہ بھی "تطفیف" ہے اسلئے کہ جب تم نے اس کے ساتھ دو وقت کا کھانا طے کرلیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو اتنی مقدار میں ایسا کھانا دو گے جو ایک معقول آدمی پیٹ بھر کر کھا سکے، لہٰذا اب اس کو بچا کچا کھانا دینا اس کی حق تلفی اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے، لہٰذا یہ بھی "تطفیف" کے اندر داخل ہے۔

ملازمت کے اوقات میں ڈنڈی مارنا

ایک شخص کسی محکمے میں، کسی دفتر میں آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، تو گویا کہ اس نے یہ آٹھ گھنٹے اس محکمے کے ہاتھ فروخت کردیئے ہیں، اور یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ میں آٹھ گھنٹے آپ کے پاس کام کروں

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب أجر الأجراء، رقم: ٢٤٣٤

گا، اور اس کے عوض اس کو اجرت اور تنخواہ ملے گی، اب اگر وہ اجرت تو پوری لیتا ہے لیکن اس آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں کمی کر لیتا ہے، اور اس میں سے کچھ وقت اپنے ذاتی کاموں میں صَرف کر لیتا ہے تو اس کا یہ عمل بھی ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے، حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، یہ بھی اسی طرح گناہگار ہے جس طرح کم ناپنے اور کم تولنے والا گناہگار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اگر آٹھ گھنٹے کے بجائے سات گھنٹے کام کیا، تو ایک گھنٹے کی ڈیوٹی ماردی، گویا کہ اجرت کے وقت اپنا حق اجرت تو پورا لے رہا ہے، اور جب دوسروں کا حق دینے کا وقت آیا تو کم دے رہا ہے۔ لہٰذا تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہوگا جو اس وقت کے بدلے میں ہوگا جو اس نے اپنے ذاتی کاموں میں صَرف کیا۔

ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا

کسی زمانے میں تو دفتروں میں ذاتی کام چوری چھپے ہوا کرتے تھے، مگر آج کل دفتروں کا یہ حال ہے کہ ذاتی کام چوری چھپے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ کھلم کھلا، اعلانیہ، ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے، اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں کہ تنخواہیں بڑھاؤ، الاؤنس بڑھاؤ، فلاں فلاں مراعات ہمیں دو، اور اس مقصد کے لئے احتجاج کرنے، جلسے جلوس کرنے اور نعرے لگانے کے لئے، ہڑتال کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ذمے کیا حقوق عائد ہورہے ہیں؟ ہم ان کو ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم نے آٹھ گھنٹے ملازمت اختیار کی تھی ان آٹھ گھنٹوں کو کتنی دیانت اور امانت کے ساتھ خرچ کیا، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں جاتا۔

یاد رکھو! ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ جو دوسرے کے حقوق میں کمی کرتے ہیں، اور جب دوسروں سے حق وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو اس وقت پورا پورا لیتے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا، اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا حال

آپ حضرات نے دارالعلوم دیوبند کا نام سنا ہوگا، اس آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو اس امت کے لئے رحمت بنادیا، اور یہاں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے صحابہ کرام کی یادیں تازہ کردیں، میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے سنا کہ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ دارالعلوم کے وقت میں اگر کوئی مہمان ملنے کے

لئے آجاتا تو جس وقت وہ مہمان آتا اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے، اور یہ نوٹ کر لیتے کہ یہ مہمان مدرسہ کے اوقات میں سے اتنا وقت میرے پاس رہا، پورا مہینہ اسی طرح کرتے اور جب مہینہ ختم ہوجاتا تو استاذ ایک درخواست پیش کرتے کہ چونکہ فلاں فلاں ایام میں اتنی دیر تک میں مہمان کے ساتھ مشغول رہا اس وقت کو دارالعلوم کے کام میں صَرف نہیں کر سکا، لہٰذا میری تنخواہ میں سے اتنے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے۔

کہیں تنخواہ حرام نہ ہو جائے

آج تنخواہ بڑھانے کی درخواست دینے کے بارے میں تو آپ روزانہ سنتے ہیں، لیکن یہ کہیں سننے میں نہیں آتا کہ کسی نے یہ درخواست دی ہو کہ میں نے دفتری اوقات میں اتنا وقت ذاتی کام میں صَرف کیا تھا، لہٰذا میری اتنی تنخواہ کاٹ لی جائے۔ یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی فکر ہو۔ آج ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے مزدوری کرنے والے، ملازمت کرنے والے لوگ کتنا وقت دیانت داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر صَرف کر رہے ہیں؟ آج ہر جگہ فساد برپا ہے، خلق خدا پریشان ہے، اور دفتر کے باہر دھوپ میں کھڑی ہے اور صاحب بہادر اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں مہمانوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہیں، چائے پی جا رہی ہے، ناشتہ ہو رہا ہے، اس طرز عمل میں ایک طرف تو تنخواہ حرام ہو رہی ہے اور دوسری طرف خلق خدا کو پریشان کرنے کا گناہ الگ ہو رہا ہے۔

سرکاری دفاتر کا حال

ایک سرکاری محکمے کے ذمہ دار افسر نے مجھے بتایا کہ میرے ذمے یہ ڈیوٹی ہے کہ میں ملازموں کی حاضری لگاؤں، ایک ہفتہ کے بعد ہفتہ بھر کا چٹھہ تیار کر کے افسر بالا کو پیش کرتا ہوں، تاکہ اس کے مطابق تنخواہیں تیار کی جائیں اور میرے محکمے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو مار پیٹ والے نوجوان ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ اولاً تو دفتر میں آتے ہی نہیں ہیں، اور اگر کبھی آتے بھی ہیں تو ایک دو گھنٹے کے لئے آتے ہیں اور یہاں آکر بھی یہ کرتے ہیں کہ دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں، کینٹین میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، اور مشکل سے آدھا گھنٹہ دفتری کام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں نے حاضری کے رجسٹر میں لکھ دیا کہ یہ حاضر نہیں ہوئے تو وہ لوگ پستول اور ریوالور لے کر مجھے مارنے کے لئے آگئے، اور کہا کہ ہماری حاضری کیوں نہیں لگائی؟ فوراً ہماری حاضری لگاؤ۔ اب مجھے

بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اگر حاضری لگاتا ہوں تو جھوٹ ہوتا ہے، اور اگر نہیں لگاتا تو ان لوگوں کے انتقام وغضب کا نشانہ بنتا ہوں، میں کیا کروں؟ آج ہمارے دفتروں کا یہ حال ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی

اور سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اس حق کی ادائیگی میں کمی کرنا بھی کم ناپنے اور کم تولنے میں داخل ہے، مثلاً نماز اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور نماز کا طریقہ بتادیا گیا کہ اس طرح قیام کرو، اس طرح رکوع کرو، اس طرح سجدہ کرو، اس طرح اطمینان کے ساتھ اور اس طرح اطمینان کے سارے ارکان ادا کرو۔ اب آپ نے جلدی جلدی بغیر اطمینان کے ایک منٹ کے اندر نماز پڑھ لی، نہ سجدہ اطمینان سے کیا، نہ رکوع اطمینان سے کیا، تو آپ نے اللہ کے حق میں کوتاہی کر دی۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صاحب نے جلدی جلدی نماز ادا کرلی، نہ رکوع اطمینان سے کیا، نہ سجدہ اطمینان سے کیا، تو ایک صحابی نے ان کی نماز دیکھ کر فرمایا:

"لَقَدْ طَفَّفْتَ"(۱)

"تم نے نماز کے اندر "تطفیف" کی، یعنی اللہ تعالیٰ کا پورا حق ادا نہیں کیا"

یاد رکھئے! کسی کا بھی حق ہو، چاہے اللہ تعالیٰ کا حق ہو، یا بندے کا حق ہو، اس میں جب کمی اور کوتاہی کی جائے گی تو یہ بھی ناپ تول میں کمی کے حکم میں داخل ہوگی، اور اس پر وہ ساری وعیدیں صادق آئیں گی جو قرآن کریم نے ناپ تول کی کمی پر بیان کی ہیں۔

ملاوٹ کرنا حق تلفی ہے

اسی طرح "تطفیف" کے وسیع مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جو چیز فروخت کی وہ خالص نہیں، بلکہ اس کے اندر ملاوٹ کردی، یہ ملاوٹ کرنا کم ناپنے اور کم تولنے میں اس لحاظ سے داخل ہے کہ مثلاً آپ نے ایک سیر آٹا فروخت کیا، لیکن اس ایک سیر آٹے میں خالص آٹا تو آدھا سیر ہے اور آدھا سیر کوئی اور چیز ملادی ہے، اس ملاوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خریدار کا جو حق تھا کہ اس کو ایک سیر آٹا ملتا وہ حق اس کو پورا نہیں ملا، اس لئے یہ بھی حق تلفی میں داخل ہے۔

(۱) یہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "ابن حدیدہ" نامی ایک صاحب سے کہا تھا جنھوں نے عصر کی نماز میں سستی سے کام لیا تھا۔ موطا امام مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب جامع الوقوت، رقم: ۱۹، کنز العمال، رقم: ۲۱۷۷۸ (۴۲/۸)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ۳۲۶۹، (۳۳۱۱/۱)

اگر تھوک فروش ملاوٹ کرے؟

بعض لوگ یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ ہم خوردہ فروش ہیں ہمارے پاس تھوک فروشوں کی طرف سے جیسا مال آتا ہے وہ ہم آگے فروخت کر دیتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں ہم ملاوٹ نہیں کرتے، ملاوٹ تو تھوک فروش کرتے ہیں، لیکن ہمیں لامحالہ وہ چیز ویسی ہی آگے فروخت کرنی پڑتی ہے، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص خود مال نہیں بناتا اور نہ ملاوٹ کرتا ہے بلکہ دوسرے سے مال لے کر آگے فروخت کرتا ہے تو اس صورت میں خریدار کے سامنے یہ بات واضح کر دے کہ میں اس بات کا ذمہ دار نہیں کہ اس میں کتنی اصلیت ہے اور کتنی ملاوٹ ہے۔ البتہ میری معلومات کے مطابق اتنی اصلیت ہے اور اتنی ملاوٹ ہے۔

خریدار کے سامنے وضاحت کر دے

لیکن ہمارے بازاروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اصلی اور خالص ملتی ہی نہیں ہیں، بلکہ جہاں سے بھی لوگے وہ ملاوٹ شدہ ہی ملے گی، اور سب لوگوں کو یہ بات معلوم بھی ہے کہ یہ چیز اصلی نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے ایسی صورت میں وہ تاجر جو اس چیز کو دوسرے سے خرید کر لایا ہے اس کے ذمے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر ہر شخص کو اس چیز کے بارے میں بتائے، اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ خالص نہیں ہے، لیکن اگر یہ خیال ہو کہ خریدنے والا اس چیز کی حقیقت سے بے خبر ہے تو اس صورت میں اس کو بتانا چاہئے کہ یہ چیز خالص نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے۔

عیب کے بارے میں گاہک کو بتا دے

اسی طرح اگر بیچے جانے والے سامان میں کوئی عیب ہو وہ عیب خریدار کو بتا دینا چاہئے، تاکہ اگر وہ شخص اس عیب کے ساتھ اس کو خریدنا چاہتا ہے تو خرید لے ورنہ چھوڑ دے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُبَيِّنْهُ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللّٰهِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ))(۱)

''یعنی جو شخص عیب دار چیز فروخت کرے اور اس عیب کے بارے میں وہ خریدار کو نہ بتائے کہ اس کے اندر یہ خرابی ہے تو ایسا شخص مسلسل اللہ کے غضب میں رہے گا اور ملائکہ ایسے آدمی پر مسلسل لعنت بھیجتے رہتے ہیں''

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما باع عيبا فليبينه، رقم: ٢٢٣٨

دھوکہ دینے والا ہم میں سے نہیں

ایک مرتبہ حضور ﷺ بازار تشریف لے گئے وہاں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص گندم بیچ رہا ہے، آپ اس کے قریب تشریف لے گئے اور گندم کی ڈھیری میں اپنا ہاتھ ڈال کر اس کو اوپر نیچے کیا تو یہ نظر آیا کہ اوپر تو اچھا گندم ہے اور نیچے بارش اور پانی کے اندر گیلا ہو کر خراب ہو جانے والا گندم ہے، اب دیکھنے والا جب اوپر سے دیکھتا ہے تو اس کو یہ نظر آتا ہے کہ گندم بہت اچھا ہے، حضور ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ تم نے یہ بہت خراب والا گندم اوپر کیوں نہیں رکھا تا کہ خریدار کو معلوم ہو جائے کہ یہ گندم ایسا ہے، وہ لینا چاہے تو لے لے، نہ لینا چاہے تو چھوڑ دے، اس شخص نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ بارش کی وجہ سے کچھ گندم خراب ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کو نیچے کر دیا، آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، بلکہ اس کو اوپر کر دو اور پھر آپ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا))(۱)

''جو شخص دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں''

یعنی جو شخص ملاوٹ کر کے دھوکہ دے کر بظاہر تو خالص چیز بیچ رہا ہے لیکن حقیقت میں اس میں کوئی دوسری چیز ملا دی گئی ہے یا بظاہر تو پوری چیز دے رہا ہے لیکن حقیقت میں اس سے کم دے رہا ہے تو یہ غش اور دھوکہ ہے۔ اور جو شخص یہ کام کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، یعنی مسلمانوں میں سے نہیں یہ، دیکھئے ایسے شخص کے بارے میں حضور ﷺ کتنی سخت بات فرما رہے ہیں، لہٰذا جو چیز بیچ رہے ہو اس کی حقیقت خریدار کو بتا دو کہ اس کی یہ حقیقت ہے لیکن خریدار کو دھوکے میں اور اندھیرے میں رکھنا منافقت ہے، مسلمان اور مومن کا شیوہ نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دیانتداری

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہم اور آپ سب مقلد ہیں، بہت بڑے تاجر تھے، کپڑے کی تجارت کرتے تھے، لیکن بڑے سے بڑے نفع کو اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے قربان کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے پاس کپڑے کا ایک تھان آیا جس میں کوئی عیب تھا، چنانچہ آپ نے

(۱) صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب قول النبى من غشنا فليس منا، رقم: ۱٤۷، سنن الترمذى، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ما جاء فى كراهية الغش فى البيوع رقم: ۱۲۳٦، سنن ابن ماجه كتاب التجارات، باب النهى عن الغش رقم: ۲۲۱٦، مسند أحمد، رقم: ٤۸٦۷، سنن الدارمى كتاب البيوع، باب فى النهى عن الغش، رقم: ۲٤۲۹

اپنے ملازموں کو جو دوکان پر کام کرتے تھے کہہ دیا کہ یہ تھان فروخت کرتے وقت گاہک کو بتا دیا جائے کہ اس کے اندر یہ عیب ہے، چند روز کے بعد ایک ملازم نے وہ تھان فروخت کر دیا، اور عیب بتانا بھول گیا، جب امام صاحب نے پوچھا کہ اس عیب دار تھان کا کیا ہوا؟ اس ملازم نے بتایا کہ حضرت میں نے اس کو فروخت کر دیا، اب اگر کوئی اور مالک ہوتا تو وہ ملازم کو شاباش دیتا کہ تم نے عیب دار تھان فروخت کر دیا، مگر امام صاحب نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کو اس کا عیب بتا دیا تھا؟ ملازم نے جواب دیا کہ میں عیب بتانا بھول گیا، آپ نے پورے شہر کے اندر اس گاہک کی تلاش شروع کر دی جو وہ عیب دار تھان خرید کر لے گیا تھا، کافی تلاش کے بعد وہ گاہک مل گیا تو آپ نے اس کو بتایا کہ جو تھان آپ میری دوکان سے خرید کر لائے ہیں اس میں فلاں عیب ہے اس لئے آپ وہ تھان مجھے واپس کر دیں اور اگر اسی عیب کے ساتھ رکھنا چاہیں تو آپ کی خوشی۔

آج ہمارا حال

آج ہم لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ عیب نہیں بتاتے، بلکہ جانتے ہیں کہ یہ عیب دار سامان ہے اس میں فلاں خرابی ہے اس کے باوجود قسمیں کھا کر یہ باور کراتے ہیں کہ یہ بہت اچھی چیز ہے اعلیٰ درجے کی ہے اس کو خرید لیں۔ ہمارے اوپر یہ جو اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو رہا ہے کہ پورا معاشرہ عذاب میں مبتلا ہے، ہر شخص بدامنی اور بے چینی اور پریشانی میں ہے، کسی شخص کی بھی جان، مال، آبرو محفوظ نہیں ہے، یہ عذاب ہمارے انہیں گناہوں کا نتیجہ اور وبال ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کو چھوڑ دیا، سامان فروخت کرتے وقت اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے واضح نہیں کرتے، ملاوٹ، دھوکہ، فریب عام ہو چکا ہے۔

بیوی کے حقوق میں کوتاہی گناہ ہے

اسی طرح آج شوہر بیوی سے تو سارے حقوق وصول کرنے کو تیار ہے، وہ ہر بات میں میری اطاعت بھی کرے، کھانا بھی پکائے، گھر کا انتظام بھی کرے، بچوں کی پرورش بھی کرے، ان کی تربیت بھی کرے، اور میرے ماتھے پر شکن بھی نہ آنے دے، اور چشم و آبرو کے اشارے کی منتظر رہے یہ سارے حقوق وصول کرنے کو شوہر تیار ہے، لیکن جب بیوی کے حقوق ادا کرنے کا وقت آئے اس وقت ڈنڈی مار جائے، اور ان کو ادا نہ کرے، حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو حکم فرما دیا ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾(۱)

’’یعنی بیویوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو‘‘

اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ))(۲)

’’یعنی تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہو‘‘

ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا))(۳)

’’یعنی عورتوں کے حق میں بھلائی کرنے کی نصیحت کو قبول کرلو‘‘

یعنی ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔ اللہ اور اللہ کے رسول تو ان کے حقوق کی ادائیگی کی اتنی تاکید فرمارہے ہیں، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اپنی عورتوں کے پورے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں یہ سب کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے، اور شرعاً حرام ہے۔

مہر معاف کرانا حق تلفی ہے

ساری زندگی میں بے چاری عورت کا ایک ہی مالی حق شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے، وہ ہے مہر، وہ بھی شوہر ادا نہیں کرتا، ہوتا یہ ہے کہ ساری زندگی تو مہر ادا نہیں کیا، جب مرنے کا وقت قریب آیا تو بستر مرگ پر پڑے ہیں دنیا سے جانے والے ہیں، رخصتی کا منظر ہے اس وقت بیوی سے کہتے ہیں کہ مہر معاف کردو، اب اس موقع پر بیوی کیا کرے؟ کیا رخصت ہونے والے شوہر سے یہ کہہ دے کہ میں معاف نہیں کرتی، چنانچہ اس کو مہر معاف کرنا پڑتا ہے، ساری عمر اس سے فائدہ اٹھایا، ساری عمر تو اس سے حقوق طلب کئے، لیکن اس کا حق دینے کا وقت آیا تو اس میں ڈنڈی مار گئے۔

---

(۱) النساء:۱۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم:۱۰۸۲، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرة، رقم:۱۹۶۸، مسند أحمد، مسند ابی هریره، رقم:۷۰۹۵

(۳) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الوصاة بالنساء، رقم:۴۷۸۷، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم:۲۶۷۱، سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم:۱۰۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم:۱۸۴۱

نفقہ میں کمی حق تلفی ہے

یہ تو مہر کی بات تھی، نفقہ کے اندر شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس کو اتنا نفقہ دیا جائے کہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ گزارہ کرسکے، اگر اس میں کمی کرے گا تو یہ بھی کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے، اور حرام ہے، خلاصہ یہ کہ جس کسی کا کوئی حق دوسرے کے ذمے واجب ہو وہ اس کو پورا ادا کرے، اس میں کمی نہ کرے، ورنہ اس عذاب کا مستحق ہوگا جس عذاب کی وعید اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرمائی ہے۔

یہ ہمارے گناہوں کا وبال ہے

ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب ہم مجلس جما کر بیٹھتے ہیں تو حالات پر تبصرہ کرتے ہیں کہ بہت حالات خراب ہورہے ہیں، بدامنی ہے، بے چینی ہے، ڈاکے پڑرہے ہیں، جان محفوظ نہیں، مال محفوظ نہیں، معاشی بدحال کے اندر مبتلا ہیں، یہ سب تبصرے ہوتے ہیں، لیکن کوئی شخص ان تمام پریشانیوں کا حل تلاش کرکے اس کا علاج کرنے کو تیار نہیں ہوتا، مجلس کے بعد دامن جھاڑ کر اٹھ جاتے ہیں۔

یہ دیکھو کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ خود سے نہیں ہورہا ہے بلکہ کوئی کرنے والا کررہا ہے، اس کائنات کا کوئی ذرہ اور کوئی پتہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کرسکتا، لہٰذا اگر بدامنی اور بے چینی آرہی ہے تو اس کی مشیت سے آرہی ہے، اگر سیاسی بحران پیدا ہورہا ہے تو وہ بھی اللہ کی مشیت سے ہورہا ہے، اگر چوریاں اور ڈکیتیاں ہورہی ہیں تو اسی کی مشیت سے ہورہی ہیں، یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے؟ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيرٍ﴾ (۱)

"یعنی جو کچھ تمہیں برائی یا مصیبت پہنچ رہی ہے وہ سب تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے، اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں"

دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہ:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۲)

"یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ہر گناہ پر پکڑ کرنے پر آجائیں تو روئے زمین پر کوئی چلنے والا جانور باقی نہ رہے"

---

(۱) الشوریٰ: ۳۰ (۲) الفاطر: ٤٥

سب ہلاک و برباد ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اور اپنی رحمت سے بہت سے گناہ معاف کرتے رہتے ہیں، لیکن جب تم حد سے بڑھ جاتے ہو اس وقت اس دنیا کے اندر بھی تم پر عذاب نازل کئے جاتے ہیں تاکہ تم سنبھل جاؤ، اگر اب بھی سنبھل گئے تو تمہاری باقی زندگی بھی درست ہو جائے گی، اور آخرت بھی درست ہو جائے گی، لیکن اگر اب بھی نہ سنبھلے تو یاد رکھو دنیا کے اندر تو تم پر عذاب آ ہی رہا ہے، اللہ بچائے آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حرام کے پیسوں کا نتیجہ

آج ہر شخص اس فکر میں ہے کہ کسی طرح دو پیسے جلدی سے ہاتھ آ جائیں، کل کے بجائے آج ہی مل جائیں، چاہے حلال طریقے سے ملیں یا حرام طریقے سے ملیں، دھوکہ دے کر ملیں یا فریب دے کر ملیں، یا دوسرے کی جیب کاٹ کر ملیں، لیکن مل جائیں۔ یاد رکھو! اس فکر کے نتیجے میں تمہیں دو پیسے مل جائیں گے لیکن یہ دو پیسے نہ جانے کتنی بڑی رقم تمہاری جیب سے نکال کر لے جائیں گے، یہ دو پیسے دنیا میں تمہیں کبھی امن اور سکون نہیں دے سکتے، یہ دو پیسے تمہیں چین کی زندگی نہیں دے سکتے، اس لئے کہ یہ دو پیسے تم نے حرام طریقے سے اور دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر، دوسرے انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر حاصل کئے ہیں، لہٰذا گنتی میں تو یہ پیسے شاید اضافہ کر دیں لیکن تمہیں چین لینے نہیں دیں گے، اور کوئی دوسرا شخص تمہاری جیب پر ڈاکہ ڈال دے گا، اور اس سے زیادہ نکال کر لے جائے گا، آج بازاروں میں یہی ہو رہا ہے کہ آپ نے ملاوٹ کر کے دھوکہ دے کر پیسے کمائے، دوسری طرف دو مسلح افراد آپ کی دوکان میں داخل ہوئے اور اسلحہ کے زور پر آپ کا سارا اثاثہ اٹھا کر لے گئے، اب بتایئے! جو پیسے آپ نے حرام طریقے سے کمائے تھے وہ فائدہ مند ثابت ہوئے یا نقصان دہ ثابت ہوئے؟ لیکن اگر تم حرام طریقہ اختیار نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھتے تو اس صورت میں یہ پیسے اگرچہ گنتی میں کچھ کم ہوتے لیکن تمہارے لئے آرام اور سکون اور چین کا ذریعہ بنتے۔

عذاب کا سبب گناہ ہیں

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو بہت امانت اور دیانت کے ساتھ پیسے کمائے تھے، اس کے باوجود ہماری دوکان پر بھی ڈاکو آ گئے، اور لوٹ کر لے گئے، بات یہ ہے کہ ذرا غور کرو کہ اگرچہ تم نے امانت اور دیانت سے کمائے تھے، لیکن یقین کرو کہ تم سے کوئی نہ کوئی گناہ ضرور سرزد ہوا ہوگا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ یہی فرما رہے ہیں کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچ رہی یہ وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی

وجہ سے پہنچ رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ تم نے کوئی گناہ کیا ہو، لیکن اس کا خیال اور دھیان نہیں کیا، ہوسکتا ہے کہ تم نے زکوۃ پوری ادا نہ کی ہو، یا زکوۃ کا حساب صحیح نہ کیا ہو، یا اور کوئی گناہ کیا ہو اس کے نتیجے میں یہ عذاب تم پر آیا ہو۔

یہ عذاب سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا

دوسرے یہ کہ جب کوئی گناہ معاشرے میں پھیل جاتا ہے اور اس گناہ سے کوئی روکنے والا بھی نہیں ہوتا تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا کوئی عذاب آتا ہے تو عذاب یہ نہیں دیکھتا کہ کس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور کس نے نہیں کیا تھا، بلکہ وہ عذاب عام ہوتا ہے تمام لوگ اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً﴾(۱)

یعنی اس عذاب سے ڈرو، جو صرف ظالموں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا بلکہ جو لوگ ظلم سے علیحدہ تھے وہ بھی اس عذاب میں پکڑے جائیں گے، اس لئے کہ اگرچہ یہ لوگ خود تو ظالم نہیں تھے لیکن کبھی ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ظلم کو مٹانے کی جدوجہد نہیں کی، اس ظلم کے خلاف ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اس لئے گویا کہ وہ بھی اس ظلم میں ان کے ساتھ شامل تھے، لہٰذا یہ کہنا کہ ہم تو بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ تجارت کر رہے تھے اس کے باوجود ہمارے ہاں چوری ہوگئی اور ڈاکہ پڑ گیا، اتنی بات کہہ دینا کافی نہیں، اس لئے کہ اس امانت اور چوری کو دوسروں تک پہنچانے کا کام تم نے انجام نہیں دیا اس کو چھوڑ دیا، اس لئے اس عذاب میں تم بھی گرفتار ہوگئے۔

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کا یہ شیوہ تھا کہ تجارت بالکل صاف ستھری ہو، اس میں دیانت اور امانت ہو، دھوکہ اور فریب نہ ہو، آج مسلمانوں نے تو ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور انگریزوں اور امریکیوں اور دوسری مغربی اقوام نے ان چیزوں کو اپنی تجارت میں اختیار کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت کو فروغ ہو رہا ہے، دنیا پر چھا گئے ہیں۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یاد رکھو! باطل کے اندر کبھی ابھرنے اور ترقی کرنے کی طاقت ہی نہیں اس لئے کہ قرآن کریم کا صاف ارشاد ہے:

---

(۱) الأنفال: ۲۵

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (۱)
"یعنی باطل تو مٹنے کے لئے آیا ہے"

لیکن اگر کبھی تمہیں یہ نظر آئے کہ کوئی باطل ترقی کر رہا ہے، ابھر رہا ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، اور اس حق چیز نے اس کو ابھار دیا ہے، لہٰذا یہ باطل لوگ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے، آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کو دنیا کے اندر بھی ذلیل اور رسوا کر دیا جاتا، لیکن کچھ حق چیزیں ان کے ساتھ لگ گئیں وہ امانت اور دیانت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی تھیں وہ انہوں نے اختیار کر لی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت کو ترقی عطا فرمائی، آج وہ پوری دنیا پر چھا گئے، اور ہم نے تھوڑے سے نفع کے خاطر امانت اور دیانت کو چھوڑ دیا اور دھوکہ، فریب کو اختیار کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ یہ دھوکہ، فریب آگے چل کر ہماری اپنی تجارت کو تباہ و برباد کر دے گا۔

مسلمانوں کا طرۂ امتیاز

مسلمان کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تجارت میں کبھی دھوکہ اور فریب نہیں دیتا، ناپ تول میں کبھی کمی نہیں کرتا، کبھی ملاوٹ نہیں کرتا، امانت اور دیانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایسا ہی معاشرہ پیش کیا اور صحابہ کرام کی شکل میں ایسے ہی لوگ تیار کئے جنہوں نے تجارت میں بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کر لیا، لیکن دھوکہ اور فریب دینے کو گوارہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت بھی چمکائی اور ان کی سیاست بھی چمکائی، ان کا بول بالا کیا، اور انہوں نے دنیا سے اپنی طاقت اور قوت کا لوہا منوایا۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ عام مسلمان نہیں بلکہ وہ مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں لیکن جب وہ بازار میں جاتے ہیں تو سب احکام بھول جاتے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف مسجد تک کے لئے ہیں بازار کے لئے نہیں، خدا کے لئے اس فرق کو ختم کریں، اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے تمام احکامات کو بجالائیں۔

"تطفیف" سے متعلق تحقیق کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ "تطفیف" کے اندر وہ تمام صورتیں داخل ہیں جس میں ایک شخص اپنا حق تو پورا

(۱) الاسراء: ۸۱

پورا وصول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے لیکن اپنے ذمے جو دوسروں کے حقوق واجب ہیں وہ اس کو ادا نہ کرے، ایک حدیث شریف میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ))(۱)

''یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے''

یہ نہ ہو کہ اپنے لئے تو پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسروں کے لئے پیمانہ کچھ اور ہے، جب تم دوسروں کے ساتھ کوئی معاملہ کرو تو اس وقت یہ سوچو کہ اگر یہی معاملہ کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ کرتا تو مجھے ناگوار ہوتا، میں اس کو اپنے اوپر ظلم تصور کرتا، تو اگر میں بھی یہ معاملہ جب دوسروں کے ساتھ کروں گا تو وہ بھی آخر انسان ہیں، ان کو بھی اس سے ناگواری اور پریشانی ہوگی، ان پر ظلم ہوگا، اس لئے مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا ہم سب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا جائزہ لیں کہ کہاں کہاں ہم سے حق تلفیاں ہو رہی ہیں، کم ناپنا، کم تولنا، دھوکہ دینا، ملاوٹ کرنا، فریب دینا، عیب دار چیز فروخت کرنا، یہ تجارت کے اندر حرام ہے۔ جس کی وجہ سے تجارت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آ رہا ہے۔ یہ سب حق تلفی اور ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حقیقت کا فہم اور ادراک عطا فرمائے اور حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ''تطفیف'' کے وبال اور عذاب سے ہمیں نجات عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب من الايمان ان يحب لاخيه ما يحب لنفسه، رقم: ۱۲، صحيح مسلم، كتاب الايمان، رقم: ٦٤، سنن الترمذی كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، رقم: ۲٤۳۹، سنن النسائی، الايمان وشرائعه، رقم: ٤۹۳۰، سنن ابن ماجه المقدمة، رقم: ٦٥

دوہرے پیمانے ☆

قرآن کریم نے ناپ تول میں کمی کرنے کو جرم عظیم قرار دے کر جس طرح صحیح صحیح ناپنے اور تولنے کا حکم دیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ حکم ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے بار بار مختلف انداز اور اسلوب سے انتہائی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات کریمہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

''اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو'' (۱)

''پس پورا پورا ناپو اور تولو، اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو'' (۲)

''اور ناپ تول میں کمی نہ کرو'' (۳)

''اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا رکھو'' (۴)

''جب کوئی چیز ناپ کردو تو پورا پورا ناپو، اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو'' (۵)

''پورا پورا ناپو، اور (دوسروں) کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو، اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو'' (۶)

''اور اللہ نے آسمان کو بلند کیا، اور ترازو بنائی، تاکہ تم تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو، اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو، اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں'' (۷)

قرآن کریم نے جس صراحت اور جس تاکید کے ساتھ بار بار ناپ تول میں انصاف سے کام لینے پر زور دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناپ تول میں بے انصافی قرآن کریم کے نزدیک ان بنیادی بیماریوں میں سے ہے جو معاشرتی خرابیوں کی جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جنہیں مٹانے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ناپ تول میں کمی کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو شخص ترازو سے تول کر یا پیمانے

☆ ذکر و فکر، ص: ۹۷

(۱) الأنعام: ۱۵۲ (۲) الاعراف: ۸۵
(۳) هود: ۸٤ (٤) هود: ۸۵
(٥) بنی اسرائیل: ۳٥ (٦) الشعراء: ۱۸۱
(٧) الرحمٰن: ٧

سے ناپ کر کوئی چیز بیچ رہا ہو وہ ڈنڈی مار کر سودا کم دے؟ یقیناً ناپ تول میں کمی کرنے کا براہ راست مفہوم یہی ہے لیکن جس اسلوب و انداز سے قرآن کریم نے اس برائی کا ذکر فرمایا ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ برائی صرف اسی ایک صورت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر وہ قدم شامل ہے جس کے ذریعے کوئی شخص دوسرے کا کسی بھی قسم کا حق پامال کرے یا انصاف کے مطابق اس کا حق پورا پورا نہ دے۔

دراصل قرآن کریم نے ''ترازو'' کا لفظ عدل وانصاف اور ایفائے حقوق کی ایک علامت (Symbol) کے طور پر استعمال فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۃ شوریٰ اور سوہ حدید میں ''ترازو'' کو آسمانی کتاب کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے، سورہ شوریٰ میں ہے:

''اللہ وہی ہے جس نے حق پر مشتمل کتاب اتاری اور ترازو (نازل کی)''(۱)

اور سورہ حدید میں اسی بات کو مزید واضح کر کے فرمایا گیا:

''اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف قائم کریں''(۲)

اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی پیغمبر اپنے ہاتھ میں ترازو لے کر نہیں آئے جس سے سودا تولا جاتا ہے لہٰذا یہاں ''ترازو'' کا واضح مطلب ''عدل وانصاف'' اور ''اداء حقوق'' کی معنوی ترازو ہے، اور کتاب کے ساتھ ملا کر ترازو کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر آسمانی کتاب نظریاتی ہدایت فراہم کرتی ہے تو پیغمبر کا قول وفعل لوگوں کے سامنے وہ جچا تلا پیمانہ پیش کرتا ہے جو حق اور ناحق کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے، اور جس کی روشنی میں حقوق کی رتی رتی کا حساب رکھا جاسکتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناپ تول میں کمی کا لفظ ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، جب بھی کوئی شخص دوسرے کا کوئی حق ٹھیک ٹھیک ادا نہ کرے تو وہ ناپ تول میں کمی کا مرتکب ہے اور اس کا یہ فعل اتنا ہی قابل نفرت وملامت ہے جتنا سودا بیچتے وقت ڈنڈی مارنے کا عمل۔ جسے ہر شخص ذلالت اور کمینگی کی علامت سمجھتا ہے، لہٰذا ناپ تول کے سلسلے میں قرآن کریم کے جو ارشادات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جس کے ذمے دوسرے کا کوئی حق ہو، شوہر کے لئے ان ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کا حق پورا پورا ادا کرو، اور بیوی کے لئے ان کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کا حق پورا پورا ادا کرو، حکومت کے لئے ان کا مطلب یہ ہے

(۱) الشوریٰ:۱۷ (۲) الحدید:۲۵

کہ عوام کا حق پورا پورا ادا کرو، اور عوام کے لئے ان کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت کا حق پورا پورا ادا کرو، ملازم کے لئے ان ارشادات میں یہ ہدایت ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے جو فرائض تمہارے سپرد کئے گئے ہیں اور جن کے معاوضے میں تمہیں تنخواہ یا اجرت دی جارہی ہے وہ ٹھیک ٹھیک دیانت داری کے ساتھ بجا لاؤ، اور انتظامیہ کے لئے ان ارشادات میں یہ تاکید ہے کہ ملازم کے وہ تمام حقوق اسے پورے پورے پہنچاؤ جن کے معاوضے میں تم اس کی محنت سے استفادہ کر رہے ہو، غرض دنیا میں دو طرفہ تعلقات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے ان آیات کریمہ میں جامع رہنمائی موجود نہ ہو۔

پھر قرآن کریم نے مزید آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ناپ تول میں کمی کی بدترین شکل یہ ہے کہ انسان اپنے اور دوسرے کے لئے الگ الگ پیمانے بنالے، یعنی جب کسی کو دینے کا وقت آئے تو ناپ تول میں ڈنڈی مار جائے، لیکن جب خود اپنا حق وصول کرنے کا وقت آئے تو ایک رتی چھوڑنے کو تیار نہ ہو، ایسے لوگوں کے لئے قرآن کریم نے انتہائی مؤثر انداز میں یہ وعید بیان فرمائی ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ o يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ o﴾ (۱)

"برا ہو ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں کیا ایسے لوگوں کو ذرا خیال نہیں کہ وہ ایک زبردست دن میں اٹھائے جائیں گے اس دن جب تمام انسان رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے"

یہاں پھر اگرچہ لفظ ناپ تول میں کمی کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"پورا تولنا اور کم تولنا ہر کام میں ہوسکتا ہے"

لہٰذا اس آیت میں اصولی مذمت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جنہوں نے زندگی کے معاملات میں دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، جن کے لینے کا پیمانہ کچھ اور ہے اور دینے کا کچھ اور، جو اپنا مفاد حاصل کرنے میں بڑے تیز طرار اور دوسرے کا حق دینے میں بڑے بخیل اور خسیس ہیں، اور جو دن رات عدل وانصاف کا خون کر کے اپنی دولت کی گنتی میں اضافہ کرتے ہیں، لیکن اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کے وقت دولت کا یہ ظاہری اضافہ ان کے لئے کس

(۱) المطففین: ۱ تا ۶

ذلت ورسوائی اور کس عذاب کا سبب بنے گا؟

مقام حسرت ہے کہ آج ہم نے حقوق وفرائض کی ناپ تول میں اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ترازو کے بجائے زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں ان خود ساختہ، دوھرے پیمانوں کو اختیار کیا ہوا ہے، اور اپنے آپ کو قرآن کریم کی اس سنگین وعید کا مستحق بنا رکھا ہے۔

اگر ایک آجر اپنے مزدور سے اس کی آزاد مرضی کے بغیر مقررہ وقت سے زیادہ کام لیتا ہے اور اس اضافی محنت کا اسے الگ معاوضہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے اس دوھرے پیمانے کی وجہ سے قرآن کریم کی اس وعید میں داخل ہے اور اس طرح اس نے مزدور سے زائد خدمت لے کر جو فائدہ حاصل کیا ہے وہ اس کے لئے حرام ہے۔

اسی طرح اگر ایک مزدور یا ملازم اپنی ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں اپنے فرائض انجام دینے کے بجائے کام چوری کا مظاہرہ کرتا ہے یا اس وقت میں کوئی ذاتی کام انجام دیتا ہے لیکن تنخواہ پوری وصول کرتا ہے تو وہ بھی اس قرآنی وعید کا مصداق ہے، اور اس کی تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہے جو ذاتی کام میں خرچ کئے ہوئے وقت کے مقابل ہو۔ یہاں تک کہ ایک ملازم کے لئے اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں جبکہ اس کے پاس اپنی ڈیوٹی سے متعلق کرنے کا کام موجود ہو کوئی نفلی عبادت، مثلاً نفلی نماز یا تلاوت وغیرہ بھی جائز نہیں، اس کے ذمے اس وقت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی تندہی اور دیانت داری سے ادا کرے۔

یہ بات قلم پر آئی تو یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس معاملے میں بھی ہمارے یہاں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، بعض ملازمین ڈیوٹی کے اوقات میں نفلی عبادتیں شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے ذمے کام پڑا ہوا ہوتا ہے لیکن دوسری طرف انتظامیہ کے بعض افراد اپنے ملازمین کو پانچ وقت کی فرض نمازوں کی ادائیگی کا بھی موقع نہیں دیتے۔ حالانکہ فرض نماز کی ادائیگی بہرصورت ضروری ہے، اور انتظامیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کے لئے اس کا انتظام کرے، یہ درست ہے کہ ملازم آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا پابند ہے، لیکن طبعی ضروریات کی انجام دہی خود بخود اس مدت سے مستثنیٰ ہے، فرض نماز بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کی طبعی ضروریات، للہٰذا اس کی ادائیگی کا وقت بھی ڈیوٹی سے خود بخود مستثنیٰ ہوگا، البتہ ملازم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اعتدال کے ساتھ نماز فرض (سنتوں سمیت) ادا کرنے پر اکتفا کرے اور اس میں ناواجبی دیر نہ لگائے، نہ کسی اور نفلی عبادت میں مشغول ہو۔

یہ بات تو ضمنی طور پر بیچ میں آگئی، کہنا یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے حالات کا جائزہ

لے کر یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم اپنا حق پورا لے کر دوسرے کے حق میں کوتاہی کرنے کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟ ہم نے اپنے اور دوسروں کے لئے الگ الگ پیمانے تو نہیں بنا رکھے؟ ہم دوسروں سے اس چیز کا مطالبہ تو نہیں کر رہے جو ان کی جگہ ہونے کی صورت میں انہیں دینے کے لئے تیار نہ ہوتے؟ جب تک یہ فکر ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوگی اور ہم قرآن کریم کی اس وعید میں داخل ہونے سے ڈرنے نہیں لگیں گے اس وقت تک ان حق تلفیوں اور بدعنوانیوں میں کمی نہیں آئے گی جنہوں نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے، اور جن کی وجہ سے ہر انسان خوف و ہراس، تشویش اور بے چینی کا شکار ہے، کیونکہ جب معاشرے میں حق تلفیوں کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس کا صافی نتیجہ (Net result) سب کی پریشانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، ایک شخص اگر دس آدمیوں کی حق تلفی کرتا ہے تو دوسرے دس آدمی اس کا حق اڑا لے جاتے ہیں اور آخر میں فتح صرف شیطان کی ہوتی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰه رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

حلال روزگار نہ چھوڑیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ رُزِقَ فِيْ شَيْءٍ فَلْيَلْزَمْهُ))(۱)

''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو جس کام کے ذریعہ رزق مل رہا ہو اس کو چاہئے کہ وہ اس کام میں لگا رہے اپنے اختیار اور مرضی سے بلاوجہ اس کو نہ چھوڑے''

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ جُعِلَتْ مَعِيْشَتُهُ فِيْ شَيْءٍ فَلَا يَنْتَقِلْ عَنْهُ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ عَلَيْهِ)) (۲)

''جس شخص کا روزگار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہو تو وہ شخص اس روزگار کو چھوڑ کر دوسری طرف منتقل نہ ہو، جب تک کہ وہ روزگار خود سے بدل جائے یا اس روزگار میں خود سے ناموافقت پیدا ہو جائے''

رزق کا ذریعہ، اللہ کی جانب سے ہے

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی شخص کے لئے حصول رزق کا ایک ذریعہ مقرر فرما دیا وہ شخص اس میں لگا ہوا ہے اور اس کے ذریعے اس کو رزق مل رہا ہے تو اب بلاوجہ اس روزگار کو چھوڑ کر الگ نہ ہو، بلکہ اس میں لگا رہے تاوقتیکہ وہ خود اس کے ہاتھ سے نکل جائے یا ایسی ناموافقت پیدا ہو جائے کہ اب آئندہ اس کو جاری رکھنا پریشانی کا سبب ہوگا، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعہ سے رزق

☆ اصلاحی خطبات (۷/ ۱۳۰ تا ۱۴۴) ۱۷ مئی ۱۹۹۶ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم کراچی

(۱) كشف الخفاء، رقم: ٢٥٨١ (١٥٧٨/٢)، فيض القدير، رقم: ٨٠٧٢ (١٣٧/٦)، الجامع الصغير وزيادته، رقم: ١٢٣٧٣ (١٢٣٨/١)، شعب الإيمان، رقم: ١٢٤١ (٨٩/٢)، كنز العمال، رقم: ٢٩٨٦، إتحاف السادة المتقين (٢٨٧/٤)

(۲) كشف الخفاء (١٣٧٣/٢)، كنز العمال، رقم: ٢٩٨٦، إتحاف السادة المتقين (٢٨٧/٤)

وابستہ کر دیا ہے تو یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اس کام میں لگایا گیا ہے اور اس سے وابستہ کیا گیا ہے، کیونکہ ویسے تو رزق کے حصول کے ہزاروں راستے اور طریقے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے لئے کسی خاص طریقے کو رزق حاصل کرنے کا سبب بنا دیا تو یہ منجانب اللہ ہے اب اس منجانب اللہ طریقے کو اپنی طرف سے بلاوجہ نہ چھوڑے۔

روزگار اور معیشت کا نظام خداوندی

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں روزگار اور معیشت کا ایک عجیب نظام بنایا ہے جس کو ہماری عقل نہیں پہنچ سکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُم مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِي الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا﴾(۱)

''یعنی ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کی ہے''

وہ اس طرح کہ کسی انسان کے دل میں حاجت پیدا کی اور دوسرے انسان کے دل میں اس حاجت کو پورا کرنے کا طریقہ ڈال دیا، ذرا غور کریں کہ انسان کی حاجتیں اور ضرورتیں کتنی ہیں؟ روٹی کی اسے ضرورت ہے، کپڑے کی اسے ضرورت ہے، مکان کی اسے ضرورت ہے، گھر کا ساز و سامان اور برتنوں کی اسے ضرورت ہے، گویا کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے بے شمار اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا پوری دنیا کے انسانوں نے مل کر کوئی کانفرنس کی تھی اور اس کانفرنس میں انسان کو پیش آنے والی ضروریات کو شمار کیا تھا، اور پھر آپس میں فیصلہ کیا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا بنائیں، اتنے انسان برتن بنائیں، اتنے انسان جوتے بنائیں، اتنے انسان گندم پیدا کریں اور اتنے انسان چاول پیدا کریں وغیرہ۔ اگر تمام انسان ملکر کانفرنس کر کے یہ طے کرنا چاہتے تب بھی یہ انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا احاطہ کر لیں، اور پھر آپس میں تقسیم کار بھی کریں کہ تم یہ کام کرنا، تم فلاں چیز کی دوکان کرنا، اور تم فلاں چیز کی دوکان کرنا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا قائم کیا ہوا نظام ہے کہ اس نے ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گندم اگاؤ، دوسرے انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم آٹے کی چکی لگاؤ، ایک کے دل میں ڈال دیا کہ چاول پیدا کرو، ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گھی کی دوکان لگاؤ، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے دل میں ان حاجات کو ڈال دیا جو تمام انسانوں کی حاجتیں ہیں، چنانچہ جب آپ کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہیں اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آپ کے پاس پیسے بھی ہوں تو بازار میں آپ کی وہ حاجت انشاء اللہ ضرور پوری ہو جائے گی۔

---

(۱) الزخرف: ۳۲

تقسیم رزق کا حیرت ناک واقعہ

میرے بڑے بھائی جناب زکی کیفی صاحب اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے، ایک دن انہوں نے فرمایا کہ تجارت میں بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے ایسے منظر دکھاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رزاقیت کے آگے سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی دوکان "ادارۂ اسلامیات" کے نام سے ہے، وہاں بیٹھا کرتے تھے، فرمایا کہ ایک دن جب میں نے صبح کو گھر سے دوکان جانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ شدید بارش شروع ہوگئی، اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ایسی شدید بارش ہو رہی ہے، اس وقت سارا نظام زندگی تلپٹ ہے، ایسے میں دوکان جا کر کیا کروں گا؟ کتاب خریدنے کے لئے کون دوکان پر آئیگا، اس لئے کہ ایسے وقت میں اول تو لوگ گھر سے باہر نہیں نکلتے، اگر نکلتے بھی ہیں تو شدید ضرورت کے لئے نکلتے ہیں، کتاب اور خاص طور پر دینی کتاب تو ایسی چیز ہے کہ جس سے نہ تو بھوک مٹ سکتی ہے نہ کوئی دوسری ضرورت پوری ہوسکتی ہے، اور جب انسان کی دنیاوی تمام ضروریات پوری ہو جائیں تو اس کے بعد کتاب کا خیال آتا ہے، لہٰذا ایسے میں کون گاہک کتاب خریدنے آئے گا؟ اور میں دوکان پر جا کر کیا کروں گا؟ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے تو اپنے روزگار کے لئے ایک طریقہ اختیار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کو میرے لئے رزق کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا ہے، اس لئے میرا کام یہ ہے کہ میں جا کر دوکان کھول کر بیٹھ جاؤں، چاہے کوئی گاہک آئے یا نہ آئے، بس میں نے چھتری اٹھائی اور دوکان کی طرف روانہ ہوگیا، جا کر دوکان کھولی اور قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی، اس خیال سے کہ گاہک تو کوئی آئے گا نہیں تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ لوگ اپنے اوپر برساتی ڈال کر آرہے ہیں، اور کتابیں خرید رہے ہیں اور ایسی کتابیں خرید رہے ہیں کہ جن کی بظاہر وقتی ضرورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ جتنی بکری اور دنوں میں ہوتی تھی تقریباً اتنی ہی بکری اس بارش میں بھی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! اگر کوئی انسان عقل سے سوچے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس آندھی اور طوفان والی تیز بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ جا کر کتاب خریدیں، اور میرے دل میں یہ ڈالا کہ تم جا کر دوکان کھولو۔ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور ان کو کتاب کی ضرورت تھی، اور دونوں کو دوکان پر جمع کر دیا، ان کو کتاب مل گئی مجھے پیسے مل گئے۔ یہ نظام صرف اللہ تعالیٰ بنا سکتے ہیں، کوئی شخص یہ چاہے کہ

میں منصوبے کے ذریعہ اور کانفرنس کر کے یہ نظام بنالوں؟ یا ہمی منصوبہ بندی کر کے بنالوں تو کبھی ساری عمر نہیں بنا سکتا۔

رات کو سونے اور دن میں کام کرنے کا فطری نظام

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ذرا اس بات میں غور کرو کہ سارے انسان رات کے وقت سوتے ہیں اور دن کے وقت کام کرتے ہیں۔ اور رات کے وقت نیند آتی ہے اور دن کے وقت نیند بھی نہیں آتی، تو کیا ساری دنیا کے انسانوں کے ملکر کوئی انٹرنیشنل کانفرنس کی تھی جس میں سب انسانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دن کے وقت کام کریں گے اور رات کے وقت سویا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ رات کے وقت سو جاؤ اور دن کے وقت کام کرو۔

﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًاo وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًاo﴾(۱)

اگر یہ چیز انسان کے اختیار میں دے دی جاتی کہ وہ جب چاہے کام کرے اور جس وقت چاہے سو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی شخص کہتا کہ میں دن کو سوؤں گا اور رات کو کام کروں گا، کوئی کہتا کہ میں شام کو سوؤں گا اور صبح کے وقت کام کروں گا، کوئی کہتا کہ میں صبح کے وقت سوؤں گا اور شام کے وقت کام کروں گا، پھر اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک وقت میں ایک شخص سونا چاہ رہا ہے اور دوسرا شخص اسی وقت کھٹ کھٹ کر رہا ہے اور اپنا کام کر رہا ہے، اور اس کی وجہ سے دوسرے کی نیند خراب ہوتی، اس طرح دنیا کا نظام خراب ہو جاتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ دن کے وقت کام کرو اور رات کے وقت آرام کرو۔ اور اس کو فطرت کا ایک تقاضا بنا دیا۔

رزق کا دروازہ بند مت کرو

بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی معیشت کا نظام بھی خود بنایا ہے اور ہر ایک کے دل میں یہ ڈال دیا ہے کہ تم یہ کام کرو اور تم یہ کام کرو، لہٰذا جب تم کو کسی کام پر لگا دیا گیا اور تمہارا رزق ایک ذریعہ سے وابستہ کر دیا گیا تو یہ کام خود سے نہیں ہو گیا بلکہ کسی کرنے والے نے کیا، اور کسی مصلحت سے کیا، لہٰذا اب بلا وجہ اس حلال ذریعہ رزق کو چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ اختیار کرنے کی فکر مت کرو، کیا معلوم

(۱) النبأ: ۱۰ تا ۱۱، مذکورہ آیات کا ترجمہ یہ ہے "اور ہم نے رات کو لباس اور دن کو روزگار کا ذریعہ بنایا ہے"

کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی ذریعہ میں کوئی مصلحت رکھی ہو، اور تمہارے اس کام میں لگنے کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں کے کام نکل رہے ہوں، اور تم اس وقت پورے نظام معیشت کا ایک حصہ اور پرزہ بنے ہوئے ہو، اس لئے اپنی طرف سے اس ذریعہ کو مت چھوڑو، البتہ اگر کسی وجہ سے وہ ملازمت یا وہ تجارت خود ہی چھوٹ جائے یا اس کے اندر ناموافقت پیدا ہو جائے۔ مثلاً دوکان پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے اور کوشش کے باوجود آمدنی بالکل نہیں ہو رہی ہے تو اس صورت میں بیشک اس ذریعہ کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ اختیار کر لے، لیکن جب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو اس وقت تک خود سے رزق کا دروازہ بند نہ کرے۔

یہ عطاء خداوندی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا است
اورا تو رد مکن کہ فرستادہ خدا است

''یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز طلب کے بغیر مل جائے تو اس کو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو رد نہ کرو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے''

بہرحال! اللہ تعالیٰ نے جس ذریعہ سے تمہارا رزق وابستہ کیا ہے اس سے لگے رہو، جب تک کہ خود ہی حالات نہ بدل جائیں۔

ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اس حدیث کے تحت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اہل طریق نے اسی پر تمام معاملات کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے ساتھ واقع ہوتے ہیں قیاس کیا ہے، جن کی معرفت، بصیرت اور فراست خصوصاً واقعات سے ہو جاتی ہے، اس معرفت کے بعد وہ ان میں تغیر اور تبدل از خود نہیں کرتے، اور یہ امر قوم کے نزدیک مثل بدیہیات کے بلکہ مثل محسوسات کے ہے جس کی وہ اپنے احوال میں رعایت رکھتے ہیں''

مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ اگرچہ براہ راست رزق سے متعلق ہے لیکن صوفیاء کرام اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کے

ساتھ جو بھی معاملہ کر رکھا ہے، مثلاً علم میں، خلق کے ساتھ تعلقات میں یا کسی اور چیز میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کر رکھا ہے تو وہ شخص اس کو اپنی طرف سے بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اس پر قائم رہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خلافت کیوں نہیں چھوڑی؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خلافت کے آخری دور میں ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا، اور اس کی وجہ بھی خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے اور تم اپنے اختیار سے اس قمیص کو مت اتارنا۔ (۱)

لہٰذا یہ خلافت جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خلافت کی قمیص پہنائی ہے میں اپنے اختیار سے اس کو نہیں اتاروں گا، چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کے خلاف تلوار اٹھائی، اور نہ ان کا قلع قمع کرنے کا حکم دیا، حالانکہ آپ امیر المومنین اور خلیفۂ وقت تھے آپ کے پاس لشکر اور فوج تھی، آپ چاہتے تو باغیوں کے خلاف مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن آپ نے فرمایا کہ چونکہ یہ باغی اور مجھ پر حملہ کرنے والے بھی مسلمان ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے والا پہلا شخص میں ہو جاؤں۔ چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کا مقابلہ کیا، بلکہ اپنے گھر کے اندر ہی محصور ہو کر بیٹھ گئے، حتیٰ کہ اپنی جان قربان کر دی اور جام شہادت نوش فرمایا۔ شہادت قبول کر لی لیکن خلافت نہیں چھوڑی۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذمے ایک کام سپرد کر دیا تو اس میں لگے رہو، اپنی طرف سے اس کو مت چھوڑو۔

خدمت خلق کا منصب عطاء خداوندی ہے

بہر حال اللہ تعالیٰ نے جب خدمت دین کا کوئی راستہ تمہارے لئے تجویز فرما دیا اور وہ تمہاری طلب کے بغیر ملا ہے تو اب بلا وجہ اس کو ترک نہ کرو، تمہارے لئے اسی میں نور اور برکت ہے، اسی طرح اہل طریق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جتنے احوال اور معاملات ہوتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ، باب فی مناقب عثمان بن عفان، رقم: ۳۶۳۸، سنن ابن ماجہ، المقدمہ، رقم: ۱۰۹، مسند أحمد، باقی مسند الانصار، رقم: ۲۳۳۲۶

احوال کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر قبول کرلیں، اسی طرح بعض اوقات کسی شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہوتا ہے، مثلاً ایک شخص کی طرف لوگ اپنی مدد اور اس کے تعاون کے لئے رجوع کرتے ہیں یا دین کے معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، یا دنیاوی معاملات میں اس سے مشورہ لینے کے لئے رجوع کرتے ہیں، تو حقیقت میں یہ ایک ایسا منصب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ آپس کے معاملات میں اس شخص سے مشورہ کرو، یا ضرورت کے موقع پر اس شخص سے مدد لو، اور جھگڑے ہوں تو اس شخص سے جا کر فیصلہ کراؤ، لوگوں کے دلوں میں یہ بات از خود پیدا نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ باتیں ڈال دیں، تو یہ منصب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے، اب اپنی طرف سے اس کو ختم نہ کرے، اس لئے کہ یہ منجانب اللہ ہے اور اس خدمت خلق کو منجانب اللہ سمجھ کر کرتا رہے۔

مثلاً بعض اوقات اللہ تعالیٰ خاندان میں سے کسی شخص کو یہ مقام اور منصب عطا فرما دیتے ہیں کہ جہاں خاندان میں کوئی جھگڑا ہو یا کوئی اہم معاملہ کرنا ہے تو لوگ فوراً اس شخص کے پاس جاتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں، اب بعض اوقات وہ شخص اس بات سے گھبراتا ہے کہ دنیا کی ساری باتیں اور سارے جھگڑے میرے سر ڈالے جاتے ہیں، حقیقت میں یہ گھبرانے کی چیز نہیں ہے اس لئے کہ لوگوں کا آپ کی طرف رجوع کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں ڈالا گیا ہے کہ اس کی طرف رجوع کرو، اور یہ منصب منجانب اللہ عطا ہوا ہے۔

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

لہٰذا اس منصب سے بے نیازی مت برتو، بلکہ اس کو خوشی سے قبول کرلو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ خدمت سونپی گئی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھئے کہ ایک مرتبہ آپ غسل فرما رہے تھے، غسل کے دوران آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہوگئیں، چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا اور تتلیاں جمع کرنی شروع کردیں۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا "اے ایوب! کیا ہم نے تم کو غنی نہیں کیا، اور تمہیں مال و دولت نہیں دی؟

پھر بھی تم اس سونے کو جمع کرنے کی طرف دوڑ رہے ہو"

جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا "یا اللہ! بیشک آپ نے اتنا مال و دولت عطا فرمایا ہے کہ میں اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا، لیکن جو دولت آپ اپنی طرف سے میری طلب کے بغیر عطا فرما رہے ہیں اس سے میں کبھی بے نیازی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا، آپ میرے اوپر سونے کی تتلیاں برسا رہے ہیں تو میرا کام یہ ہے کہ میں محتاج بن کر ان کی طرف جاؤں اور ان کو حاصل کروں" (۱)

بات دراصل یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی نظر میں وہ تتلیاں مقصود نہیں تھیں اور نہ وہ سونا مقصود تھا جو آسمان سے گر رہا تھا بلکہ ان کی نظر اس دینے والی ذات پر تھی کہ کس ہاتھ سے یہ دولت مل رہی ہے، اور جب دینے والی ذات اتنی عظیم ہو تو انسان کو آگے بڑھ کر اور محتاج بن کر لینا چاہئے، ورنہ اس سونے کی طلب نہیں تھی۔

عیدی زیادہ طلب کرنے کا واقعہ

اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سب اولادوں کو عید کے موقع پر عیدی دیا کرتے تھے، ہم سب بھائی ہر سال عید کے موقع پر جا کر ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ پچھلی عید پر آپ نے بیس روپے دیئے تھے، اس سال گرانی میں اضافہ ہو گیا ہے، لہٰذا اس سال پچیس روپے دیجئے، تو ہر سال بڑھا کر مانگتے کہ بیس کی جگہ پچیس، اور پچیس کی جگہ تیس روپے اور تیس کے پینتیس روپے مانگتے، جواب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ تم چور ڈاکو لوگ ہو اور ہر سال تم زیادہ مانگتے ہو، دیکھئے! اس وقت ہم سب بھائی برسر روزگار اور ہزاروں کمانے والے تھے، لیکن جب باپ کے پاس جاتے تو رغبت کا اظہار کر کے ان سے مانگتے، کیوں؟ بات درحقیقت یہ تھی کہ نظر ان پیسوں کی طرف نہیں تھی جو بیس، پچیس اور تیس روپے کی شکل میں مل رہے تھے بلکہ نظر اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی کہ اس ہاتھ سے جو کچھ ملے گا اس میں جو برکت اور نور ہوگا ہزاروں اور لاکھوں میں وہ برکت اور نور حاصل نہیں ہو سکتا، جب دنیا کے معمولی تعلقات میں انسان کا یہ حال ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں، ان کے ساتھ تعلق میں کیا حال ہوگا؟

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ سے مانگے تو محتاج بن کر مانگے، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو تو محتاج بن کر اس کو لے لے، اس وقت بے نیازی اختیار نہ کرے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الغسل، باب من اغتسل عريانا وحده في الخلوة ومن تستر، رقم: ۲۷۰، سنن النسائي، كتاب الغسل والتيمم، باب الاستتار عند الاغتسال، رقم: ٤٠٦، مسند أحمد، مسند ابي هريره، رقم: ۷۸۱۲

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

''جب وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ میں ان کے سامنے طمع ظاہر کروں تو ایسے میں قناعت کے سر پر خاک''

اس وقت تو اس میں لذت اور مزہ ہے کہ آدمی لالچی بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر مانگے اور جو ملے اس کو قبول کر لے۔ لہٰذا جس کام پر اللہ تعالیٰ نے لگا دیا یا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا یہ ان کی طرف سے عطا ہے، اس کو اپنی طرف سے مت چھوڑو، ہاں اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن کی وجہ سے آدمی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے یا کوئی اپنا بڑا کہہ دے۔ مثلاً چھوڑنے کے لئے کسی بڑے سے مشورہ کیا اور اس نے یہ کہہ دیا کہ اب تمہارے لئے اس کو چھوڑ دینا ہی مناسب ہے تو اس وقت اس کو چھوڑ دو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خاص طلب کے بغیر جو چیز ملے وہ منجانب اللہ ہے اس کی ناقدری مت کرو۔

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا ست
او را تو رد مکن کہ فرستادہ خدا ست

وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے اس کو رد مت کرو، اللہ تعالیٰ بچائے، بعض اوقات اس رد کرنے اور بے نیازی کا اظہار کرنے سے انجام بہت خراب ہو جاتا ہے، العیاذ باللہ۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آ جاتا ہے، لہٰذا جو چیز طلب کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ جائے یا ایسے خدا ساز اسباب کے ذریعہ یعنی ایسے اسباب کے ذریعہ کوئی چیز مل گئی جس کا پہلے وہم وگمان بھی نہیں تھا، بشرطیکہ وہ حلال اور جائز ہو تو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو قبول کر لینا چاہئے۔

اسی طرح جس خدمت پر اللہ تعالیٰ کسی کو لگا دے تو اس کو اس خدمت پر لگا رہنا چاہئے، اس خدمت سے اپنے طور پر دست بردار ہونے کی کوشش نہ کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس خدمت پر لگا دیا ہے اور تم سے وہ خدمت لے رہے ہیں، اسی طرح اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری طلب کے بغیر کوئی مقام اور منصب عطا فرما دیا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے تمہیں سردار بنا دیا اور لوگ تمہیں اپنا قائد سمجھتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ایک خدمت تمہارے ذمے سپرد کی ہے، تمہیں اس خدمت کا

حق ادا کرنا ہے، لیکن اپنے بارے میں یہ خیال کرو کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں نہ تو قائد بننے کے لائق ہوں اور نہ سردار بننے کے لائق ہوں۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت پر لگا دیا ہے اس لئے اس خدمت پر لگا ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰه رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

رزق حلال کی طلب، ایک دینی فریضہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(۱)

رزق حلال کی طلب دوسرے درجے کا فریضہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''رزق حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے''

اگر چہ سند کے اعتبار سے محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے لیکن علماء امت نے اس حدیث کو معنی کے اعتبار سے قبول کیا ہے، اور اس بات پر ساری امت کے علماء کا اتفاق ہے کہ معنی کے اعتبار سے حدیث صحیح ہے، اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم اصول بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ رزق حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے، یعنی دین کے اولین فرائض تو وہ ہیں جو ارکان اسلام کہلاتے ہیں اور جن کے بارے میں ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ چیزیں دین میں فرض ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، زکوۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔

یہ سب دین کے اولین فرائض ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ''رزق حلال کو طلب کرنا اور رزق حلال کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے'' یہ ایک مختصر سا ارشاد اور مختصر سی تعلیم ہے لیکن اس حدیث میں بڑے عظیم علوم بیان فرمائے گئے ہیں، اگر

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۱۸۴ تا ۲۰۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم کراچی

(۱) كنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۴/۱۶)، كشف الخفاء، رقم: ۱۶۷۱ (۲/۴۶)، سنن البيهقي، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲/۲۴)، الجامع الكبير للسيوطي، رقم: ۳۵ (۱/۱۴۰۸۵)، جامع الأحاديث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱۴/۱۲۸)، مشكوة المصابيح، رقم: ۲۷۸۱ (۲/۱۲۹)، شعب الإيمان، رقم: ۸۷۴۱ (۶/۴۲۱)

آدمی اس حدیث میں غور کرے تو دین کی فہم عطا کرنے کے لئے اس میں بڑا سامان ہے۔

رزق حلال کی طلب دین کا حصہ ہے

اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہم اور آپ رزق حلال کی طلب میں جو کچھ کارروائی کرتے ہیں، چاہے وہ تجارت ہو، چاہے وہ کاشت کاری ہو، چاہے وہ ملازمت ہو، چاہے وہ مزدوری ہو، یہ سب کام دین سے خارج نہیں ہیں بلکہ یہ سب بھی دین کا حصہ ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہ کام جائز اور مباح ہیں بلکہ ان کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، اور نماز، روزے کے فرائض کے بعد اس کو بھی دوسرے درجے کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کام نہ کرے اور رزق حلال کی طلب نہ کرے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ جائے تو وہ شخص فریضہ کے ترک کرنے کا گناہگار ہوگا، اس لئے کہ اس نے ایک فرض اور واجب کام کو چھوڑ رکھا ہے کیونکہ شریعت کا مطالبہ ہے کہ انسان سست ہو کر اور بیکار ہو کر نہ بیٹھ جائے اور کسی دوسرے کا دست نگر نہ بنے، اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، اور ان چیزوں سے بچنے کا راستہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنی وسعت اور کوشش کے مطابق رزق حلال طلب کرتا رہے تا کہ کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق ہمارے اوپر واجب فرمائے ہیں اسی طرح کچھ حقوق ہمارے اوپر ہمارے نفس سے متعلق اور ہماری ذات سے متعلق ہمارے گھر والوں سے متعلق بھی واجب فرمائے ہیں، اور رزق حلال کی طلب کے بغیر یہ حقوق ادا نہیں ہو سکتے، اس لئے ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی رزق حلال طلب کرے۔

اسلام میں ''رہبانیت'' نہیں

اس حدیث کے ذریعہ اسلام نے ''رہبانیت'' کی جڑ کاٹ دی، عیسائی مذہب میں رہبانیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا راستہ اور طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے دنیاوی کاروبار کو چھوڑے اور اپنے نفس اور ذات کے مطالبوں کو ختم کرے اور جنگل میں جا کر بیٹھ جائے اور وہاں پر اللہ اللہ کیا کرے۔ بس اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے اندر نفسانی تقاضے رکھے، بھوک اس کو لگتی ہے، پیاس اس کو لگتی ہے، جسم ڈھانپنے کے لئے اس کو کپڑے کی بھی ضرورت ہے، سر چھپانے کے لئے اس کو مکان کی بھی ضرورت ہے، یہ سارے تقاضے

ہم نے اس کے اندر پیدا کیے، اب ہمارا مطالبہ اس انسان سے یہ ہے کہ وہ ان تقاضوں کو بھی پورا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے حقوق بھی ادا کرے، تب وہ انسان کامل بنے گا۔ اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تو ایسا انسان چاہے کتنا ہی ذکر وعبادت میں مشغول ہو لیکن ایسا شخص ہمارے یہاں قبولیت کا اور قرب کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

حضور ﷺ اور رزق حلال کے طریقے

دیکھئے! جتنے انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے کسب حلال کا کام ضرور کرایا اور حلال رزق کے حصول کے لئے ہر نبی نے جدوجہد کی، کوئی نبی مزدوری کرتے تھے، کوئی نبی بڑھئی کا کام کرتے تھے، کوئی نبی بکریاں چرایا کرتے تھے، خود حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہاڑوں پر اجرت پر بکریاں چرائیں، بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یاد ہے کہ میں اجیاد کے پہاڑ پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(۱)

بہرحال! بکریاں آپ نے چرائیں، مزدوری آپ نے کی، تجارت آپ نے کی، چنانچہ تجارت کے سلسلے میں آپ نے شام کے دو سفر کئے، جس میں آپ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا سامان تجارت لیکر شام تشریف لے گئے، زراعت آپ نے کی، مدینہ طیبہ سے کچھ فاصلے پر مقام جُرف تھا، وہاں پر آپ نے زراعت کا کام کیا، لہٰذا کسب حلال کے جتنے طریقے ہیں ان سب میں آپ ﷺ کا حصہ اور آپ کی سنت موجود ہے، اگر کوئی شخص ملازمت کر رہا ہے تو یہ نیت کر لے کہ میں حضور ﷺ کی سنت کی اتباع میں یہ ملازمت کر رہا ہوں، اگر کوئی شخص تجارت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کر لے کہ میں حضور ﷺ کی اتباع میں تجارت کر رہا ہوں اور اگر کوئی زراعت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کر لے کہ میں نبی کریم ﷺ کی اتباع میں زراعت کر رہا ہوں تو اس صورت میں یہ سب کام دین کا حصہ بن جائیں گے۔

مومن کی دنیا بھی دین ہے

اس حدیث نے ایک غلط فہمی یہ دور کر دی ہے کہ دین اور چیز کا نام ہے اور دنیا کسی الگ چیز کا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاجارة، باب رعی الغنم علی قراریط، رقم:۲۱۰۲، صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب فضیلة الاسود من الکباث، رقم:۳۸۲۲، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الصناعات، رقم:۲۱٤۰، مسند أحمد، رقم:۱۱٤۸۲، سنن الدارمی، کتاب المقدمة، باب کیف کان اول شان النبی، رقم:۱۳

نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان غور سے دیکھے تو ایک مومن کی دنیا بھی دین ہے، جس کام کو وہ دنیا کا کام سمجھ رہا ہے یعنی رزق حاصل کرنے کی فکر اور کوشش، یہ بھی درحقیقت دین ہی کا حصہ ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طریقے سے کرے اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم کی اتباع میں کرے، بہر حال ایک بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ رزق حلال کی طلب بھی دین کا حصہ ہے، اگر یہ بات ایک مرتبہ ذہن میں بیٹھ جائے تو پھر بے شمار گمراہیوں کا راستہ بند ہو جائے۔

بعض صوفیاء کرام کا توکّل کر کے بیٹھ جانا

بعض صوفیاء کرام کی طرف یہ منسوب ہے اور ان سے یہ طرزِ عمل منقول ہے کہ انہوں نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا اور رزق کی طلب میں کوئی کام نہیں کیا بلکہ توکل کی زندگی اس طرح گزار دی کہ بس اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ غیب سے بھیج دیا اس پر شکر کیا اور قناعت کر لی، اگر نہیں بھیجا تو صبر کر لیا، بعض صوفیاء کرام سے یہ طرزِ عمل منقول ہے۔ اس بارے میں یہ سمجھ لیں کہ صوفیاء کرام سے اس قسم کا جو طرزِ عمل منقول ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ صوفیاء کرام ایسے تھے جن پر غلبہ حال کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ استغراق کے عالم میں تھے اور اپنے عام ہوش وحواس کے عالم میں نہیں تھے، اور جب انسان اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو تو وہ احکام شریعت کا مکلّف نہیں ہوتا، اس وجہ سے اگر ان صوفیاء کرام نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو یہ ان کا اپنا مخصوص معاملہ تھا، تمام امت کے لئے وہ عام حکم نہیں تھا۔

یا پھر ان صوفیاء کرام کا توکل اتنا زبردست اور کامل تھا کہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ اگر ہم پر مہینوں فاقہ بھی گزرتا ہے تو ہمیں کوئی فکر نہیں، ہم نہ تو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے نہ کسی کے سامنے شکوہ کریں گے، یہ صوفیاء بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے، بڑے اعلیٰ درجے کے مقامات پر فائز تھے، انہوں نے اسی پر اکتفا کیا کہ ہم اپنے ذکر واذکار میں مشغول رہیں گے اور اس کے نتیجے میں فاقے کی نوبت آتی ہے تو کوئی بات نہیں، اور ان کے ساتھ دوسروں کے حقوق وابستہ نہیں تھے، نہ بیوی بچے تھے، کہ ان کو کھانا کھلانا ہو، لہٰذا یہ ان صوفیاء کرام کے مخصوص حالات تھے اور ان کا خاص طرزِ عمل تھا جو عام لوگوں کے لئے اور ہم جیسے کمزوروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہے۔ ہمارے لئے نبی کریم ﷺ نے سنت کا جو راستہ بتایا وہ یہ ہے کہ رزق حلال کی طلب دوسرے دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

طلب ’’حلال‘‘ کی ہو

دوسری بات یہ ہے کہ رزق طلب کرنا فریضہ اس وقت ہے جب طلب حلال کی ہو، روٹی، کپڑا اور پیسہ بذات خود مقصود نہیں ہے، یہ نیت نہ ہو کہ بس پیسہ حاصل کرنا ہے چاہے جس طرح بھی حاصل ہو، چاہے جائز طریقے سے حاصل ہو یا ناجائز طریقے سے حاصل ہو، حلال طریقے سے حاصل ہو یا حرام طریقے سے حاصل ہو، اس صورت میں یہ طلب، طلب حلال نہ ہوئی جس کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور جس کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مومن کا یہ عمل اس وقت دین بنتا ہے جب وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کو حاصل کرے، اب گر اس نے حلال وحرام کی تمیز ہٹا دی اور جائز و ناجائز کا سوال ذہن سے مٹا دیا تو پھر ایک مسلمان میں اور کافر میں رزق حاصل کرنے کے اعتبار سے کوئی فرق نہ رہا۔ بات تو جبھی بنے گی جب وہ رزق تو ضرور طلب کرے لیکن اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے اندر کرے، اس کو ایک ایک پیسے کے بارے میں فکر لاحق ہو کہ یہ پیسہ حلال طریقے سے آ رہا ہے یا حرام طریقے سے آ رہا ہے، یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق آ رہا ہے یا اس کے خلاف آ رہا ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف آ رہا ہے تو اس کو جہنم کا انگارہ سمجھ کر چھوڑ دے، کتنی بڑی سے بڑی دولت ہو، لیکن اگر وہ حرام طریقے سے آ رہی ہے تو اس کو لات مار دے اور کسی قیمت پر بھی اس حرام کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے پر راضی نہ ہو۔

محنت کی ہر کمائی حلال نہیں ہوتی

بعض لوگوں نے وہ ذریعہ معاش اختیار کر رکھا ہے جو حرام ہے اور شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی، مثلاً سود کا ذریعہ معاش اختیار کیا ہوا ہے، اب اگر کہا جائے کہ یہ تو ناجائز اور حرام ہے اس طریقے سے پیسے نہیں کمانے چاہئیں تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہم تو اپنی محنت کا کھا رہے ہیں اپنی محنت لگا رہے ہیں اپنا وقت صرف کر رہے ہیں، اب اگر وہ کام حرام اور ناجائز ہے تو ہمارا اس سے کیا تعلق؟

خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر محنت جائز نہیں ہوتی، بلکہ وہ محنت جائز ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، اگر اس طریقے کے خلاف انسان ہزار محنت کر لے لیکن اس کے ذریعہ جو پیسہ کمائے گا وہ پیسے حلال کے نہیں ہوں گے بلکہ حرام ہوں گے۔ اب کہنے کو تو ایک ’’طوائف‘‘ بھی محنت کرتی ہے وہ بھی کہہ سکتی ہے کہ میں اپنی محنت کے ذریعہ پیسے کما رہی ہوں،

لہٰذا میری آمدنی حلال ہونی چاہئے، اسی طرح آمدنی کے جو ذرائع حرام ہیں ان کو یہ کہہ کر حلال کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ ہماری محنت کی آمدنی ہے، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ روزگار حلال ہے یا حرام؟

لہٰذا جب روزگار کا کوئی ذریعہ سامنے آئے تو پہلے یہ دیکھو کہ وہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ شریعت نے اس کو حلال قرار دیا ہے یا حرام؟ اگر شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو پھر اس ذریعہ آمدنی سے خواہ کتنی ہی دنیاوی فائدے حاصل ہو رہے ہوں انسان اس کو چھوڑ دے، اور اس ذریعہ کو اختیار کرے جو اللہ کو راضی کرنے والا ہو، چاہے اس میں آمدنی اور منافع کم ہو۔

بینک کا ملازم کیا کرے؟

چنانچہ بہت سے لوگ بینک کی ملازمت کے اندر مبتلا ہیں اور بینک کے اندر بہت سارا کاروبار سود پر ہوتا ہے، اب جو شخص وہاں ملازم ہے اگر وہ سود کے کاروبار میں ان کے ساتھ معاون بن رہا ہے تو یہ ملازمت ناجائز اور حرام ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بینک کی ایسی ملازمت میں مبتلا ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور اس کو بینک کی ملازمت چھوڑنے کی فکر ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ کوئی جائز ذریعہ آمدنی تلاش کرے اور جب دوسرا ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس کو چھوڑ دے، لیکن جائز ذریعہ آمدنی اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، یہ نہ ہو کہ بے فکری کے ساتھ بینک کی ناجائز ملازمت میں لگا ہو اور ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے کہ جب دوسری ملازمت مل جائے گی تو اس کو چھوڑ دوں گا، بلکہ اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے۔ اور جب دوسری ملازمت مل جائے تو موجودہ ملازمت کو ترک کر دے اور اس کو اختیار کر لے چاہے اس میں آمدنی کم ہو۔

حلال روزی کی برکت

اللہ تعالیٰ نے حلال روزی کے اندر جو برکت رکھی ہے وہ حرام کے اندر نہیں رکھی، حرام کی بہت بڑی رقم سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو حلال کی تھوڑی سی رقم میں حاصل ہو جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وضو کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے تھے

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَ وَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ))(۱)

''اے اللہ میرے گناہ کی مغفرت فرما اور میرے گھر میں وسعت فرما اور میرے رزق میں برکت عطا فرما''

آج کل لوگ برکت کی قدر و قیمت کو نہیں جانتے بلکہ روپے پیسے کی گنتی کو جانتے ہیں، یہ دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارا بینک بیلنس بہت زیادہ ہو گیا، روپے کی گنتی زیادہ ہو گئی، لیکن اس روپے سے کیا فائدہ حاصل ہوا، ان روپوں سے کتنی راحت ملی، کتنا سکون حاصل ہوا؟ اس کا حساب نہیں کرتے، لاکھوں کا بینک بیلنس ہے، لیکن سکون میسر نہیں، راحت میسر نہیں، بتایئے وہ لاکھوں کا بینک بیلنس کس کام کا؟ اور اگر پیسے تو تھوڑے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے راحت اور سکون عطا فرمایا ہوا ہے تو یہ درحقیقت ''برکت'' ہے۔

برکت خریدی نہیں جاسکتی

یہ برکت وہ چیز ہے جو بازار سے خرید کر نہیں لائی جاسکتی، لاکھوں اور کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی دین اور اس کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرمادیں اسی کو یہ برکت نصیب ہوتی ہے دوسرے کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور یہ برکت حلال رزق میں ہوتی ہے، حرام مال کے اندر یہ برکت نہیں ہوتی چاہے وہ حرام مال کتنا زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس لئے انسان جو کما رہا ہے وہ اس کی فکر کرے کہ یہ لقمہ جو میرے اور بیوی بچوں کے حلق میں جارہا ہے اور یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے یا نہیں؟ شریعت کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ ہر انسان اپنے اندر یہ فکر پیدا کرے۔

تنخواہ کا یہ حصہ حرام ہو گیا

پھر بعض حرام مال وہ ہیں جن کا علم سب کو ہے، مثلاً سب جانتے ہیں کہ سود حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے وغیرہ۔ لیکن ہماری زندگی میں ان کے علاوہ بھی بہت سی آمدنیاں اس طرح داخل ہو گئی ہیں کہ ہمیں ان کے بارے میں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ آمدنیاں حرام ہیں۔ مثلاً آپ نے کسی جگہ پر جائز اور شریعت کے مطابق ملازمت اختیار کر رکھی ہے لیکن ملازمت کا جو وقت طے ہو چکا ہے اس وقت میں آپ کمی کر رہے ہیں اور پورا وقت نہیں دے رہے ہیں بلکہ ڈنڈی مار رہے ہیں۔ جیسے ایک

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۲۲، مسند احمد، رقم: ۱۶۰۰۴

شخص کی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے مگر وہ ان میں سے ایک گھنٹہ چوری چھپے دوسرے کاموں میں ضائع کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مہینے کے ختم پر جو تنخواہ ملے گی اس کا آٹھواں حصہ حرام ہوگیا وہ آٹھواں حصہ رزق حلال نہ رہا بلکہ وہ رزق حرام ہوگیا۔ لیکن ہمیں اس کا احساس ہی نہیں کہ یہ حرام مال ہماری آمدنی میں شامل ہو رہا ہے۔

تھانہ بھون کے مدرسہ کے اساتذہ کا تنخواہ کٹوانا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں جو مدرسہ تھا اس مدرسہ کے ہر استاد اور ہر ملازم کے پاس ایک روز نامچہ رکھا رہتا تھا، مثلاً ایک استاد ہے اور اس کو چھ گھنٹے پڑھانا ہے اب سبق پڑھانے کے دوران اس کے پاس کوئی مہمان ملنے کے لئے آ گیا تو جس وقت مہمان آتا وہ استاد اس کے آنے کا وقت اس روز نامچے میں لکھ لیتا، اور پھر جب وہ مہمان رخصت ہوکر واپس جاتا تو اس کے جانے کا وقت بھی نوٹ کر لیتا، سارا مہینہ اسی طرح کرتا اور جب مہینے کے آخر میں تنخواہ ملنے کا وقت آتا تو وہ استاد دفتر میں ایک درخواست دیتا کہ اس ماہ کے دوران میرا اتنا وقت مہمانوں کے ساتھ صرف ہوا ہے لہٰذا اتنی دیر کی تنخواہ میری تنخواہ میں سے کم کر لی جائے۔ اس طرح ہر استاد اور ہر ملازم درخواست دے کر اپنی تنخواہ کٹواتا، صرف مہمان کے آنے کی حد تک نہیں بلکہ مدرسہ کا وہ وقت کسی بھی ذاتی کام میں صرف ہوتا تو وہ وقت نوٹ کر کے اس کی تنخواہ کٹواتا، وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ وقت بکا ہوا ہے، اب یہ وقت ہمارا نہیں ہے جس ادارے میں آپ نے ملازمت کی ہے وہ وقت اس ادارے کی ملکیت بن گیا، اب اگر آپ نے اس وقت کے اندر کمی کی تو اتنے وقت کی تنخواہ آپ کے لئے حرام ہوگئی، آج ہم لوگوں کو اس طرف دھیان نہیں ہے، ہم لوگ تو صرف سود کھانے اور رشوت لینے کو حرام سمجھتے ہیں لیکن ان مختلف طریقوں سے ہماری آمدنیوں میں جو حرام کی آمیزش ہو رہی ہے اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا۔

ٹرین کے سفر میں پیسے بچانا

یا مثلاً آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اور جس درجے کا آپ نے ٹکٹ خریدا ہے اس سے اونچے درجے کے ڈبے میں سفر کر لیا، اور دونوں درجوں کے درمیان کرایہ کا جو فرق ہے اتنے پیسے آپ نے بچا لئے، تو جو پیسے بچے وہ آپ کے لئے حرام ہوگئے، اور وہ حرام مال آپ کی حلال آمدنی میں شامل ہوگیا اور آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ یہ حرام مال شامل ہوگیا۔

زائد سامان کا کرایہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں یہ بات مشہور ومعروف تھی کہ جب وہ ریل کا سفر کرتے تو اپنے سامان کا وزن ضرور کرایا کرتے تھے، اور ایک مسافر کو جتنا سامان لے جانے کی اجازت ہوتی اگر سامان اس وزن سے زیادہ ہوتا تو وہ زائد سامان کا کرایہ ریلوے کو ادا کرتے اور پھر سفر شروع کرتے، یہ کارروائی کئے بغیر سفر کرنے کا ان کے یہاں تصور ہی نہیں تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفر

ایک مرتبہ خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ سفر کرنے کے لئے اسٹیشن پہنچے اور سیدھے اس دفتر میں تشریف لے گئے جہاں سامان کا وزن کرایا جاتا تھا، وہاں اتفاق سے ریلوے کا گارڈ کھڑا ہوا تھا جو حضرت والا کو پہچانتا تھا، وہ پوچھنے لگا'' حضرت کیسے تشریف لائے؟''

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' میں اپنے سامان کا وزن کرانے آیا ہوں تا کہ اگر زیادہ ہو تو اس کا کرایہ ادا کردوں''

اس گارڈ نے کہا'' حضرت آپ وزن کرانے کے چکر میں کیوں پڑ رہے ہیں آپ سامان کو وزن کرائے بغیر سفر کرلیں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور میں اس ٹرین کا گارڈ ہوں آپ کو راستے میں کوئی نہیں پکڑے گا اور اگر سامان زیادہ ہوا تو آپ سے کوئی شخص بھی جرمانے کا مطالبہ نہیں کرے گا''

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس گارڈ سے پوچھا'' آپ کہاں تک میرے ساتھ جائیں گے؟''

اس نے جواب دیا'' میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا''

حضرت والا نے پوچھا'' اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟''

اس نے کہا'' اس کے بعد جو گارڈ آئے گا میں اس سے کہہ دوں گا کہ ان کے سامان کا ذرا خیال رکھنا''

حضرت والا نے پھر پوچھا'' وہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟''

گارڈ نے جواب دیا'' وہ گارڈ تو جہاں تک آپ کی منزل ہے وہاں تک آپ کے ساتھ ہی سفر کرے گا، اس لئے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے''

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' مجھے اور بھی آگے جانا ہے''

اس نے پوچھا ''آگے کہاں جانا ہے؟''

حضرت والا نے فرمایا ''مجھے تو اس منزل سے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس جانا ہے، وہاں کون گارڈ میرے ساتھ جائے گا جو مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال وجواب سے بچائے گا؟''

پھر حضرت والا نے فرمایا ''یہ ٹرین تمہاری ملکیت نہیں ہے اس کے اوپر تمہارا اختیار نہیں ہے تمہیں محکمے کی طرف سے اجازت نہیں ہے کہ تم کسی شخص کے زیادہ سامان کو کرایہ کے بغیر چھوڑ دو، لہٰذا میں تمہاری وجہ سے دنیاوی پکڑ سے تو بچ جاؤں گا، لیکن اس وقت جو چند پیسے میں بچالوں گا اور وہ چند پیسے میرے لئے حرام ہو جائیں گے، ان حرام پیسوں کے بارے میں جب اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال ہوگا تو وہاں پر کون سا گارڈ مجھے بچائے گا اور کون جواب دہی کرے گا؟''

یہ باتیں سن کر اس گارڈ کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سامان کا وزن کرا کر اس کے زائد پیسے ادا کر کے سفر پر روانہ ہوئے۔

یہ حرام پیسے رزق حلال میں شامل ہو گئے

لہٰذا اگر کسی نے اس طرح ریل گاڑی میں یا ہوائی جہاز میں سفر کے دوران اجازت سے زیادہ سامان کے ساتھ سفر کر لیا اور اس سامان کا وزن کرا کر اس کا کرایہ علیحدہ سے ادا نہیں کیا تو اس کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ حرام بچے اور یہ حرام پیسے ہمارے رزق حلال کے اندر شامل ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا جو اچھا خاص حلال پیسہ تھا اس میں حرام کی آمیزش ہو گئی۔

یہ بے برکتی کیوں نہ ہو

آج ہم لوگ جو بے برکتی کی وجہ سے پریشان ہیں اور ہر شخص رونا رو رہا ہے، جو لکھ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے اور جو کروڑ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے، کہ صاحب خرچہ پورا نہیں ہوتا اور مسائل حل نہیں ہوتے، درحقیقت یہ بے برکتی اس لئے ہے کہ حلال وحرام کی تمیز اور اس کی فکر اٹھ گئی ہے، بس چند مخصوص چیزوں کے بارے میں تو یہ ذہن میں بٹھالیا ہے کہ یہ حرام ہیں، ان سے تو کسی نہ کسی طریقے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مختلف ذرائع سے جو یہ حرام پیسے ہماری آمدنیوں میں داخل ہو رہے ہیں ان کی فکر نہیں۔

ٹیلیفون اور بجلی کی چوری

یا مثلاً ٹیلیفون کے محکمے والوں سے دوستی کرلی اور اب اس کے ذریعہ ملکی اور غیر ملکی کالیں ہورہی ہیں دنیا بھر میں باتیں ہورہی ہیں اور ان کالوں پر ایک پیسہ ادا نہیں کیا جارہا ہے، یہ درحقیقت محکمے کی چوری ہورہی ہے اور اس چوری کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ مال حرام ہے، اور وہ مال حرام ہمارے مال حلال کے اندر شامل ہورہا ہے، یا مثلاً بجلی کی چوری ہورہی ہے کہ بجلی کا میٹر بند پڑا ہے لیکن بجلی استعمال ہورہی ہے، اس طرح جو پیسے بچے وہ مال حرام ہے اور وہ حرام مال ہمارے حلال مال کے اندر شامل ہورہا ہے، اور حرام کے مال کی آمیزش ہورہی ہے، لہٰذا نہ جانے کتنے شعبے ایسے ہیں جن میں ہم نے اپنے لئے حرام کے راستے کھول رکھے ہیں، اور حرام مال ہمارے حلال مال میں داخل ہورہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بے برکتی کے عذاب کے اندر مبتلا ہیں۔

حلال وحرام کی فکر پیدا کریں

لہٰذا ہر کام کرتے وقت یہ دیکھو کہ جو کام میں کررہا ہوں یہ حق ہے یا ناحق ہے۔ اگر انسان اس فکر کے ساتھ زندگی گزارے کہ ناحق کوئی پیسہ اس کے مال کے اندر شامل نہ ہو تو یقین رکھئے پھر اگر ساری عمر نوافل نہ پڑھیں اور ذکر وتسبیح نہ کی لیکن اپنے آپ کو حرام سے بچا کر قبر تک لے گیا تو انشاء اللہ سیدھا جنت میں جائے گا، اور اگر حلال وحرام کی فکر تو نہیں کی مگر تہجد کی نماز بھی پڑھ رہا ہے اشراق کی نماز بھی پڑھ رہا، ذکر وتسبیح بھی کررہا ہے تو یہ نوافل اور یہ ذکر انسان کو حرام مال کے عذاب سے نہیں بچاسکیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین

یہاں تو آدمی بنائے جاتے ہیں

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ خانقاہوں میں ذکر وشغل سیکھنے کے لئے جاتے ہیں اگر ذکر وشغل سیکھنا ہے تو بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں وہاں چلا جائے، لیکن ہمارے یہاں تو آدمی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شریعت کے جو احکام ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی فکر پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر اگر کوئی ڈاڑھی والا آدمی اپنا سامان وزن کرانے کے لئے بکنگ آفس پہنچتا ہے تو وہ دفتر والے اس کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ اس کا تعلق تھانہ بھون سے ہے، لہٰذا اس سے خود پوچھ لیتے ہیں کہ آپ تھانہ بھون جارہے ہیں؟ چنانچہ حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اپنے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے معمولات چھوٹ گئے ہیں تو مجھے زیادہ دکھ اور شکایت نہیں ہوتی لیکن اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے حلال وحرام کو ایک کر رکھا ہے اور اس کو معاملات کے اندر حلال وحرام کی فکر نہیں ہے تو مجھے اس شخص سے نفرت ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بڑے خلیفہ تھے جن کو آپ نے باقاعدہ خلافت عطا فرمائی تھی، ایک مرتبہ وہ ایک سفر سے تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام دعا ہوئی، خیریت معلوم کی، حضرت والا نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا ''فلاں جگہ سے آ رہا ہوں''

حضرت نے پوچھا ''ریل گاڑی سے آ رہے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا ''جی ہاں''

حضرت نے پوچھا ''یہ بچہ جو تمہارے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟''

اب آپ اندازہ لگائیں کہ خانقاہ کے اندر پیر صاحب اپنے مرید سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بچے کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟ جبکہ دوسری خانقاہوں میں یہ سوال کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، دوسری خانقاہوں میں تو یہ سوال ہوتا ہے کہ معمولات پورے کئے تھے یا نہیں؟ تہجد کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ اشراق کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ لیکن یہاں یہ سوال ہو رہا ہے کہ یہ بچہ جو آپ کے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ آدھا لیا تھا یا پورا لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا ''حضرت آدھا لیا تھا''

حضرت نے پھر سوال کیا ''اس بچے کی عمر کیا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا ''حضرت یہ بچہ ویسے تو تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے اس لئے آدھا ٹکٹ لیا تھا''

یہ جواب سن کر حضرت والا کو سخت رنج ہوا اور ان سے خلافت واپس لے لی اور فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تم اس لائق نہیں ہو کہ تمہیں خلافت دی جائے اور تمہیں مجاز بنایا جائے، اس لئے کہ تمہیں حلال وحرام کی فکر نہیں۔ جب بچے کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہوگئی چاہے ایک دن ہی زیادہ کیوں نہ ہوئی ہو تو اس وقت تم پر واجب تھا کہ تم بچے کا پورا ٹکٹ لیتے، تم نے آدھا ٹکٹ لیکر جو پیسے

بچائے وہ حرام کے پیسے بچائے اور جس کو حرام سے بچنے کی فکر نہ ہو وہ خلیفہ بننے کا اہل نہیں، چنانچہ خلافت واپس لے لی۔

اگر کوئی شخص حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آکر کہتا کہ حضرت معمولات ترک ہو گئے، تو حضرت والا فرماتے کہ معمولات ترک ہو گئے تو استغفار کرو اور دوبارہ شروع کر دو اور ہمت سے کام لو اور اس بات کا دوبارہ عزم کرو کہ آئندہ ترک نہیں کریں گے۔ اور معمولات ترک کرنے کی بناء پر کبھی خلافت واپس نہیں لی لیکن حلال وحرام کی فکر نہ کرنے پر خلافت واپس لے لی، اس لئے کہ جب حلال وحرام کی فکر نہ ہو تو وہ انسان انسان نہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(۱)

''حلال کی طلب دوسرے فرائض کے بعد یہ بھی فرض ہے''

حرام مال حلال مال کو بھی تباہ کر دیتا ہے

لہٰذا ہم سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کہ جو پیسے اس کے پاس آرہے ہیں اور جو کام وہ کر رہا ہے ان میں کہیں حرام مال کی آمیزش تو نہیں ہے، حرام مال کی آمیزش کی چند مثالیں میں نے آپ کے سامنے سمجھانے کے لئے پیش کر دیں، ورنہ نہ جانے کتنے کام ایسے ہیں جن کے ذریعہ نادانستہ طور پر غیر شعوری طور پر ہمارے حلال مال میں حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے، اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ جب کبھی کسی حلال مال کے ساتھ حرام مال لگ جاتا ہے تو وہ حرام حلال کو بھی تباہ کر کے چھوڑتا ہے، یعنی اس حرام مال کے شامل ہونے کے نتیجے میں حلال مال کی برکت، اس کا سکون اور راحت تباہ ہو جاتا ہے، اس لئے ہر شخص اس کی فکر کرے اور ہر شخص اپنے ایک ایک عمل کا جائزہ لے اور اپنی آمدنی کا جائزہ لے کہ ہمارے حلال مال میں کہیں کوئی حرام مال تو شامل نہیں ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس فکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

رزق کی طلب مقصودِ زندگی نہیں

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس حدیث نے جہاں ایک طرف رزق حلال کی اہمیت بتائی کہ

(۱) کنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱۶/۴)، کشف الخفاء، رقم: ۱۶۷۱ (۴۶/۲)، سنن البیهقی، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲۴/۲)، الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۳۵ (۱۴۰۸۵/۱)، جامع الأحادیث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱۲۸/۱۴)، مشکوۃ المصابیح، رقم: ۲۷۸۱ (۱۲۹/۲)، شعب الإیمان، رقم: ۸۷۴۱ (۴۲۱/۶)

رزق حلال کی طلب دین سے خارج کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے، وہاں اس حدیث نے ہمیں رزق کی طلب کا درجہ بھی بتادیا کہ اس کا کتنا درجہ اور کتنی اہمیت ہے، آج کی دنیا نے معاش کو، معیشت کو اور روپے پیسے کمانے کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرار دے رکھا ہے، آج ہماری ساری دوڑ دھوپ اسی کے گرد گھوم رہی ہے کہ پیسہ کس طرح حاصل ہو، کس طرح پیسوں میں اضافہ کیا جائے اور کس طرح اپنی معیشت کو ترقی دی جائے، اور اسی کو ہم نے اپنی زندگی کی آخری منزل قرار دے رکھا ہے۔

سرکار دوعالم ﷺ نے اس حدیث میں بتادیا کہ رزق حلال کی طلب فریضہ تو ہے لیکن دوسرے فرائض دینیہ کے بعد اس کا درجہ آتا ہے، یہ انسان کی زندگی کا مقصد اصلی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ضرورت ہے اور اس ضرورت کے تحت انسان کو نہ صرف یہ کہ رزق حلال کے طلب کی اجازت دی گئی ہے بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید کی گئی ہے کہ تم رزق حلال طلب کرو، لیکن یہ رزق حلال کی طلب تمہارا مقصد زندگی نہیں ہے بلکہ مقصد زندگی کچھ اور ہے اور وہ اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا، اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کرنا ہے، یہ انسان کا اصل مقصد زندگی ہے اور معیشت کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

رزق کی طلب میں فرائض کا ترک جائز نہیں

لہٰذا جس جگہ پر معیشت میں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہوجائے وہاں پر اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ترجیح ہوگی، بعض لوگ افراط کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں جب انہوں نے یہ سنا کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے تو اس کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس طلب حلال کے نتیجے میں اگر نمازیں ضائع ہورہی ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، روزے چھوٹ رہے ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، حلال وحرام ایک ہورہا ہے تو ان کو اس کی پرواہ نہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام جو ہم کررہے ہیں یہ بھی تو دین کا ایک حصہ ہے ہمارے دین میں دین ودنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے لہٰذا جو کام ہم کررہے ہیں یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا استدلال

کچھ عرصہ پہلے ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں، وہ مطب کے اوقات

میں نماز نہیں پڑھتے اور جب مطب بند کر کے گھر واپس آتے ہیں تو گھر آ کر تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں، میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ نماز کو قضا کر دیتے ہیں یہ اچھا نہیں ہے آپ وقت پر نماز پڑھ لیا کریں، تو جواب میں شوہر کہتے ہیں کہ اسلام نے خدمت خلق سکھائی ہے اور یہ ڈاکٹری اور مطب جو کر رہے ہیں یہ بھی خدمت خلق کر رہے ہیں اور یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے اب اگر ہم نے خدمت خلق کی خاطر نماز کو چھوڑ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اب دیکھئے حلال کمانے کے لئے انہوں نے اولین دینی فریضے کو چھوڑ دیا، حالانکہ حضور ﷺ یہ فرما رہے ہیں:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ))(۱)

یہ فریضہ تو ہے لیکن بعد الفرائض ہے، لہٰذا اگر کسب معاش کے فریضے میں اور اولین دینی فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہو جائے تو اس وقت دینی فریضہ غالب رہے گا۔

ایک لوہار کا قصہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے ولی اللہ، فقیہ اور محدث اور صوفی تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے درجات عطا فرمائے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم فرمایا اور بہت کچھ نوازشیں فرمائیں لیکن میرے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا اس لوہار کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بخشا وہ ہمیں نصیب نہ ہو سکا، جب اس شخص کی آنکھ کھلی تو اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ پتہ کرنا چاہئے کہ وہ کون لوہار تھا اور وہ کیا عمل کرتا تھا کہ اس کا درجہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ شخص حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں گیا اور معلومات کیں تو پتہ چلا کہ واقعۃً ان کے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا اور اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے، اس کے گھر جا کر اس کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا تھا؟ اس نے بتایا کہ وہ تو لوہار تھا اور سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا، اس شخص نے کہا کہ اس کا کوئی خاص عمل اور خاص نیکی بتاؤ جو وہ کیا کرتا تھا، اس لئے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن

(۱) كنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱٦/٤)، كشف الخفاء، رقم: ۱٦٧١ (٤٦/٢)، سنن البيهقي، رقم: ١٢٠٣٠ (٢٤/٢)، الجامع الكبير للسيوطي، رقم: ٣٥ (١٤٠٨٥/١)، جامع الأحاديث، رقم: ١٣٩٣٧ (١٢٨/١٤)، مشكوة المصابيح، رقم: ٢٧٨١ (١٢٩/٢)، شعب الإيمان، رقم: ٨٧٤١ (٤٢١/٦)

مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس کا مقام ہم سے بھی آگے بڑھ گیا۔

اس کی بیوی نے کہا کہ وہ سارا دن تو لوہا کوٹتا رہتا تھا، لیکن ایک بات اس کے اندر یہ تھی کہ چونکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے، رات کو جس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے گھر کی چھت پر اس طرح کھڑے ہو جاتے جس طرح کوئی لکڑی کھڑی ہوتی ہے اور کوئی حرکت نہیں کرتے تھے، جب میرا شوہر ان کو دیکھتا تو یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراغت عطا فرمائی ہوئی ہے یہ ساری رات کیسی عبادت کرتے ہیں ان کو دیکھ کر رشک آتا ہے اگر ہمیں بھی اپنے مشغلے سے فراغت نصیب ہوتی تو ہمیں بھی اس طرح تہجد پڑھنے کی توفیق ہو جاتی۔ چنانچہ وہ حسرت کیا کرتا تھا کہ میں چونکہ دن بھر لوہا کوٹتا ہوں پھر رات کو تھک کر سو جاتا ہوں اس لئے اس طرح تہجد پڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔

نماز کے وقت کام بند

دوسری بات اس کے اندر یہ تھی کہ جب وہ لوہا کوٹ رہا ہوتا تھا اور اس وقت اس کے کان میں آذان کی آواز ''اللہ اکبر'' آجاتی تو اگر اس وقت اس نے اپنا ہتھوڑا سر سے اونچا ہاتھ میں اٹھایا ہوا ہوتا تو اس وقت یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے ایک مرتبہ اور لوہے پر مار دے، بلکہ اس ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اب آذان کی آواز سننے کے بعد اس ہتھوڑے سے ضرب لگانا میرے لئے درست نہیں، پھر نماز کے لئے مسجد کی طرف چلا جاتا تھا، جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا اس نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بس یہی وجہ ہے جس نے ان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان پر رشک آرہا ہے۔

ٹکراؤ کے وقت یہ فریضہ چھوڑ دو

آپ نے دیکھا کہ وہ لوہار جو لوہا کوٹنے کا کام کر رہا تھا، یہ بھی کسب حلال کا فریضہ تھا اور جب آذان کی آواز آئی تو وہ اولین فریضے کی پکار تھی جس وقت دونوں میں ٹکراؤ ہوا تو اس نے اللہ والے اور اولین فریضے کو ترجیح دی اور دوسرے فریضے کو چھوڑ دیا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بلند مقام عطا فرما دیا۔ لہٰذا جہاں ٹکراؤ ہو جائے وہاں اولین فریضے کو اختیار کر لو اور کسب حلال کے فریضے کو چھوڑ دو۔

ایک جامع دعا

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا))(۱)

اے اللہ ہمارا سب سے بڑا غم دنیا کو نہ بنائیے کہ ہمارے دماغ پر سب سے بڑا غم دنیا کا مسلط ہو کہ پیسے کہاں سے آئیں، بنگلہ کیسے بن جائے اور کار کیسے حاصل ہو جائے، اور اے اللہ! ہمارے سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنائیے کہ جو کچھ علم ہے وہ بس دنیا کا علم ہے، اور اے اللہ! نہ ہماری رغبت کی انتہا دنیا کو بنائیے کہ جو کچھ دل میں رغبت پیدا ہو وہ دنیا ہی کی ہو اور آخرت کی رغبت پیدا نہ ہو۔

بہرحال اس حدیث نے تیسرا سبق یہ دیدیا کہ کسب حلال کا درجہ دوسرے فرائض دینیہ کے بعد ہے، یہ دنیا ضرورت کی چیز تو ہے لیکن مقصد بنانے کی چیز نہیں ہے، یہ دنیا انہماک کی چیز نہیں ہے کہ دن رات آدمی اسی دنیا کی فکر میں منہمک رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور فکر اور دھیان انسان کے دماغ پر نہ رہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تین سبق معلوم ہوئے، ایک یہ کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے، دوسرا یہ کہ انسان طلب حلال کی کرے اور حرام سے بچنے کی فکر کرے، اور تیسرا یہ کہ انسان اس معیشت کی سرگرمی کو صحیح مقام پر رکھے اور اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے اس لئے کہ اولین فرائض دینیہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

---

(۱) روضة المحدثين، رقم: ٣٣١٦ (٤١/٨)، الجامع الصغير وزيادته رقم: ٢١٤٨ (٢١٦/١) دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! دنیا کو ہمارا بڑا غم نہ بنا، سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنا اور نہ ہی اسے ہماری رغبت کی انتہاء بنا۔

اپنے معاملات صاف رکھیں! ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْآ أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ (۱)

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے یہ دین کے ایک بہت اہم رکن سے متعلق ہے، وہ دین کا اہم رکن ''معاملات کی درستی اور اس کی صفائی'' ہے۔ یعنی انسان کا معاملات میں اچھا ہونا اور خوش معاملہ ہونا یہ دین کا بہت اہم باب ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ دین کا جتنا اہم باب ہے ہم لوگوں نے اتنا ہی اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رکھا ہے، ہم نے دین کو صرف چند عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ، عمرہ، وظائف اور اوراد میں منحصر کر لیا ہے، لیکن روپے پیسے کے لین دین کا جو باب ہے اس کو ہم نے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے گویا کہ دین سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ اسلامی شریعت کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ عبادات سے متعلق جو احکام ہیں وہ ایک چوتھائی ہیں اور تین چوتھائی احکام معاملات اور معاشرت سے متعلق ہیں۔

تین چوتھائی دین معاملات میں ہے

فقہ کی ایک مشہور کتاب ہے جو ہمارے تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر لوگ عالم بنتے ہیں، اس کا نام ہے ''ھدایہ'' اس کتاب میں طہارت سے لیکر میراث تک شریعت کے جتنے احکام ہیں وہ سب اس کتاب میں جمع ہیں، اس کتاب کی چار جلدیں ہیں، پہلی جلد عبادات سے متعلق ہے جس میں طہارت کے احکام، نماز کے احکام، زکوۃ، روزے اور حج کے احکام بیان کئے گئے ہیں، اور باقی تین جلدیں معاملات یا معاشرت کے احکام سے متعلق ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۹/۴۷ تا ۹۲)، ۱۱۵ کتوبر ۱۹۹۶ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) النساء: ۲۹

اس سے اندازہ لگائیں کہ دین کے احکام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات سے متعلق ہے اور تین چوتھائی حصہ معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کی خرابی کا عبادت پر اثر

پھر اللہ تعالیٰ نے ان معاملات کا یہ مقام رکھا ہے کہ اگر انسان روپے پیسے کے معاملات میں حلال وحرام کا، اور جائز وناجائز کا امتیاز نہ رکھے تو عبادات پر بھی اس کا اثر یہ واقع ہوتا ہے کہ چاہے وہ عبادات ادا ہو جائیں لیکن ان کا اجر وثواب اور ان کی قبولیت موقوف ہو جاتی ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں، ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عاجزی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں اس حال میں ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گڑگڑا کر اور رو رو کر پکارتے ہیں کہ یا اللہ! میرا یہ مقصد پورا کر دیجئے، فلاں مقصد پورا کر دیجئے، بڑی عاجزی سے، الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعائیں کر رہے ہوتے ہیں، لیکن کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام اور ان کا جسم حرام آمدنی سے پرورش پایا ہوا۔ ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو؟ ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی'' (۱)

معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے

دوسری جتنی عبادات ہیں اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو اس کی تلافی آسان ہے مثلاً نمازیں چھوٹ گئیں تو اب اپنی زندگی میں قضا نمازیں ادا کرلو، اور اگر زندگی میں ادا نہ کر سکے تو وصیت کر جاؤ کہ اگر میں مر جاؤں اور میری نمازیں ادا نہ ہوئی ہوں تو میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کر دیا جائے اور توبہ کرلو۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تلافی ہو جائے گی، لیکن اگر کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھالیا تو اس کی تلافی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، چاہے تم ہزار توبہ کرتے رہو، ہزار نفلیں پڑھتے رہو، اسی لئے معاملات کا باب بہت اہمیت رکھتا ہے۔

(۱) صحیح مسلم، كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، رقم: ١٦٨٧، سنن الترمذى، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ومن سورة البقرة، رقم: ٢٩١٥، مسند أحمد، رقم: ٧٩٩٨، سنن الدارمى، كتاب الرقاق، باب فى أكل الطيب، رقم: ٢٦٠١

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور معاملات

اسی وجہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تصوف اور طریقت کی تعلیمات میں معاملات کو سب سے زیادہ اولیت حاصل تھی، فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اپنے مریدین میں سے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلے کہ اس نے اپنے معمولات، نوافل اور اوراد و وظائف پورے نہیں کئے تو اس کی وجہ سے رنج ہوتا ہے اور اس مرید سے کہہ دیتا ہوں کہ ان کو پورا کرلو، لیکن اگر کسی مرید کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس نے روپے پیسے کے معاملات میں گڑ بڑ کی ہے تو مجھے اس مرید سے نفرت ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، جن کو آپ نے خلافت بھی عطا فرمادی تھی، اور ان کو بیعت اور تلقین کرنے کی اجازت دیدی تھی، ایک مرتبہ وہ سفر کر کے حضرت والا کی خدمت میں تشریف لائے ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی تھا، انہوں نے آکر سلام کیا اور ملاقات کی، اور بچے کو بھی ملوایا کہ حضرت یہ میرا بچہ ہے اس کے لئے دعا فرمادیجئے، حضرت والا نے بچے کے لئے فرمائی اور پھر ویسے ہی پوچھ لیا کہ اس بچے کی عمر کیا ہے؟

انہوں نے جواب دیا "حضرت اس کی عمر تیرہ سال ہے"

حضرت نے پوچھا "آپ نے ریل گاڑی کا سفر کیا ہے تو اس بچے کا آدھا ٹکٹ لیا تھا یا پورا ٹکٹ لیا تھا؟"

انہوں نے جواب دیا "حضرت آدھا ٹکٹ لیا تھا"

حضرت نے فرمایا "آپ نے آدھا ٹکٹ کیسے لیا جب کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا تو پورا ٹکٹ لگتا ہے"

انہوں نے عرض کیا "قانون تو یہی ہے کہ بارہ سال کے بعد ٹکٹ پورا لینا چاہئے اور یہ بچہ اگرچہ تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے، اس وجہ سے میں نے آدھا ٹکٹ لے لیا"

حضرت نے فرمایا "انا للہ وانا الیہ راجعون، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تصوف اور طریقے کی ہوا بھی نہیں لگی، آپ کو ابھی تک اس بات کا احساس اور ادراک نہیں کہ بچے کو جو سفر آپ نے کرایا یہ حرام کرایا، جب قانون یہ ہے کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لگتا ہے اور آپ نے آدھا

ٹکٹ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ریلوے کے آدھے ٹکٹ کے پیسے غصب کر لئے اور آپ نے چوری کر لی، اور جو شخص چوری اور غصب کرے ایسا شخص تصوف اور طریقے میں کوئی مقام نہیں رکھ سکتا''

لہٰذا ان سے آپ کی خلافت اور اجازت بیعت واپس لی جاتی ہے۔ چنانچہ اس بات پر ان کی خلافت سلب فرمالی، حالانکہ اپنے اوراد و وظائف میں، عبادات اور نوافل میں، تہجد اور اشراق میں ان میں سے ہر چیز میں بالکل اپنے طریقے پر مکمل تھے، لیکن یہ غلطی کی کہ بچے کا ٹکٹ پورا نہیں لیا صرف اس غلطی کی بناء پر خلافت سلب فرمالی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اپنے سارے مریدین اور متعلقین کو یہ ہدایت تھی کہ جب کبھی ریلوے میں سفر کرو، اور تمہارا سامان اس مقدار سے زائد ہو جتنا ریلوے نے تمہیں مفت لے جانے کی اجازت دی ہے تو اس صورت میں اپنے سامان کا وزن کراؤ اور زائد سامان کا کرایہ ادا کرو، پھر سفر کرو۔

خود حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ریلوے میں سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچے گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، آپ اپنا سامان لیکر اس دفتر میں پہنچے جہاں پر سامان کا وزن کرایا جاتا تھا اور جا کر لائن میں لگ گئے۔ اتفاق سے گاڑی میں ساتھ جانے والا گارڈ وہاں آ گیا اور حضرت والا کو دیکھ کر پہچان لیا اور پوچھا ''حضرت آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟''

حضرت نے فرمایا ''میں سامان کا وزن کرانے آیا ہوں''

گارڈ نے کہا ''آپ کو سامان کا وزن کرانے کی ضرورت نہیں آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں میں آپ کے ساتھ گاڑی میں جا رہا ہوں، آپ کو زائد سامان کا کرایہ دینے کی ضرورت نہیں''

حضرت نے پوچھا ''تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے؟''

گارڈ نے کہا ''میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا''

حضرت نے پوچھا ''اس اسٹیشن کے بعد کیا ہوگا؟''

گارڈ نے کہا ''اس اسٹیشن پر دوسرا گارڈ آئے گا میں اس کو بتادوں گا کہ یہ حضرت کا سامان ہے اس کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ مت کرنا''

حضرت نے پوچھا ''وہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟''

گارڈ نے کہا ”وہ تو اور آگے جائے گا اس سے پہلے ہی آپ کا اسٹیشن آ جائے گا“

حضرت نے فرمایا ”میں تو اور آگے جاؤں گا یعنی آخرت کی طرف جاؤں گا اور اپنی قبر میں جاؤں گا وہاں پر کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟ جب وہاں آخرت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ ایک سرکاری گاڑی میں سامان کا کرایہ ادا کئے بغیر جو سفر کیا اور جو چوری کی اس کا حساب دو، تو وہاں پر کون سا گارڈ میری مدد کرے گا؟“

چنانچہ وہاں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی شخص ریلوے کے دفتر میں اپنے سامان کا وزن کرا رہا ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ یہ شخص تھانہ بھون جانے والا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں سے ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی باتیں لوگوں نے لیکر مشہور کر دیں، لیکن یہ پہلو کہ ایک پیسہ بھی شریعت کے خلاف کسی ذریعہ سے ہمارے پاس نہ آئے یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہوگیا، آج کتنے لوگ اس قسم کے معاملات کے اندر مبتلا ہیں اور ان کو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم یہ معاملات شریعت کے خلاف اور ناجائز کر رہے ہیں، اگر ہم نے غلط کام کر کے چند پیسے بچا لئے تو وہ چند پیسے حرام ہو گئے اور وہ حرام مال ہمارے دوسرے مال کے ساتھ ملنے کے نتیجے میں اس کے برے اثرات ہمارے مال میں پھیل گئے، پھر اسی مال سے ہم کھانا کھا رہے ہیں، اسی سے کپڑے بنا رہے ہیں، اسی سے لباس تیار ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں ہماری پوری زندگی حرام ہو رہی ہے، اور ہم چونکہ بے حس ہو گئے ہیں اس لئے حرام مال اور حرام آمدنی کے برے نتائج کا ہمیں ادراک بھی نہیں۔

یہ حرام مال ہماری زندگی میں کیا فساد مچا رہا ہے، اس کا ہمیں احساس نہیں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ احساس عطا فرماتے ہیں ان کو پتہ لگتا ہے کہ حرام چیز کیا ہوتی ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چند مشکوک لقمے کھانا

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر استاذ تھے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جا کر کھانا کھا لیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے، فرماتے ہیں کہ میں مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے، اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کرلوں فلاں گناہ کرلوں، حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔

حرام کی دو قسمیں

یہ جو آج ہمارے دلوں سے گناہوں کی نفرت مٹتی جارہی ہے اور گناہ کے گناہ ہونے کا احساس ختم ہورہا ہے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے مال میں حرام مال کی ملاوٹ ہوچکی ہے پھر ایک تو وہ حرام ہے جو کھلا حرام ہے، جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے، جیسے رشوت کا مال، سود کا مال، جوا کا مال، دھوکے کا مال، چوری کا مال وغیرہ۔ لیکن حرام کی دوسری قسم وہ حرام ہے جس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے حالانکہ وہ بھی حرام ہے اور وہ حرام چیز ہمارے کاروبار میں مل رہی ہے اس دوسری قسم کی تفصیل سنئے۔

ملکیت متعین ہونی چاہئے

حضور ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ معاملات چاہے بھائیوں کے درمیان ہوں باپ بیٹے کے درمیان ہوں، شوہر اور بیوی کے درمیان ہوں، وہ معاملات بالکل صاف اور بے غبار ہونے چاہئیں اور ان میں کوئی غبار نہ ہونا چاہئے، اور ملکیتیں آپس میں متعین ہونی چاہئیں کہ کون سی چیز باپ کی ملکیت ہے اور کون سی چیز بیٹے کی ملکیت ہے، کون سی چیز شوہر کی ملکیت ہے اور کون سی چیز بیوی کی ملکیت ہے، کون سی چیز ایک بھائی کی ہے اور کون چیز دوسرے بھائی کی ہے، یہ ساری بات واضح اور صاف ہونی چاہئے، یہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((تَعَاشَرُوا كَالْأَخْوَانِ تَعَامَلُوا كَالْأَجَانِبِ))(۱)

"یعنی بھائیوں کی طرح رہو، لیکن آپس میں معاملات اجنبیوں کی طرح کرو"

مثلاً اگر قرض کا لین دین کیا جارہا ہے تو اس کو لکھ لو کہ یہ قرض کا معاملہ ہے اتنے دن کے بعد اس کی واپسی ہوگی۔

باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار

آج ہمارا سارا معاشرہ اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ کوئی بات صاف ہی نہیں۔ اگر باپ بیٹوں کے درمیان کاروبار ویسے ہی چل رہا ہے، اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ بیٹے باپ کے ساتھ جو کام کررہے ہیں وہ آیا شریک کی حیثیت میں کررہے ہیں یا ملازم کی حیثیت میں کررہے ہیں،

---

(۱) یہ جملہ تلاش بسیار کے باوجود احادیث کی کتابوں میں نہیں مل سکا، البتہ عربی ضرب الامثال میں یہ جملہ موجود ہے، اس لئے اس کا ضرب المثل ہونا زیادہ راجح محسوس ہوتا ہے۔

یا ویسے ہی باپ کی مفت مدد کر رہے ہیں، اس کا کچھ پتہ نہیں، مگر تجارت ہو رہی ہے ملیں قائم ہو رہی ہیں، دوکانیں بڑھتی جا رہی ہیں مال اور جائیداد بڑھتا جا رہا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں ہے کہ کس کا کتنا حصہ ہے اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اپنے معاملات کو صاف کرو، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو غیرت کی بات ہے، بھائیوں بھائیوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ یا باپ بیٹوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب شادیاں ہو جاتی ہیں اور بچے ہو جاتے ہیں اور شادی میں کسی نے زیادہ خرچ کر لیا اور کسی نے کم خرچ کیا، یا ایک بھائی نے مکان بنالیا اور دوسرے نے ابھی تک مکان نہیں بنایا، بس اب دل میں شکایتیں اور ایک دوسرے کی طرف سے کینہ پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اب آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں زیادہ کھا گیا اور مجھے کم ملا، اور اگر اس دوران باپ کا انتقال ہو جائے تو اس کے بعد بھائیوں کے درمیان جو لڑائی اور جھگڑے ہوتے ہیں وہ لامتناہی ہوتے ہیں پھر ان کے حل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

باپ کے انتقال پر میراث کی تقسیم فوراً کریں

جب باپ کا انتقال ہو جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ فوراً میراث تقسیم کرو، میراث تقسیم کرنے میں تاخیر کرنا حرام ہے، لیکن آج کل یہ ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال پر میراث تقسیم نہیں ہوتی اور جو بڑا بیٹا ہوتا ہے وہ کاروبار پر قابض ہو جاتا ہے، اور بیٹیاں خاموش بیٹھی رہتی ہیں، ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟

یہاں تک کہ اسی حالت میں دس سال اور بیس سال گزر گئے اور پھر اس دوران کسی اور کا بھی انتقال ہو گیا یا کسی بھائی نے اس کاروبار میں اپنا پیسہ ملا دیا پھر سالہا سال گزرنے کے بعد جب ان کی اولاد بڑی ہوئی تو اب جھگڑے کھڑے ہو گئے، اور جھگڑے ایسے وقت میں کھڑے ہوئے جب ڈور الجھی ہوئی ہے اور جب وہ جھگڑے انتہاء کی حد تک پہنچے تو اب مفتی صاحب کے پاس چلے آ رہے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ مفتی صاحب بیچارے ایسے وقت میں کیا کریں گے اب اس وقت یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ جس وقت کاروبار کے اندر شرکت تھی اور بیٹے اپنے باپ کے ساتھ ملکر کاروبار کر رہے تھے اس وقت بیٹے کس حیثیت میں کام کر رہے تھے؟

مشترک مکان کی تعمیر میں حصہ داروں کا حصہ

یا مثلاً ایک مکان بن رہا ہے، تعمیر کے دوران کچھ پیسے باپ نے لگا دیئے کچھ پیسے ایک بیٹے

نے لگا دیئے کچھ دوسرے بیٹے نے لگا دیئے کچھ تیسرے بیٹے نے لگا دیئے لیکن یہ پتہ نہیں کہ کون کس حساب سے کس طرح سے کس تناسب سے لگا رہا ہے، اور یہ بھی پتہ نہیں کہ جو پیسے تم لگا رہے ہو وہ آیا بطور قرض کے دے رہے ہو اور اس کو واپس لو گے یا مکان میں حصہ دار بن رہے ہو، یا بطور امداد اور تعاون کے پیسے دے رہے ہو، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ اب مکان تیار ہو گیا اور اس میں رہنا شروع کر دیا، اب جب باپ کا انتقال ہوا یا آپس میں دوسرے مسائل پیدا ہوئے تو اب مکان پر جھگڑے کھڑے ہو گئے، اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ فلاں بھائی یہ کہتا ہے کہ میرا اتنا حصہ ہے مجھے اتنا ملنا چاہئے، دوسرا کہتا کہ مجھے اتنا ملنا چاہئے، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی جب تم نے اس مکان کی تعمیر میں پیسے دیئے تھے، اس وقت تمہاری کیا نیت تھی؟ کیا تم نے بطور قرض دیئے تھے؟ یا تم مکان میں حصہ دار بننا چاہتے تھے؟ یا باپ کی مدد کرنا چاہتے تھے؟ اس وقت کیا بات تھی؟ تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم نے تو پیسے دیتے وقت کچھ سوچا ہی نہیں تھا نہ تو ہم نے مدد کے بارے میں سوچا تھا اور نہ حصہ داری کے بارے میں سوچا تھا، اب آپ کوئی حل نکالیں، جب ڈور الجھ گئی اور سرا ہاتھ نہیں آرہا ہے تو اب مفتی صاحب کی مصیبت آئی کہ وہ اس کا حل نکالیں کہ کس کا کتنا حصہ بنتا ہے، یہ سب اس لئے ہوا کہ معاملات کے بارے میں حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل نہیں کیا۔ نفلیں ہو رہی ہیں، تہجد کی نماز ہو رہی ہے، اشراق کی نماز ہو رہی ہے، لیکن معاملات میں سب الم غلم ہو رہا ہے، کسی چیز کا کچھ پتہ نہیں، یہ سب کام حرام ہو رہا ہے، جب یہ معلوم نہیں کہ میرا حق کتنا ہے اور دوسرے کا حق کتنا ہے تو اس صورت میں جو کچھ اس میں سے کھا رہے ہو اس کے حلال ہونے میں بھی شبہ ہے جائز نہیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ملکیت کی وضاحت

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کا ایک مخصوص کمرہ تھا اس میں آرام فرمایا کرتے تھے، ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اسی پر آرام کیا کرتے تھے، اسی پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے، وہیں پر لوگ آ کر ملاقات کیا کرتے تھے، میں یہ دیکھتا تھا کہ جب اس کمرے میں کوئی سامان باہر سے آتا تو فوراً واپس بھجوا دیتے تھے، مثلاً حضرت والد صاحب نے پانی منگوایا میں گلاس میں پانی بھر کر پلانے چلا گیا جب آپ پانی پی لیتے تو فوراً فرماتے کہ یہ گلاس واپس رکھ آؤ جہاں سے لائے تھے، جب گلاس واپس لیجانے میں دیر ہو جاتی تو ناراض ہو جاتے، اگر پلیٹ آجاتی تو فوراً فرماتے کہ یہ پلیٹ واپس باورچی خانے میں رکھ آؤ، ایک دن میں نے کہا کہ حضرت! اگر سامان واپس لیجانے میں تھوڑی دیر ہو جایا کرے تو معاف فرما دیا

کریں، فرمانے لگے تم بات سمجھتے نہیں ہو، بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ اس کمرے میں جو سامان بھی ہے وہ میری ملکیت ہے، اور باقی کمروں میں اور گھر میں جو سامان ہے وہ تمہاری والدہ کی ملکیت ہے، اس لئے میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کبھی دوسرے کمروں کا سامان یہاں پر آجائے اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوجائے تو اس وصیت نامہ کے مطابق تم یہ سمجھو گے کہ یہ میری ملکیت ہے حالانکہ وہ میری ملکیت نہیں، اس وجہ سے میں کوئی چیز دوسروں کی اپنے کمرے میں نہیں رکھتا واپس کروا دیتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعزیت کے لئے تشریف لائے، حضرت والد صاحب سے ڈاکٹر صاحب کو بہت ہی والہانہ تعلق تھا، جس کا ہم اور آپ تصور نہیں کرسکتے، چونکہ آپ ضعیف تھے اس وجہ سے اس وقت آپ پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے، مجھے اس وقت خیال آیا کہ حضرت والا پر اس وقت یہ ضعف اور غم ہے تو اندر سے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خمیرہ لے آیا جو آپ تناول فرمایا کرتے تھے، اور حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ خمیرہ کا ایک چمچہ تناول فرمالیں، حضرت والا نے اس خمیرہ کو دیکھتے ہی کہا کہ تم یہ خمیرہ کیسے لے آئے یہ خمیرہ تو اب میراث کا اور ترکہ کا ایک حصہ بن گیا ہے اب تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ اس طرح یہ خمیرہ اٹھا کر کسی کو دیدو، اگرچہ وہ ایک چمچہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو، میں نے کہا کہ حضرت! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے ورثاء ہیں وہ سب الحمدللہ بالغ ہیں اور وہ سب یہاں موجود ہیں اور سب اس بات پر راضی ہیں کہ آپ یہ خمیرہ تناول فرمالیں، تب حضرت نے وہ خمیرہ تناول فرمایا۔

حساب اسی دن کرلیں

اس کے ذریعہ حضرت والا نے یہ سبق دیدیا کہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ آدمی رواداری میں زندگی گذار دے اور کوئی حساب نہ کرے۔ فرض کریں کہ اگر تمام ورثاء میں ایک وارث بھی نابالغ ہوتا یا موجود نہ ہوتا اور اس کی رضامندی شامل نہ ہوتی تو اس خمیرہ کا ایک چمچہ بھی حرام ہوجاتا۔ اس لئے شریعت کا یہ حکم ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہوجائے تو جلد از جلد اس کی میراث تقسیم کردو، یا کم از کم حساب کرکے رکھ لو کہ فلاں کا اتنا حصہ ہے اور فلاں کا اتنا حصہ ہے، اسلئے کہ بعض اوقات تقسیم میں کچھ

تاخیر ہوجاتی ہے، بعض اشیاء کی قیمت لگانی پڑتی ہے اور بعض اشیاء کو فروخت کرنا پڑتا ہے، لیکن حساب اسی دن ہوجانا چاہئے، آج اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنے جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں ان جھگڑوں کا ایک بڑا بنیادی سبب حساب کتاب کا صاف نہ ہونا اور معاملات کا صاف نہ ہونا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر کتاب

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سارے فقہی احکام اپنی تصانیف کے ذریعہ ہم تک پہنچائے، ان کا احسان ہمارے سروں پر اتنا ہے کہ ساری عمر تک ہم ان کے احسان کا صلہ نہیں دے سکتے، ان کی لکھی ہوئی کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے بہت ساری کتابیں لکھیں ہیں لیکن تصوف اور زہد کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا "تم کیسے کہتے ہو کہ میں نے تصوف پر کتاب نہیں لکھی، میں نے جو "کتاب البیوع" لکھی ہے وہ تصوف ہی کی تو کتاب ہے"

مطلب یہ تھا کہ خرید وفروخت کے احکام اور لین دین کے احکام حقیقت میں تصوف ہی کے احکام ہیں، اس لئے کہ زہد اور تصوف درحقیقت شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا نام ہے، اور شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی خرید وفروخت اور لین دین کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔

دوسروں کی چیز اپنے استعمال میں لانا

اسی طرح دوسرے کی چیز استعمال کرنا حرام ہے۔ مثلاً کوئی دوست ہے یا بھائی ہے، اس کی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرلی تو یہ جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ البتہ اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ اس کی چیز استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اور خوشی سے اس کی اجازت دیدے گا تب تو استعمال کرنا جائز ہے، لیکن جہاں ذرا بھی اس کی اجازت میں شک ہو چاہے وہ حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو، یا چاہے وہ بیٹا ہو اور اپنے باپ کی چیز استعمال کررہا ہو، جب تک اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ خوش دلی سے وہ اجازت دیدے گا یا میرے استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اس وقت تک اس کا استعمال جائز نہیں۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

(۱) كنز العمال، رقم: ۳۹۷ (۱/۹۱)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، جامع الأحاديث، رقم: ۱۷٦۱٥ (۱۷/۸۰)، كشف الخفاء، رقم: ۳۱۰۱ (۲/۳۷۰)

''کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے''

اس حدیث میں ''اجازت'' کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ ''خوش دلی'' کا لفظ استعمال فرمایا، مطلب یہ ہے کہ صرف اجازت کافی نہیں بلکہ وہ اس طرح اجازت دے کہ اس کا دل خوش ہو تب تو وہ چیز حلال ہے۔ اگر آپ دوسرے کی چیز استعمال کر رہے ہیں لیکن آپ کو اس کی خوش دلی کا یقین نہیں ہے تو آپ کے لئے وہ چیز استعمال کرنا جائز نہیں۔

ایسا چندہ حلال نہیں

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسوں کے چندے اور انجمنوں کے چندے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ چندے اس طرح وصول کرنا کہ دوسرا شخص دباؤ کے تحت چندہ دیدے ایسا چندہ حلال نہیں۔ مثلاً آپ نے مجمع عام میں چندہ لینا شروع کر دیا اس مجمع میں ایک آدمی شرما شرمی میں یہ سوچ کر چندہ دے رہا ہے کہ اتنے سارے لوگ چندہ دے رہے ہیں اور میں چندہ نہ دوں تو میری ناک کٹ جائے گی اور دل کے اندر چندہ دینے کی خواہش نہیں تھی، تو یہ چندہ خوش دلی کے بغیر دیا گیا یہ ''چندہ'' لینے والے کے لئے حلال نہیں۔

اس موضوع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ احکام لکھے ہیں کہ کس حالت میں چندہ لینا جائز ہے اور کس حالت میں چندہ لینا جائز نہیں۔

ہر ایک کی ملکیت واضح ہونی چاہئے

بہرحال! یہ اصول ذہن میں رکھو کہ جب تک دوسرے کی خوش دلی کا اطمینان نہ ہو اس وقت تک دوسرے کی چیز استعمال کرنا حلال نہیں، چاہے وہ بیٹا کیوں نہ ہو، باپ کیوں نہ ہو، بھائی اور بہن کیوں نہ ہو، چاہے بیوی اور شوہر کیوں نہ ہو، اس اصول کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہمارے مال میں حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے، اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو کوئی غلط کام نہیں کرتا، رشوت میں نہیں لیتا، سود میں نہیں کھاتا، چوری میں نہیں کرتا، ڈاکہ میں نہیں ڈالتا، اس لئے میرا مال تو حلال ہے لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس اصول کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے مال حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے اور مال میں حرام کی آمیزش حلال مال کو بھی تباہ کر دیتی ہے، اور اس کی برکتیں زائل ہو جاتی ہیں، اس کا نفع ختم ہو جاتا ہے، اور الٹا اس حرام مال کے نتیجے میں انسان کی طبیعت گناہوں کی طرف چلتی ہے، روحانیت کو نقصان ہوتا ہے، اس لئے معاملات کو صاف رکھنے کی فکر کریں کہ کسی معاملے میں کوئی الجھاؤ نہ

رہے، ہر چیز صاف اور واضح ہونی چاہئے، ہر چیز کی ملکیت واضح ہونی چاہئے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے یہ فلاں کی ملکیت ہے، البتہ ملکیت واضح ہوجانے کے بعد آپس میں بھائیوں کی طرح رہو، دوسرے شخص کو تمہاری چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو دیدو، لیکن ملکیت واضح ہونی چاہئے تاکہ کل کو کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہوجائے۔

مسجد نبوی کے لئے زمین مفت قبول نہ کی

جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پیش نظر سب سے پہلا کام یہ تھا کہ یہاں پر کوئی مسجد بنائی جائے، وہ مسجد نبوی جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے، چنانچہ ایک جگہ آپ کو پسند آگئی جو خالی پڑی ہوئی تھی، آپ نے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرایا کہ یہ کس کی جگہ ہے؟ تو پتہ چلا کہ یہ بنی نجار کے لوگوں کی جگہ ہے، جب بنونجار کے لوگوں کو پتہ چلا کہ آپ اس جگہ پر مسجد بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو ہماری بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہماری جگہ پر مسجد بنائی جائے، ہم یہ جگہ مسجد کے لئے مفت دیتے ہیں تاکہ آپ یہاں پر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائیں، آپ نے فرمایا کہ نہیں میں مفت نہیں لوں گا، تم اس کی قیمت بتاؤ قیمت کے ذریعہ لوں گا۔(۱)

حالانکہ بظاہر یہ معلوم ہورہا تھا کہ وہ لوگ اپنی سعادت اور خوش نصیبی سمجھ کر یہ چاہ رہے تھے کہ ان کی جگہ مسجد نبوی کی تعمیر میں استعمال ہوجائے لیکن اس کے باوجود آپ نے مفت لینا گوارہ نہیں کیا۔

تعمیر مسجد کے لئے دباؤ ڈالنا

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ویسے تو جب بنی نجار کے لوگ مسجد کے لئے چندہ کے طور پر مفت زمین دے رہے تھے تو یہ زمین لینا جائز تھا، اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں تھی۔ لیکن چونکہ مدینہ منورہ میں اسلام کی یہ پہلی مسجد تعمیر ہورہی تھی اگرچہ قبا میں ایک مسجد تعمیر ہوچکی تھی اور یہ وہ مسجد تھی جس کو آئندہ حرم مکہ کے بعد دوسرا مقام حاصل ہونا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب هل تنبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد، رقم: ۴۱۰، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب ابتناء مسجد النبي، رقم: ۸۱۶، سنن النسائي، کتاب المساجد، باب نبش القبور واتخاذ أرضها مسجدا، رقم: ۶۹۵، مسند أحمد رقم: ۱۱۸۸۵

بات کو پسند نہیں فرمایا کہ یہ زمین اس طرح مفت قیمت کے بغیر لے لی جائے۔ ورنہ آئندہ کے لئے لوگوں کے سامنے یہ نظیر بن جائے گی کہ جب مسجد بنانی ہو تو مسجد کے لئے زمین قیمتاً خریدنے کے بجائے لوگ مفت اپنی زمینیں دیں، اور اس لئے یہ زمین مفت قبول نہیں کی تاکہ لوگوں پر یہ واضح فرمادیں کہ یہ بات درست نہیں کہ مسجد کی تعمیر کی خاطر دوسروں پر دباؤ ڈالا جائے، یا دوسروں کی املاک پر نظر رکھی جائے، اس وجہ سے حضور ﷺ نے پیسے دے کر وہ زمین خریدی اور پھر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی تاکہ معاملہ صاف رہے اور کسی قسم کی کوئی الجھن برقرار نہ رہے۔

پورے سال کا نفقہ دینا

آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات، جو حقیقت میں آنحضرت ﷺ کی شریک حیات بننے کی وہی مستحق تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکالی ہوئی تھی اور آخرت کی محبت ان کے دلوں میں بھری ہوئی تھی، لیکن حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ سال کے شروع میں اپنی تمام ازواج مطہرات کا نفقہ اکٹھا دیدیا کرتے تھے اور ان سے فرمادیتے کہ یہ تمہارا نفقہ ہے تم جو چاہو کرو۔(۱)

اب وہ ازواج مطہرات بھی حضور ﷺ کی ازواج مطہرات تھیں ان کے یہاں تو ہر وقت صدقہ خیرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، چنانچہ وہ ازواج مطہرات بقدر ضرورت اپنے پاس رکھتیں باقی سب خیرات کردیتی تھیں، لیکن حضور ﷺ نے یہ مثال قائم فرمائی کہ پورے سال کا نفقہ اکٹھا دیدیا۔

ازواج مطہرات سے برابر کا معاملہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے پابندی اٹھائی تھی کہ وہ اپنی ازواج مطہرات میں برابری کریں، بلکہ آپ کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ جس کو چاہیں زیادہ دیں اور جس کو چاہیں کم دیں، اس معاملے میں ہم آپ سے مواخذہ نہیں کریں گے، اس اختیار کے نتیجے میں ازواج مطہرات کے درمیان برابری کرنا آپ کے ذمہ فرض نہیں رہا تھا، جب کہ امت کے تمام افراد کے لئے برابری کرنا فرض ہے، لیکن حضور ﷺ نے ساری عمر اس اختیار اور اجازت پر عمل نہیں فرمایا بلکہ ہر چیز میں برابری فرمائی، اور ان کی ملکیت کو واضح اور نمایاں فرمادیا تھا، اور ان کے حقوق پوری طرح زندگی بھر ادا فرمائے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب المساقاة والمعاملة بجزء من الثمر والزرع، رقم:۲۸۹۷

خلاصہ

بہر حال! ان احادیث اور آیات میں جو بنیادی اصول بیان فرمایا جس کو ہم فراموش کرتے جا رہے ہیں وہ "معاملات کی صفائی" اور معاملات کی درستی ہے یعنی معاملہ صاف اور واضح ہو، اس میں کوئی اجمال اور ابہام نہ رہے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک اپنے معاملات کو صاف رکھے، اس کے بغیر آمدنی اور اخراجات شریعت کی حدود میں نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے اس حقیقت اور اس حکم کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



معاملات کی صفائی اور تنازعات ☆

ہمارے معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب امڈا ہوا ہے اس کا تھوڑا سا اندازہ عدالت میں دائر ہونے والے مقدمات سے ضرور ہوسکتا ہے، لیکن یہ اندازہ یقیناً ناکافی اور حقیقت سے بہت کم ہوگا، کیونکہ بے شمار تنازعات وہ ہیں جن کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی، عدالت سے رجوع کرنے میں وقت اور پیسے کا جو بے تحاشا صرفہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عدالت سے رجوع نہیں کر پاتے، اس کے بجائے فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کی حد تک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اس طرح عداوت کی آگ بھڑکتے بھڑکتے کئی کئی پشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ان تنازعات کی تہہ میں اگر دیکھا جائے تو وہی زر اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں، روپیہ پیسہ اور زمین جائیداد کا جھگڑا بڑے بڑے پرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کر ڈالتا ہے، اور اس کی وجہ سے بڑی بڑی مثالی دوستیاں آن کی آن میں دشمنیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب ہیں لیکن ایک بہت بڑا سبب ''معاملات'' کو صاف نہ رکھنا ہے ہمارے دین کی ایک انتہائی زریں تعلیم یہ ہے کہ:

''آپس میں رہو بھائیوں کی طرح لیکن لین دین کے معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''

مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ ایسا کرو جیسے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ کرنا چاہئے، اس میں ایثار، مروت، رواداری، تحمل اور اپنائیت کا مظاہرہ کرو، لیکن جب روپے پیسے کے لین دین، جائیداد کے معاملات اور شرکت وحصہ داری کا مسئلہ آجائے تو بہتر تعلقات کی حالت میں بھی انہیں اس طرح انجام دو جیسے دو اجنبی شخص انہیں انجام دیتے ہیں، یعنی معاملے کی ہر بات صاف ہونی چاہئے نہ کوئی بات ابہام میں رہے اور نہ معاملے کی حقیقت میں کوئی اشتباہ باقی رہے۔

☆ ذکر و فکر، ص: ۸۳

اگر محبت، اتفاق اور خوشگوار تعلقات کی حالت میں دین کی اس گراں قدر تعلیم پر عمل کر لیا جائے تو بعد میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں اور جھگڑوں کا سد باب ہو جاتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس اہم اصول کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے اس کے چند مظاہر یہ ہیں:

(۱) بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی یا باپ بیٹے مشترک طور پر ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور کسی حساب و کتاب کے بغیر سب لوگ مشترک کاروبار سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں، نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پر کام کر رہے ہیں؟ یا کاروبار کے حصہ دار ہیں؟ تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے تو کس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضرورت کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کرتا رہتا ہے، اور اگر کبھی کوئی شخص یہ تجویز پیش کرے کہ کاروبار میں حصے یا تنخواہ وغیرہ متعین کر لینی چاہئے تو اسے محبت اور اتفاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار کا انجام اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے خلاف رنجشیں پرورش پاتی رہتی ہیں، بالخصوص جب حصہ داروں کے یہاں شادیاں ہو جاتی ہیں تو ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرے نے کاروبار سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور مجھ پر ظلم ہوا ہے، اگرچہ ظاہری سطح پر باہم رورعایت کا وہی انداز باقی نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر رنجشوں کا لاوا پکتا رہتا ہے، اور بالاخر جب یہ رنجشیں بدگمانیوں کے ساتھ ملکر پہاڑ بن جاتی ہیں تو یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے، اور محبت و اتفاق کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، زبانی تو تکار سے لیکر لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک کسی کام سے دریغ نہیں ہوتا، بھائی بھائی کی بول چال بند ہو جاتی ہے، ایک بھائی دوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں رہتا، جس کے قابو میں کاروبار کا جتنا حصہ آتا ہے وہ اس پر قابض ہو کر عدل و انصاف کا بے دریغ خون کرتا ہے، اور پھر اپنی نجی مجلسوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی اور بدگمانی کا وہ طوفان کھڑا کرتا ہے کہ الامان!

پھر چونکہ سالہا سال تک مشترک کاروبار کا نہ کوئی اصول طے شدہ تھا نہ کوئی حساب و کتاب رکھا گیا اس لئے اگر اختلافات پیش آنے کی صورت میں افہام و تفہیم سے کام لینے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو معاملات کی ڈور الجھ کر اتنی پیچیدہ ہو چکی ہوتی ہے کہ منصفانہ تصفیہ کے لئے اس کا سرا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص واقعات کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے، اور مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا بھی سخت مشکل ہو جاتا ہے جو تمام متعلقہ فریقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

یہ سارا فساد اکثر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار کے آغاز میں یا اس میں مختلف افراد کی

شمولیت کے وقت معاملے کو معاملے کی طرح طے نہیں کیا جاتا، اگر شروع ہی سے یہ بات واضح ہو کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے؟ اور کس کے کیا حقوق وفرائض ہیں؟ اور یہ ساری باتیں تحریری شکل میں محفوظ ہوں تو بہت سے جھگڑوں اور بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا شروع ہی میں سد باب ہو جائے۔

قرآن کریم میں جو آیت سب سے طویل آیت ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم کوئی ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو جب معمولی رقم ادھار دینے پر یہ تاکید ہے تو کاروبار کے پیچیدہ معاملات کو تحریر میں لانے کی اہمیت کتنی زیادہ ہوگی؟ (۱)

یہ حکم اسی لئے دیا گیا ہے تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں، اور اگر ہوں تو انہیں حق وانصاف کے مطابق نمٹانا آسان ہو۔

لہٰذا اگر کسی کاروبار میں ایک سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں تو پہلے ہی قدم پر ان میں سے ہر شخص کی حیثیت کا تعین ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر باپ کے کاروبار میں کوئی بیٹا شامل ہوا ہے تو اس کے بارے میں بھی پہلے ہی دن سے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ تنخواہ پر کام کریگا؟ یا کاروبار میں باقاعدہ حصہ دار ہوگا؟ یا محض اپنے باپ کی مدد کرے گا؟ پہلی صورت میں اس کی تنخواہ متعین ہونی چاہئے اور یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ وہ کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہے اور دوسری صورت میں اگر اسے کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنانا ہے تو شرعاً اس کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے کاروبار میں کچھ سرمایہ ضرور شامل ہونا چاہئے (جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے کچھ نقد رقم ہبہ کردے اور وہ اس رقم سے کاروبار کا ایک متعین فیصد حصہ خرید لے) دوسرے یہ بات تحریری طور پر ایک معاہدہ شرکت کی شکل میں محفوظ کر لینی چاہئے اور اس معاہدے میں یہ بھی صراحت ہونی چاہئے کہ نفع میں کتنا فیصد حصہ کس کا ہوگا؟ تاکہ بعد میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو؟

اگر کسی ایک حصہ دار کو کاروبار میں کام زیادہ کرنا پڑتا ہو تو یہ بات بھی طے ہونی چاہئے کہ آیا وہ یہ زیادہ کام رضا کارانہ طور پر کرے گا یا اس زیادہ کام کا کوئی معاوضہ اسے دیا جائے گا، اگر کوئی معاوضہ دیا جائیگا تو وہ نفع کے کتنے فیصد حصے میں اضافہ کر کے دیا جائے گا، یا متعین تنخواہ کی صورت میں؟ غرض ہر فریق کے حقوق وفرائض اتنے واضح ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

اگر بالفرض کسی کاروبار میں اب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا گیا تو جتنی جلد ہو سکے ان امور کو

(۱) البقرة: ۲۸۲، يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ......الخ

طے کر لینا ضروری ہے اور اس معاملے میں کسی شرم، مروت اور طعن و تشنیع کو آڑے نہ آنے دینا چاہئے، معاملات کی اس صفائی کو محبت واخوت اور اتحاد واتفاق کے خلاف سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے، بلکہ درحقیقت محبت اور اتفاق کی پائیداری ان امور پر منحصر ہے ورنہ آگے چل کر یہ سطحی محبت دلوں میں عداوت کو جنم دے سکتی ہے، اور اسی لئے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ "رہو بھائیوں کی طرح لیکن معاملات اجنبیوں کی طرح کرو"

(۲) اسی طرح ہمارے معاشرے میں بالخصوص متوسط آمدنی والے طبقے میں اپنے ملکیتی مکان کا حصول ایک بڑا مسئلہ ہے اور عموماً کسی مکان کی تعمیر یا اس کی خریداری خاندان کے کئی افراد ملکر کرتے ہیں، اگر باپ نے کوئی مکان بنانا شروع کیا ہے تو بیٹے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں اپنی رقمیں لگاتے ہیں، لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ رقمیں کچھ سوچے سمجھے بغیر اور بسااوقات کوئی حساب رکھے بغیر لگادی جاتی ہیں، یعنی یہ بات طے نہیں ہوتی کہ بیٹا جو رقم مکان کی تعمیر کے لئے دے رہا ہے آیا یہ باپ کی خدمت میں ہدیہ ہے؟ یا قرض ہے؟ یا وہ مکان کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لئے یہ رقم خرچ کر رہا ہے؟ پہلی صورت میں نہ وہ مکان کی ملکیت کا حصہ دار ہوگا نہ باپ سے یہ رقم کسی وقت واپس لینے کا حق دار ہوگا، دوسری صورت میں مکان تو تنہا باپ کی ملکیت ہوگا لیکن دی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض سمجھی جائے گی، تیسری صورت میں اپنی لگائی ہوئی رقم کے بقدر وہ مکان کی ملکیت میں بھی شریک ہوگا اور مکان کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حصے کی مالیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض ہر صورت کے تقاضے اور نتائج مختلف ہیں، لیکن چونکہ رقم لگاتے وقت ان تینوں میں سے کوئی صورت طے نہیں ہوئی، نہ رقموں کا پورا حساب رکھا جاتا ہے اس لئے آگے چل کر جب مکان کی قیمت بڑھتی ہے تو آپس میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اور خاص طور پر باپ کے انتقال کے بعد جب ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو یہ اختلافات ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، ان کی وجہ سے بھائیوں میں چھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آجاتی ہے اور لڑائی جھگڑوں سے خاندان کا خاندان متاثر ہوتا ہے۔

اگر اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے تعمیر کے شروع ہی میں یہ ساری باتیں طے کر لی جائیں اور انہیں تحریری طور پر قلمبند کر لیا جائے تو اس خاندانی فساد کا راستہ بند ہوجائے۔

(۳) جب خاندان کے کسی بڑے کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا ترکہ اس کے شرعی وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں شریعت کے اس حکم سے شدید غفلت برتی جاتی ہے، بعض اوقات تو جس کے جو ہاتھ لگتا ہے لے اڑتا ہے، اور حلال وحرام ہی

کی پرواہ نہیں کی جاتی، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پیش نظر بددیانتی نہیں ہوتی، لیکن ناواقفیت یا لاپروائی کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور اگر مرحوم نے کوئی کاروبار چھوڑا ہے تو اس پر وہی بیٹا کام کرتا رہتا ہے جو مرحوم کی زندگی میں کرتا تھا، لیکن یہ طے نہیں کیا جاتا کہ اب کاروبار کی ملکیت کس تناسب سے ہوگی؟ شرعی ورثاء کے حصوں کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ کام کرنے والے کو اس کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا کیا جائے گا؟ ترکے میں کون سی چیز کس کے حصے میں آئے گی؟ بلکہ اگر کوئی شخص ترکے کی تقسیم کی طرف توجہ دلائے بھی تو اس کی تجویز کو ایک معیوب تجویز سمجھا جاتا ہے، کہ ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ لوگوں کو بٹوارے کی فکر پڑ گئی ہے۔

حالانکہ یہ بٹوارہ شریعت کا حکم بھی ہے، معاملات کی صفائی کا تقاضا بھی اور اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ورثاء کو اپنے اپنے حقوق کا خیال آتا ہے رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، ترکے کی اشیاء کی قیمتوں میں زمین وآسمان کا فرق پڑ جاتا ہے، اور چونکہ کوئی بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی اس لئے اب معاملات الجھ جاتے ہیں ان کے مناسب تصفیہ میں سخت مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں، اور ان سب باتوں کا نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر شریعت کے حکم کے مطابق وقت پر ترکے کی تقسیم عمل میں آجائے اور باہمی رضامندی اور اتحاد واتفاق کے ساتھ تمام ضروری باتیں طے پاجائیں تو آئندہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے، اور باہمی محبت واخوت کو فروغ ملتا ہے۔

یہ تو میں نے صرف تین سادہ سی مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ معاشرے میں پھیلے ہوئے جھگڑوں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ معاملات کو صاف نہ رکھنا ہمارے معاشرے کا ایک ایسا روگ بن چکا ہے جس نے فتنہ وفساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے، معاملہ، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، صاف ستھرا ہونا چاہئے اس کی شرائط واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئیں، اور اس سلسلے میں کوئی شرم وحیا اور لحاظ ومروت آڑے نہیں آنی چاہئے، جب ایک مرتبہ معاملے کی شرائط اس طرح طے پاجائیں تو اس کے بعد باہمی برتاؤ میں جو شخص جس سے جتنا حسن سلوک کرسکے بہتر ہی بہتر ہے، اور یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ ''رہو بھائیوں کی طرح اور معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''

☆☆☆

ہمارا معاشی نظام ☆

کسی قوم کی معاشی حالت کو بہتر اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کے تمام افراد کو زندگی کی تمام ضروریات فارغ البالی اور سکون واطمینان کے ساتھ میسر ہوں، ملک کی پیداوار اور آمدنی اگر زیادہ ہو تو ملک کے تمام باشندے اس کی برکات سے مستفید ہوں، اور کسی کو تقسیم دولت کے معاملے میں کسی ناانصافی کی جائز شکایت نہ ہو، اس کے برخلاف اگر ملک کی ساری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور قوم کی اکثریت بھوک اور افلاس کا رونا رو رہی ہو، امیروں کے خزانے میں دولت کے انبار پر انبار لگتے چلے جائیں اور محنت کش عوام کی جیب سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک ایک پیسہ سرک کر ختم ہو جائے تو خواہ ملک کی زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل و جواہر برآمد ہو رہے ہوں، اسے ملک کی معاشی ترقی نہیں کہا جا سکتا، یہ وہ اجتماعی دیوالیہ پن ہے جس کی موجودگی میں کسی قوم کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہماری شومیٔ اعمال ہے کہ ہمارے ملک کی معاشی صورت حال کچھ ایسی ہی بن کر رہ گئی ہے کہ اوپر اوپر سے دیکھئے تو ہم نے گذشتہ ۲۶ سالوں میں زراعت صنعت اور تجارت کے ہر میدان میں خاصی ترقی کی ہے جب پاکستان بنا تھا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا، اور آج خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے، لیکن افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ سرگرداں ہے، دولت کی یہ چمک دمک اس کے غم کدے میں کوئی اجالا نہیں کر سکی، اس کے شب و روز پہلے سے زیادہ سختیوں کا شکار ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے، ہمارے یہاں عرصہ دراز سے نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں رائج ہے، مغرب کی دوسو سالہ محکومی نے ہمارے دل ودماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو آزادی کے ساتھ سوچنے کے بجائے آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے ہمیں دکھادی تھی، زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح ہم نے اپنی معیشت کو بھی ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جن پر ہمارے سرمایہ دار

☆ ہمارا معاشی نظام، ص: ۹

''حاکم'' نے اپنے معاشرے کو تعمیر کیا تھا ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس بے چینی کے سوا کیا مل سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

سالہا سال تک اس طرز معیشت کو آزمانے کے بعد اب یہ شعور تو بحمد للہ پیدا ہونے لگا ہے کہ یہ راستہ ترقی کا نہیں تباہی کا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری معاشی ناہمواریوں کی ذمہ داری موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیری نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی ذہن مغرب کے فکری تسلط سے اتنے آزاد نہیں ہوئے کہ اس کی فکری کج روی کو آزما کر خود اپنے ذہن سے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں، اس کے بجائے وہ یہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے بھی ہم مغرب ہی کا رخ کرتے ہیں اور کسی ایسے حل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مغرب کی فکری مشینری میں نہ ڈھلا ہو۔

چنانچہ آج ہم میں سے ایک طبقہ بڑے زور شور سے ''سوشلزم'' اور ''اشتراکیت'' کے نعرے لگا رہا ہے، حالانکہ اشتراکیت بھی مغرب کی اسی مادی تہذیب کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا، حقیقت میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل نہ اس کے پاس تھا نہ اس کے پاس ہے وہ اگر افراط تھی تو یہ تفریط ہے، مزدور اور کسان اگر سرمایہ داری نظام میں مظلوم اور مقہور تھے تو اشتراکی نظام میں بھی وہ کچھ کم بے بس نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ انسان ''سرمایہ'' کا خود مختار مالک ہے روزمرہ کی ضروریات کے علاوہ ذرائع پیداوار پر بھی اس کی ملکیت بے قید اور آزاد ہے، وہ جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے، جس کام میں چاہے انہیں لگائے جس طریقے سے چاہے ان سے نفع حاصل کرے، اپنے تیار شدہ مال کی جو قیمت چاہے مقرر کرے، جتنے آدمیوں سے جن شرائط پر چاہے کام لے، غرض اپنے کاروبار کے بارے میں اسے کھلی آزادی ہے، اور ریاست اس کی ملکیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی، اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف تجربات سے دوچار ہونے کے بعد اس آزاد ملکیت پر تھوڑی تھوڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں، لیکن یہ تصور اب بھی پوری طرح برقرار ہے کہ انسان سرمایہ کا ''مالک'' ہے اور چند قانونی حد بندیوں سے قطع نظر سرمایہ سے سرمایہ پیدا کرنے کا ہر طبقہ اس کے لئے جائز ہے، اسی تصور کی بنیاد پر سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کو اس نظام میں شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے، اور یہ چیزیں اس نظام کے عناصر اربعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس نظام کے جو نتائج بد دنیا نے دیکھے اور اب تک دیکھ رہی ہے، وہ یہ ہیں کہ معاشرے میں دولت کی گردش نہایت ناہموار اور غیر متوازن ہوتی چلی جاتی ہے، سرمایہ دار سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کے

ذریعہ چاروں طرف ہاتھ مار کر روپیہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور دولت کے اس ذخیرے کے بل پر پورے بازاروں کا حکمراں بن بیٹھتا ہے، قیمتوں کو مصنوعی طور پر چڑھایا اور گرایا جاتا ہے، اور غیر ضروری بلکہ مضر اشیاء کو زبردستی معاشرے پر ٹھونسنے کے لئے ان کی فراوانی کردی جاتی ہے اور قوم کی حقیقی ضروریات کا مصنوعی قحط پیدا کردیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس نظام میں بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عین اس وقت جب کہ معاشرے کے سینکڑوں افراد بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں غلے اور اشیائے خوردونوش کے لدے ہوئے جہاز جان بوجھ کر غرق کردیئے جاتے ہیں، ان کے ذخیروں کو آگ لگادی جاتی ہے تاکہ یہ اشیاء افراط کے ساتھ بازار میں آکر سستے داموں ضرورت مند افراد تک نہ پہنچ سکیں اور قیمتوں کا جو معیار سرمایہ دار نے مقرر کرلیا ہے اس میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ظاہر ہے کہ سرمایہ داری اس کاروباری آنکھ مچولی میں ایک عام آدمی کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس کی آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کی زندگی چند گنے چنے افراد کے ذاتی مفادات کے تابع ہوکر رہ جاتی ہے، دولت کے اس سمٹاؤ کا اثر پوری قوم کی صرف معیشت ہی پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار اور طرز فکر و عمل پر بھی پڑتا ہے، اور ملکی و بین الاقوامی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ان خرابیوں کو تو دیکھا لیکن مرض کے اسباب کی ٹھنڈے دل ودماغ سے تشخیص نہ کرسکی اور معاملہ کی دوسری انتہا پر جا کھڑی ہوئی، سرمایہ داری نے کہا تھا کہ انسان بحیثیت فرد ذرائع پیداوار کا ''مالک'' ہے اشتراکیت نے کہا کہ کوئی فرد کسی ذریعہ پیداوار کا مالک نہیں زمینوں اور کارخانوں کو جاگیردار اور سرمایہ دار کے تصرف سے نکال دو تو وہ بانس ہی نہ رہے گا جس سے ظلم کی بانسری بجتی ہے، اس کی عملی شکل یہ تجویز کی گئی کہ محنت کش عوام کے انتخاب سے ایک کمیٹی بناؤ، اور ملک کی تمام زمینیں اور ساری بنیادی صنعتیں انفرادی ملکیت سے نکال کر اس کے حوالے کردو، یہ پارٹی ایک حکومت کی تشکیل کرکے ایک منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کی بنیاد ڈالے گی وہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کیا چیز پیدا کرنی ہے؟ پھر وہی محنت کش عوام کو مختلف کاموں میں لگا کر پیداوار حاصل کرے گی اور وہی اس حاصل شدہ پیداوار کو محنت کرنے والوں کے درمیان ایک خاص تناسب سے تقسیم کرے گی۔

یہ تجویز بڑی زور شور کے ساتھ پیش کی گئی اور کہا گیا کہ اس طریق کار میں مزدور اور کسان کے ہر دکھ کا علاج ہے، لیکن نتائج پر غور کیجئے تو اس نظام معیشت نے نہ صرف یہ کہ کچھ نئی مشکلات کھڑی کردیں بلکہ مزدور کی پرانی مصیبتیں بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہیں، تھوڑی دیر کے لئے اس

بات سے قطع نظر کر لیجئے کہ اس تجویز کو عملی طور سے نافذ کرنے میں کتنی مشکلات ہیں؟ اس بحث کو بھی جانے دیجئے کہ یہ نظام شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کے بغیر نہیں چل سکتا، اس پہلو کو بھی کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیجئے کہ اس سے بسا اوقات مزدور اور کسان کو اس کام پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو وہ اپنی افتادِ طبع کے تحت نہیں کرنا چاہتا، اس واقعہ کو بھی بالائے طاق رکھئے کہ اس نظام میں ''جبری محنت'' اور ''بیگار کیمپ'' مزدور پر کیا ظلم ڈھاتے ہیں؟ اس بات کو بھی مت سوچئے کہ اس نظام میں مذہب واخلاق کا کیا حشر ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظام میں بھی جو خالص مزدور اور کسان ہی کے نام پر ابھرا ہے ملک کی دولت سے عام آدمی کو کتنا حصہ مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والی یہ پارٹی جس میں محنت کش عوام کے بمشکل پانچ فیصد افراد شریک ہوتے ہیں کوئی فرشتوں کی جماعت تو نہیں ہوتی، اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک انفرادی سرمایہ دار کی نیت مزدور کے حق میں خراب ہوسکتی ہے تو اس پارٹی کی نیت کیوں خراب نہیں ہوسکتی؟ اگر ایک شخص بڑے کارخانے کا صرف مالک ہوکر اپنے زیر دستوں پر ظلم ڈھا سکتا ہے تو یہ پارٹی ملک کی ساری زمینوں، سارے کارخانوں اور ساری دولت پر قابض ہوکر اپنے زیر دستوں کے حقوق پر کیوں ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تو بیشک ختم ہوجاتے ہیں لیکن ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آجاتا ہے جو دولت کی اس وسیع جھیل کو من مانے طریقے سے استعمال کرسکتا ہے، چنانچہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ محنت کش عوام میں تقسیم ہوتا ہے اور باقی ساری دولت حکمراں جماعت کے رحم وکرم پر ہوتی ہے، بیرونی دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ اشتراکی ملک کی صنعت وتجارت دنیا پر چھارہی ہے وہاں مصنوعات اور ایجادات کی بہتات ہے اور وہاں کے مصنوعی سیارے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں، لیکن اس بات کو سوچنے والے کم ہوتے ہیں کہ وہاں محنت کش عوام کو ان ترقیات کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اور دولت کے عظیم الشان ذخیروں میں سے انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے؟ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جس طرح سرمایہ دار ممالک میں ''ترقی'' کا مطلب چند سرمایہ داروں کی ترقی ہے اسی طرح اشتراکی نظام میں بھی ''ترقی'' ایک خاص طبقے کی ترقی سے عبارت ہے، رہا بے چارہ عام مزدور اور کسان سو وہ دونوں جگہ صرف اتنی اجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی اس کے ''آقا'' اسے دینا چاہیں، فرق اتنا ہے کہ وہاں اگر اسے اجرت کم محسوس ہوتی تھی تو وہ ہڑتال احتجاج اور پیشے کی تبدیلی کے ذریعہ اپنے آنسو دھونے کی کوشش کرلیتا تھا، لیکن یہاں اسے اپنی کسی حق تلفی پر کراہنے کی بھی اجازت نہیں، شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم نے اسی لئے کہا تھا:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس کے برعکس اسلام کے عدل عمرانی کی شاہراہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے بیچ سے گزرتی ہے، اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز خواہ زمین اور کارخانے کی شکل میں ہو، یا روپے پیسے اور اشیائے صرف کی شکل میں، اصل میں اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ملکیت میں ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱)

''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے''

ہاں وہ اپنی یہ ملکیت نفع اٹھانے کے لئے اپنے بندوں کو دے دیتا ہے۔

﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ (۲)

''بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے''

جب انسان کے ہاتھ میں ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اللہ کی مرضی کا پابند ہوگا، اس کے ذریعہ دوسروں پر ظلم ڈھا کر زمین میں فساد برپا کردینا اللہ کو کسی طرح گوارہ نہیں، انسان کا کام یہ ہے کہ وہ دسروں کا خون چوسنے کے بجائے اپنی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کو پیش نظر رکھ کر دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۳)

''اور اللہ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعے تم دار آخرت (کی بھلائی) تلاش کرو، اور دنیا سے جو حصہ تمہیں ملا ہے اسے نہ بھولو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم دوسروں پر احسان کرو اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کرو''

ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے انفرادی طور سے ملکیت عطا تو کی ہے لیکن یہ ملکیت آزاد خود مختار خود غرض اور بے لگام نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے احکام کی پابند ہے، اس کو انسان اپنے جائز نفع کے لئے تو استعمال کرسکتا ہے لیکن اس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی جتنی خرابیوں اور اس کی جتنی ناانصافیوں پر آپ نظر ڈالیں گے بنیادی

(۱) البقرة:۲۸٤ (۲) الاعراف:۱۲۸

(۳) القصص:۷۷

طور سے ان کے چار ہی سبب نظر آئیں گے، سود، قمار، سٹہ اور اکتناز، سرمایہ دار ایک طرف تو سود، قمار اور سٹہ کے ذریعہ ساری قوم کی دولت کھینچ کھینچ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے دوسری طرف اس کے کھانے میں کسی غریب، مفلس، اپاہج یا بے سہارا انسان پر لازمی سے کچھ خرچ کرنے کی کوئی مد نہیں، وہ خود اپنی شرافت سے کسی کو کچھ دیدے تو اس کا احسان ہے ورنہ ایسے اخراجات کی کوئی پابندی اس پر نہیں ہے۔

اسلام نے اولاً تو آمدنی کے ناجائز ذرائع کا دروازہ بالکل بند کر دیا، سود، قمار، سٹہ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کو بدترین جرم قرار دے کر صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

﴿لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (۱)

"اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقے سے مت کھاؤ الا یہ کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو"

سود میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کاروبار کرنے والے کو نقصان ہوجائے تو سارا نقصان اس پر پڑتا ہے اور قرض دینے والے کا سود ہر حال میں کھرا رہتا ہے، اور اگر نفع ہوجائے تو سارا نفع وہ لے اڑتا ہے اور قرض دینے والے کو اس کا چالیسواں حصہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح دولت پھیلنے کے بجائے سکڑتی ہے اور ہموار طریقے سے گردش نہیں کرسکتی، اسلام نے اس کے بجائے شرکت ومضاربت کی صورت تجویز کی ہے جس میں نفع ہو تو فریقین کا ہو اور نقصان ہو تو دونوں اسے برداشت کریں۔

قمار اور سٹہ میں بھی ساری قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ ایک جگہ جمع ہوجاتا ہے پھر ایک عام آدمی کا ایک روپیہ یا تو اس جیسے ہزاروں غریب آدمیوں کی جیب سے ایک ایک روپیہ کھینچ کر اس کے پاس جمع کر دیتا ہے یا خود بھی کسی سرمایہ دار کی جیب میں جا کر گرتا ہے، غرض دونوں ہی صورتوں میں روپیہ سمٹتا ہے اور اس کی فطری گردش رک جاتی ہے، اسلام نے اس پر اور کاروبار کے ایسے تمام طریقوں پر پابندی بٹھا دی ہے جن میں ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو یا جس سے پورے معاشرے کی دولت ایک جگہ سمٹنے لگے۔

آمدنی کے ناجائز ذرائع پر پابندی لگانے کے علاوہ سرمایہ داروں سے غریبوں تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے سرمایہ دار پر زکوٰۃ جیسے بہت سے اخراجات واجب کر دیئے ہیں جو اس کا

---

(۱) النساء: ۲۹

احتساب نہیں بلکہ اس مال پر واجب ہونے والا حق ہے، جسے بزور قانون وصول کیا جا سکتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ عشر، خراج، صدقہ فطر، قربانی، کفارات، نفقات، وصیت اور وراثت وہ چھوٹی بڑی مدات ہیں جن کے ذریعہ دولت کے تالاب سے چاروں طرف نہریں نکلتی ہیں اور ان سے پورے معاشرے کی کھیتی سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔

ان قانونی پابندیوں کے ساتھ اسلام بحیثیت مجموعی جس ذہنیت کی تعمیر کرتا ہے اس کی بنیاد سنگدلی، کنجوسی، بے رحمی اور خودغرضی کے بجائے ہمدردی، فراخ حوصلگی، سخاوت اور سب سے بڑھ کر خوف خدا اور فکر آخرت پر استوار ہوئی ہے، اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذمے عائد ہونے والے قانونی فرائض کی ادائیگی پر بس کرلے اور اس کے بعد دوسروں کے دکھ درد سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے، اس کو زندگی کے ہر مرحلہ پر تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یہ دنیا چند دنوں کی بہار ہے، عیش ومسرت روپے اور پیسے کے اس ڈھیر کا نام نہیں ہے جو یہاں جمع کرلیا جائے، بلکہ روح کے اس سکون اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جو اپنے کسی بھائی کے چہرے پر خوش حالی کی مسکراہٹ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے، اور جس سے آخرت کی آنے والی زندگی میں مسرتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔ چنانچہ قرآن وحدیث کو دیکھئے، ان کی تعلیمات ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی ہدایت سے بھری پڑی ہیں اور ان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾(۱)

''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو''

غرض ایک طرف سرمایہ دار کی آمدنی کی ناجائز مدات کو ختم کر کے اور دوسری طرف اس کے اخراجات میں اضافہ کر کے اسلام نے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کی دنیا میں یہ ساری باتیں نرا ''نظریہ'' ہو کر رہ گئی ہیں، اور عملی طور سے معیشت کا یہ بے داغ اور صاف ستھرا نظام دنیا میں کہیں نافذ نہیں ہے، لیکن اگر اس نظام کے عملی نتائج دیکھنے ہوں تو تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کا مطالعہ کیجئے جب صدقہ دینے والا ہاتھ میں روپیہ لیکر نکلا کرتا تھا تو کوئی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

اب ہماری شومیٔ اعمال ہے کہ اتنا پرامن وسکون معاشی نظام رکھنے کے باوجود شروع میں تو ہم نے اپنی معیشت کا نظام سرمایہ داری کے اصولوں پر بنایا، اب جب کہ اس کے نقصانات سامنے

(۱) البقرۃ:۲۱۹

آ رہے ہیں تو ہم میں سے بعض لوگوں نے ''اشتراکیت'' اور ''سوشلزم'' کی آوازیں بلند کرنی شروع کردی ہیں پہلے سرمایہ داری کی بدترین لعنتوں اور سود اور قمار وغیرہ کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں قرآن وسنت کی تحریف کی جاتی تھی، اب سوشلزم کو ''اسلامی'' بنانے کے لئے آیات واحادیث کی الٹی سیدھی تاویلیں کی جارہی ہیں اور ذہن اگر نہیں چلتا تو اس طرح کہ مغربی افکار کی غلامی کو ایک مرتبہ دل سے نکال کر سیدھے سچے طریقے سے اسلامی اصولوں پر غور کرلیا جائے کہ وہ موجودہ معاشی مشکلات کا واقعی طور سے کیا حل پیش کرتے ہیں۔

جو حضرات غلط فہمی سے سرمایہ داری یا اشتراکیت کو اپنے لئے راہ نجات سمجھ بیٹھے ہیں ہم نہایت دردمندی کے ساتھ ان سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ کسی غیر اسلامی نظام میں اسلام کا پیوند لگانے کے بجائے ٹھنڈے دل ودماغ سے معقولیت کے ساتھ اسلامی احکام کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک آزاد اسلامی مملکت میں مسلمانوں کا حقیقی منصب یہ ہے کہ وہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوانے کے بجائے نہ صرف خود اسلام کا عملی نمونہ بنے بلکہ دنیا بھر کو دعوت دے کہ تم افراط وتفریط کی کسی بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہو، انسانیت کی فلاح کی منزل اس راستے پر چلے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی جو چودہ سو سال پہلے انسانیت کے محسن اعظم محمد مصطفیٰ ﷺ نے دکھایا تھا۔

بمصطفیٰ برساں خویش راہ کہ دیں ہمہ اوست
اگر باد نہ رسیدی تمام بولہبی است



امت مسلمہ کی معیشت اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد ☆

''اکیسویں صدی اور مسلم امہ'' کے موضوع پر ''مؤتمر العالم الإسلامی'' نے اسلام آباد میں ۲۳ ستمبر کو ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں شیخ الاسلام جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کو مذکورہ بالا موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی۔ موصوف نے اس موقع پر انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔

محترم چیئرمین اور معزز مہمانان گرامی!

یہ میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ایسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع مل رہا ہے جو مؤتمر العالم الاسلامی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک وقت میں منعقد کر رہی ہے، نئی صدی کا ظہور پورے عالم میں فکر وعمل کے نئے افق کھول رہا ہے، ہمارے لئے مسلم امہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اہم مسائل اور مشکلات پر غور کرنا، ان کے رخ متعین کرنا اور آنے والے وقتوں کے بین الاقوامی مسائل کے حل کرنے کے لئے اپنی حکمت عملی وضع کرنا ایک لائق تحسین عمل ہے، میں موتمر العالم الاسلامی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ایسا پروقار فورم (Forum) مہیا کیا جس میں، میں ان مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔

انیسویں صدی سیاسی استبداد کی صدی تھی، جس میں یورپی طاقت ور اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک بشمول اسلامی ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا، موجودہ صدی نے جواب اپنے آخری سانس لے رہی ہے مغربی استعمار کی طرف سے آزادی کے تدریجی عمل کا مشاہدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی وہ صدی تھی جس میں بہت سے اسلامی ممالک نے یا تو طاقت کے بل بوتے پر یا پرامن طریقوں سے آزادی حاصل کی، تاہم اپنی سیاسی آزادی کے حصول میں واضح کامیابی کے

☆ اصلاحی مواعظ (۳/۲۱۹ تا ۲۴۲)، یہ دراصل انگریزی زبان میں تھا جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے موتمر العالم الاسلامی کی دعوت پر اسلام آباد میں ۲۳ ستمبر ۱۹۹۷ء کو فرمایا، ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب نے اس مقالہ کا اردو میں ترجمہ کیا جو بیت العلوم، لاہور سے طبع ہوا۔

باوجود ہم اب تک علمی، معاشی اور منصوبہ سازی کے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ اب تک مسلم امہ سیاسی آزادی کے صحیح ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہو سکی۔

اب مسلم دنیا نئی صدی کو اس امید کے ساتھ دیکھ رہی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اس کے لئے مکمل اور حقیقی آزادی لے کر آئے گی، جس میں مسلمان دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں اور قرآن کریم اور حضور ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ امید صرف خوابوں اور خواہشات سے پوری نہیں ہو سکتی، اپنے اس محبوب مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے رویہ کو بدلنا ہوگا، اور جس قدر ہم نے سیاسی آزادی کے حصول کے لئے کوششیں کیں اس سے زیادہ ہمیں اپنی مکمل آزادی کے حصول کی کوششیں کرنی ہوں گی، ہمیں اپنے لائحہ عمل اور منصوبوں پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا، ہمیں خوب غور وفکر کے ساتھ مرتب کردہ پلاننگ اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہوگی، ہمیں اپنے متعین اور واضح مقاصد کے لئے اجتماعی قوت ارادی، انقلابی اقدامات اور ایک پرجوش پروگرام کی ضرورت ہوگی، اور اس طرح کے بین الاقوامی سیمیناروں سے اگر بھرپور فائدہ اٹھایا جائے تو اس مقصد کی طرف سنجیدہ فکر کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

جس موضوع کے بارے میں مجھ سے اس عظیم فورم میں چند الفاظ پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہ موضوع ''امت مسلمہ کی معیشت کا اسلامی خطوط پر اتحاد'' ہے، اس مختصر مضمون میں جو ایک مختصر نوٹس پر تیار کیا گیا ہے، احقر اپنے آپ کو ایسے دو نکات تک محدود رکھے گا جو ہمارے لئے امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

(۱) خودساختہ انحصار

یہ بات ہر کس وناکس جانتا ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کا سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسروں پر انحصار اس امت کا ایسا معاشی مسئلہ بن چکا ہے اور جس سے آج تمام مسلم امت دوچار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان ممالک، مغربی ممالک یا بین الاقوامی (بلکہ حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو مغربی) مالیاتی یا تمویلی اداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے رہے ہیں، اور بعض ممالک یہ بھاری مقدار میں سودی قرضے کسی ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لئے لے رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک امر یہ ہے کہ اپنے سابقہ سود کی

ادائیگی کے لئے حاصل کرر ہے ہیں، جس سے ان کے حاصل کردہ قرضوں کا سائز خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

بیرونی قرضوں پر انحصار ہماری ایک ایسی بنیادی بیماری ہے جس کی وجہ سے ہماری اقتصادی زندگی اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ قومی خوداعتمادی تقریباً مفقود ہوتی جارہی ہے، اور اس نے ہمیں اس بات پر مجبور کررکھا ہے کہ ہم اپنے قرض دہندوں کے مطالبات کے آگے بلکہ بعض اوقات ایسے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کردیں جو ہمارے اجتماعی مفادات کے خلاف ہیں، یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ قرض دہندہ قرضے دینے سے قبل مقروض پر اپنی شرائط عائد کردیتے ہیں، یہ شرائط ہمیں مستقل غیر ملکی دباؤ میں رکھتی ہیں اور اکثر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد کے حصول سے روکتی ہیں، اور اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اغیار کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، خلاصہ یہ کہ غیر ملکی قرضوں کے برے نتائج اتنے واضح ہیں کہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

قرضہ لینا اسلامی تعلیمات کی رو سے اس قدر ناپسند فعل ہے کہ اس میں شدید مجبوری اور سخت ضرورت کے بغیر مبتلا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے اس عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرمادیا جو اپنا قرض ادا کئے بغیر وفات پا گیا تھا۔(۱)

مزید برآں مسلمان فقہاء کرام نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا کسی مسلمان ملک کے حکمران کے لئے جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش کردہ تحفے قبول کرے؟

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ جب ان تحفوں کی وجہ سے امت مسلمہ کے مفاد کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ہو، یہ جواب تحفے قبول کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے، اب آپ اس سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرضے لینے کا جواب کیا ہوگا؟

اسلامی اصولوں کے مطابق بیان کردہ یہ ہدایات اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے سختی اور تنگی کے زمانہ میں بھی غیر ملکی قرضے لینے سے انکار کرنا چاہئے، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ موجودہ قرضے ہمارے وسائل (Resources) کی قلت کے باعث پیدا نہیں ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی جتنے مالدار آج ہیں اس سے قبل کی پوری تاریخ میں اتنے مال دار کبھی نہیں رہے، آج ان کے پاس قدرتی وسائل کے عظیم خزانے موجود ہیں، دنیا کے اہم دفاعی واقتصادی اہمیت

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب إن أحال دین المیت علی رجل جاز، رقم:۲۱۲۷، مسند أحمد، رقم:۱۳٦٤۳

کے حامل مقامات ان کے قبضے میں ہیں، وہ دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہیں، وہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایسی جغرافیائی زنجیر میں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سوائے اسرائیل اور ہندوستان کے کوئی ملک حائل نہیں ہے وہ دنیا کا تقریباً پچاس فیصد تیل پیدا کرتے ہیں، دنیا کی خام مال کی برآمدات میں تقریباً چالیس فیصد حصہ مسلمانوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ ان تمام حقائق کے علاوہ مسلمانوں کی وہ تمام نقد رقوم جو مغربی ممالک میں امانت یا سرمایہ کاری کی غرض سے رکھی گئی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر عائد تمام دیون (Loans) اور واجبات (Payables and dues) کی ادائیگی کے لئے مکمل کافی ہیں۔

اسلامی ترقیاتی بنک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسلامی ترقیاتی بنک (IDB) کے رکن ممالک کے بیرونی قرضہ جات کا مجموعہ 618.8 بلین ڈالر ہے، جب کہ دوسری طرف مسلمانوں کے مغربی ممالک میں رکھے ہوئے اثاثے اور امانتیں (Deposits) اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان اثاثوں اور امانتوں کا کوئی ٹھوس ریکارڈ نہیں ہے، کیونکہ ان کے مالکان متعدد وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر نہیں کرتے، البتہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ خلیج کی جنگ (Gulf War) کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنے 250 بلین ڈالر نکال کر اپنے ممالک میں جمع کرائے تھے، ان کے علاوہ مسلمانوں کے مغربی ممالک میں جمع شدہ اثاثوں اور امانتوں کا تخمینہ تقریباً 800 سے لے کر 1000 بلین ڈالر کے درمیان ہے۔ اس بات کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ہی جمع کردہ رقم کا ایک حصہ خود ہی زیادہ سودی قیمت پر قرض لے رہے ہیں۔

اور اگر بالفرض ان تخمینی اعداد وشمار کو مبالغہ آمیز سمجھا جائے تب بھی اس حقیقت سے شاید ہی کوئی منکر ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی رقموں کو اگر اپنے پاس ہی رکھ کر صحیح طریقے سے مسلمان دنیا پر استعمال کیا جاتا تو امت مسلمہ کبھی چھ سو بلین یا اس سے زائد قرضے لینے پر مجبور نہ ہوتی۔

اس زاویہ سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی قرضوں پر انحصار درحقیقت ہمارا خود ساختہ ہی ہے، جس کے بارے میں ہم کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتے، ہم نے کبھی بھی ان عوامل کو دور نہیں کیا جو ہمارے سرمائے کی باہر منتقلی کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اپنے آپ کو موجودہ ظالمانہ اور بدعنوان (Corrupt) نظام محصولات سے چھٹکارا نہیں دیا، ہم کبھی سرمایہ کاری کے لئے ایک پرامن فضا قائم کرنے کے قابل نہیں ہوئے، ہم نے کبھی اپنے ممالک کو ایک مضبوط سیاسی نظام عطا نہ کیا، ہم نے کبھی بھی اپنے مجموعی سرمایہ سے بہترین طریقوں سے استفادہ کرنے کے موقع پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، مزید برآں مجموعی

طور پر ہم اسلامی اتحاد کے جذبات کو سرگرم اور امت مسلمہ کی طاقت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے۔

یہ افسوس ناک صورت حال نئی صدی کی خوشی میں مہنگی تقاریب منعقد کر لینے سے ٹھیک نہیں ہوسکتی، ہمیں سنجیدگی کے ساتھ وقت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے ہمارے معاشی اور سیاسی قائدین کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلانے کے لئے ایسے ذرائع اور طریقے تلاش کرنے ہوں گے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے دستیاب ہیں، جس چیز کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم امہ کے باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے نئی پالیسیاں وضع کریں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (۱)

''تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے''

قرآن وسنت کی تعلیمات اور احکام اس اصول کی تاکید کرتے ہیں کہ تمام مسلم امہ کو یک جان ہوکر کام کرنا چاہئے، جغرافیائی حدود انہیں مختلف مقاصد اور مختلف اقوام کے اندر منقسم نہیں کرسکتیں، سیاسی وجغرافیائی حدود صرف کسی ملک کے انتظامی وداخلی امور نمٹانے کے لئے برداشت کی جاسکتی ہیں، لیکن تمام مسلم ممالک کو خصوصاً ان کے اپنے مشترک مقاصد کے لئے بقیہ دنیا کے مقابلے میں یک جان اور یک رخ ہوکر سوچنا چاہئے۔

اب وہ دن چلے گئے جب تکنیکی مہارت پر صرف چند مغربی ممالک کی اجارہ داری تھی، اب مسلمانوں کی مہارت وقابلیت (Talent) کم از کم مسلمانوں کی فوری ضروریات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس امت کی خدمت کے لئے مذہبی جذبہ کے ساتھ اس قابلیت کو تلاش کریں، لیکن یہ مقصد ہمارے ممالک کے قائدین اور زعماء کی متحدہ کوششوں کا طلب گار ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کا مقابلہ ان کے لئے نہ صرف امت کی بھلائی کی خاطر بلکہ خود اپنی بقاء اور حیات کے لئے ضروری ہے، اس بارے میں ایک عظیم ذمہ داری آرگنائزیشن آف اسلام کانفرنس (OIC) کے کاندھوں پر ہے، کہ اسے خود آگے بڑھ کر مسلمان قابلیت کا ایک متحدہ تالاب (Pool) بنانا ہے۔

---

(۱) الحجرات:۱۰

(۲) اپنے معاشی نظام کی تعمیر نو

دوسرا اہم نکتہ جس کی طرف احقر حاضرین مجلس کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے، وہ ہمارے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے۔

بیسویں صدی سوشلزم کا ظہور، سرمایہ دار اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان محاذ آرائی اور آخر میں سوشلزم کے سقوط کا مظاہرہ دیکھ چکی ہے، مغربی سرمایہ دار ممالک سوشلزم کے سقوط کی اس طرح خوشیاں منا رہے ہیں گویا یہ ان کی نہ صرف سیاسی بلکہ ان کے فکر ونظر کی فتح کا حقیقی ثبوت ہے، اسی طرح وہ کمیونسٹ تصورات کے سقوط کو بھی سرمایہ داری نظریہ کی حقانیت کا بیّن ثبوت قرار دے رہے ہیں، اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اب انسانیت کے لئے ایسا واحد نظام ہے جسے اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے ظالمانہ اصولوں اور خصوصاً دولت کی غیر مساوی تقسیم کے ردعمل کے طور پر ابھرا تھا جو گذشتہ کئی صدیوں سے سرمایہ دار ممالک میں نظر آرہی تھی۔ سوشلزم ان برائیوں کی نشاندہی کرنے اور معاشرے پر ان کے برے اثرات کی تنقید کرنے میں حق بجانب تھا، سوشلزم کی ناکامی کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام پر صحیح تنقید نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ خود اس کے پیش کردہ متبادل نظام کے اندر موجود خرابیاں تھیں، لہٰذا سوشلزم کی ناکامی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر کوئی خرابی نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ خرابیاں ابھی تک موجود ہیں اور ان کی اصلاح بھی نہیں کی گئی ہے، جو ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کررہے ہیں وہ ابھی تک دولت کی غیر مساوی تقسیم میں مبتلا ہیں، مالداروں اور غیر مالداروں کے درمیان عظیم فرق اور دولت کے عین درمیان غربت (Poverty in the midst of plenty) ان کے نظام معیشت میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، یہی سرمایہ دارانہ نظام کے حقیقی مسائل ہیں، جنہیں اگر صحیح طرح حل نہیں کیا گیا تو یہ ایک اور ردعمل کو جنم دے سکتے ہیں، جو سوشلزم سے کہیں زیادہ سخت اور ظالم ہوگا، سوویت یونین کے سقوط اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بعض وسط ایشیائی ریاستیں دوبارہ کمیونزم کی طرف رخ کررہی ہیں، یہ حقیقت اس پارلیمانی انتخابات کے نتائج سے اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے جس میں کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی اپنی پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت سے سیٹیں حاصل کی ہیں، یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کے پاس واقعتاً کوئی فضیلت یا اچھائی موجود ہے بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے برے نتائج اور غیر مساویانہ تقسیم

دولت کا دوبارہ ردعمل ہے۔

اسی لئے اب دنیا ایک ایسے تیسرے نظام کی شدید محتاج ہے جو اسے ان دونوں نظامہائے معیشت کی ان خرابیوں سے نجات دلائے، جن سے انسانیت گذشتہ چند صدیوں سے دوچار رہی ہے، اسی تیسرے نظام کے لئے مسلم امہ کی طرف سے اسلامی خطوط پر کام کیا جاسکتا ہے، وہ معاشی اصول جو قرآن پاک اور احادیث نبویہ ﷺ سے ماخوذ ہیں، آج کی دنیا کے تمام معاشی مسائل کو حل کرنے میں مکمل کافی وشافی ہیں، کیونکہ اسلام جہاں ذاتی ملکیت اور بازاری معیشت کی اجازت دیتا ہے وہاں وہ ایک منصفانہ تقسیم دولت کا ایک سوچا سمجھا نظریہ بھی پیش کرتا ہے، جو معاشی زندگی کی ناہمواریوں سے نجات بھی دلاتا ہے اور ایک ایسا نظام پیدا کرتا ہے جس میں ذاتی منافع کا محرک (Motive of personal profit) معاشرے کے مجموعی مفاد کے ساتھ شیر وشکر ہوکر چلتا ہے، سوشلزم کی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور غیر مساویانہ تقسیم سے مایوس لوگوں نے ذاتی ملکیت کے حقیقی تصور اور بازاری قوتوں پر حملہ کرکے ایک ایسے معاشی نظام کا مفروضہ پیش کیا جو بالکل غیر حقیقی، مصنوعی اور جابرانہ تھا، ذاتی ملکیت کی آزادی کے انکار نے پیداواری جذبہ کو نہ صرف ختم کردیا بلکہ وسیع ریاستی طاقت نے عوام کی قسمت حکمران طبقہ کے ہاتھوں میں دے دی۔

تجربات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ ذاتی ملکیت سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کی بنیادی وجہ تھی نہ بازار کی قوتیں، بلکہ سرمایہ دار ممالک میں معاشی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی بنیادی وجہ ذاتی منافع کے بے لگام استعمال اور جائز وناجائز کمائی کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار کا فقدان تھا، جس نے تمام دولت کو چند مالدار لوگوں تک محدود کردیا، سود، قمار، جوئے اور غیر اخلاقی خواہشات کی تکمیل جیسے طریقوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی سرمایہ دارانہ نظام میں اجازت دی گئی، جس نے مارکیٹ میں اجارہ داری (Monopoly) کا رجحان پیدا کردیا، جس کے نتیجہ میں طلب اور رسد کی طاقتیں یا تو بالکل مفلوج ہوکر رہ گئیں یا ان کے عمل کو اپنے بھرپور اثر سے روک دیا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظریہ ایک طرف تو طلب اور رسد کو سرگرم کرنے کے لئے اصول عدم مداخلت (Laisez fair) کا اعلان کرتا ہے تو دوسری طرف مندرجہ بالا غلط ذرائع کاروبار کی اجازت دے کر ان کے قدرتی عمل میں مداخلت کرتا ہے، سرمایہ دار ایسی اجارہ داریاں (Monopolies) پیدا کرکے اپنے جابرانہ فیصلے عوام الناس کی کثرت پر مسلط کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے بازاری طاقتوں کو ان کا حقیقی کردار ادا کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ سود کا مستقل رجحان یہ

ہے کہ وہ مال دار صنعت کاروں کے مفاد کے لئے کام کرے، کیونکہ یہ صنعت کار ہی اس دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو غریب عوام بنکوں میں اپنی بچتوں کی صورت میں جمع کراتے ہیں اور جب انہیں عظیم فائدہ ہوتا ہے تو وہ عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کی مد میں قیمتوں میں اضافہ کر کے واپس وصول کر لیتے ہیں، مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مال دار لوگ کھاتہ داروں (Despositors) کی رقموں کو اپنے نفع کے لئے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت میں ان (Despositors) کو کچھ ادا نہیں کرتے، کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں وہ صارفین جیسے عوام الناس سے ان کی پیداواری قیمت میں اضافہ کر کے واپس وصول کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ''جوا'' ہزاروں لوگوں کی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور کمائے بغیر دولت کے حصول کی لالچ اور طمع کو بڑھانے کا ایک تباہ کن محرک ہے، ''سٹہ'' کے معاملات بھی فطری بازاری عمل کو متاثر کرنے اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ حلال اور حرام کا امتیاز نہ رکھنے والا نظام معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات سے لاپرواہ ہو کر ہر قسم کی تجارتی سرگرمیوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔

اسلام نہ صرف بازاری طاقتوں کو قبول کرتا ہے، بلکہ ان کو ایک ایسی میکانیت (Mechamism) مہیا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اجارہ داریوں کی رکاوٹوں کے بغیر اپنی طاقت کے ساتھ عمل جاری رکھتے ہیں، صحت مند پیداوار اور مساویانہ تقسیم کی فضا برقرار رکھنے کے لئے اسلام معاشی سرگرمیوں پر دو قسم کے کنٹرول عائد کرتا ہے۔

پہلی قسم کے کنٹرول سے اسلام نے تجارت اور کمائی کے عمل کو کچھ ایسے مخصوص اور پر وقار طریق ہائے کار کے ساتھ متعین کر دیا ہے جو بالکل وضاحت کے ساتھ حلال وحرام کے درمیان امتیاز کرتے ہیں، یہ طریقے اجارہ داریوں کو روکنے اور غلط اور غیر اخلاقی کمائی اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کے خلاف تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں، جدید اقتصادی ضروریات کے سیاق میں جہاں عام لوگوں کی بچتیں ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اسلامی طریق ہائے تمویل مثلاً سود کے بجائے مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال عوام کو ترقی کے پھل میں بلا واسطہ شریک اور حصہ دار بناتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک متوازن طریقے سے خوشحالی آتی ہے اور امیر وغریب کے درمیان فرق کم سے کم ہو جاتا ہے۔

دوسرے قسم کا کنٹرول زکوٰۃ وصدقات اور کچھ دوسری مالیاتی ذمہ داریاں عائد کرنے کے

ذریعہ عمل میں لایا گیا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی بھی دوبارہ ایسے لوگوں میں تقسیم کی جائے جو تجارت کے بھرپور مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اپنی ضروریات کے لئے نہیں کما سکتے، خلاصہ یہ کہ دولت کو مستقل گردش اور پھیلاؤ میں رکھنے کے لئے اور دولت کو محدود و مرکوز کرنے کے مواقع ختم کرنے کے لئے غلط اور ناجائز آمدنی کے راستے مسدود کر دیئے گئے، اور زکوٰۃ، صدقات اور وراثت کے ضابطے وضع کئے گئے۔

چونکہ موجودہ صدی میں دنیا سوشلزم کا زوال اور سقوط بھی دیکھ چکی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے زخم بھی ابھی تک مندمل نہیں کر پائی ہے، لہٰذا اب مسلمانوں کے لئے یہ بہترین موقعہ ہے کہ دنیا کو قرآن وسنت سے مستنبط اصول واحکام کی طرف دعوت دے، جو دو انتہاؤں کے درمیان ایک پرامن اعتدال فراہم کرتے ہیں، لیکن ہمارے لئے ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام کے اصول ابھی تک صرف نظریاتی ہیں، جو ابھی تک عملی شکل میں ہمارے سامنے نافذ نہیں، یہاں تک کہ مسلمان ممالک بھی ابھی تک اپنی معیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی ہے، ان میں سے اکثر اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں اور وہ بھی ایسے ناپختہ اور ادھورے طریقوں پر جن کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے اور بدقسمتی سے واضح اسلامی اصولوں کی موجودگی کے باوجود مسلمان ممالک میں معاشی ناہمواری اور عدم مساوات مغربی ممالک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ افسوس ناک صورت حال ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی، اگر ہم اپنے راستوں اور طریقہ کار کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو انقلاب اور ردعمل کی جانب فطری عمل اپنے راستے ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائے گا، اگر ہم ایسے انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشی نظام کو قرآن وسنت سے مستنبط اور ماخوذ واضح معاشی نظام پر از سرنو استوار کرنا پڑے گا، اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو گئے تو نئی صدی کی آمد کے موقع پر یہ ہماری طرف سے انسانی برادری کے لئے ایک بہترین اور عظیم تحفہ ہوگا، مجھے امید ہے کہ اگر ہم اسلامی معیشت کے اصولوں کو اخلاص کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نافذ کر دیں تو آج ہم بقیہ دنیا کو بھی پہلے کی بہ نسبت اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ پائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائیں اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ

اَمَّا بَعْدُ!

جناب صدر و معزز خواتین وحضرات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کی اس نشست کا موضوع اسلام اور جدید اقتصادی مسائل مقرر کیا گیا ہے اور اس پر گفتگو کے لئے مجھ ناکارہ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اس موضوع کے بنیادی خدوخال آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ موضوع درحقیقت بڑا طویل الذیل اور تفصیل طلب موضوع ہے جس کے لئے ایک گھنٹے کی وسعت نہایت ناکافی ہے بلکہ مجھے یہاں ''ناکافی'' کا لفظ بھی ناکافی معلوم ہو رہا ہے، اس لئے تمہید سے قطع نظر کر کے براہ راست اصل موضوع کی طرف آنا چاہتا ہوں کہ اس مختصر وقت میں اپنی بساط کے مطابق اس موضوع کے چند خدوخال آپ حضرات کی خدمت میں عرض کردوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع نہ صرف یہ کہ ایک گھنٹے کا موضوع نہیں ہے بلکہ ایک نشست کا موضوع بھی نہیں ہے اس پر بڑی طویل کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں، اور ایک مختصر سی نشست میں اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔

جدید اقتصادی مسائل اتنے زیادہ اور اتنے متنوع ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس پر بات کی جائے اور دوسرے مسائل کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی ایک مشکل آزمائش ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ جزوی اقتصادی مسائل پر گفتگو کی جائے میں اسلام کی اقتصادی اور معاشی تعلیمات کا بنیادی اور اصولی خاکہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ کم از کم اسلامی معیشت کے بنیادی تصورات ذہن نشین ہوجائیں، کیونکہ جتنے جزوی اقتصادی مسائل ہیں جن کی طرف مجھ سے پہلے ڈاکٹر اختر سعید صاحب نے اشارہ فرمایا ہے، وہ سارے کے سارے اقتصادی مسائل درحقیقت بنیادی تصورات پر مبنی ہوں گے اور ان کا جو حل بھی تلاش کیا جائے

☆ اصلاحی خطبات (۲۲/۳ تا ۴۷) ۵ جولائی ۱۹۹۲ء، دن گیارہ بجے، سیمینار ہال جامعہ کراچی، کراچی

گا وہ انہی بنیادی تصورات کے ڈھانچے میں تلاش کیا جائے گا۔لہٰذا سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے ذہن میں اسلامی معیشت کا تصور واضح ہو اور یہ بات معلوم ہو کہ اسلامی معیشت کس چیز کا نام ہے؟ اس کی کیا بنیادی خصوصیات ہیں؟ وہ کس طرح دوسری معیشتوں سے ممتاز ہے؟

جب تک یہ بات واضح نہ ہو اس وقت تک اقتصادی مسائل پر گفتگو یا بحث یا ان کا کوئی حل منطقی طور پر درست نہیں ہوگا اس لئے میں اس وقت مختصراً اسلامی معیشت کے بنیادی تصورات اور آج کی دنیا میں جاری معیشت کے نظام کے ساتھ اس کا تقابل اور موازنہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائیں اور اس مختصر وقت میں اس اہم موضوع کو صحیح طور پر بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اسلام ایک نظام زندگی

سب سے پہلی بات جو اسلامی معیشت کے حوالے سے یاد رکھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام درحقیقت ان ٹھیٹھ معنوں میں ایک ''معاشی نظام'' نہیں جن معنوں میں آج کل ''معاشی نظام'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جو اس کے معنی سمجھے جاتے ہیں بلکہ اسلام کو ایک معاشی نظام کی حیثیت میں متعارف کرنا یا اسلام کو ایک معاشی نظام سمجھنا درست نہیں جیسے کیپٹل ازم ہے یا سوشلزم ہے لہٰذا جب ہم اسلام کی معیشت کا نام لیتے ہیں یا اسلامی معیشت کے تصورات اور اس کی بنیادوں کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ قرآن کریم میں اور سنت رسول اللہ ﷺ میں معیشت کے اسی طرح کے نظریات ہوں گے، جو آدم سمتھ اور مارشل اور دوسرے ماہرین معاشیات کی کتابوں میں موجود ہیں کیونکہ اسلام اپنی ذات اور اصل میں معاشی نظام نہیں، بلکہ وہ ایک نظام زندگی ہے جس کا ایک چھوٹا سا شعبہ معیشت بھی ہے اس پر اسلام نے اہمیت ضرور دی ہے لیکن اس کو مقصد زندگی قرار نہیں دیا، اس لئے جب میں آگے آپ حضرات کی خدمت میں معیشت کی بات کروں گا تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن اور سنت میں اگر کوئی شخص اس طرح کے معاشی نظریات، ان اصطلاحوں اور ان تصورات کے تحت تلاش کرے گا، جن تصورات اور اصطلاحات کے ساتھ معیشت کی عام کتابوں میں ملتے ہیں تو اس طرح کے تصورات ان میں نہیں ملیں گے البتہ اسلام کے اندر وہ بنیادی تصورات انسان کو ملیں گے جن پر بنیاد رکھ کر ایک معیشت کی تعمیر کی جاسکتی ہے، اس لئے میں اپنی ذاتی گفتگو اور تحریروں میں بھی ''اسلام کا معاشی نظام'' کے بجائے ''اسلام کی معاشی تعلیمات'' کا لفظ استعمال کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں، اسلام کی ان معاشی تعلیمات کی روشنی میں معیشت کی کیا شکل ابھرتی ہے؟ اور کیا ڈھانچہ

سامنے آتا ہے؟ یہ سوال ایک معیشت کے طالب عالم کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

''معیشت'' زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ معیشت بے شک اسلامی تعلیمات کا ایک بہت اہم شعبہ ہے اور معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگر اسلامی فقہ کی کسی بھی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کے دو حصے معیشت سے متعلق ہوں گے آپ نے فقہ کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' کا نام ضرور سنا ہوگا اس کی چار جلدیں ہیں جس میں سے آخری دو جلدیں تمام تر معیشت کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ اس سے آپ اسلامی معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن یہ بات ہر وقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ دوسرے معاشی نظاموں کی طرح اسلام میں معیشت انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جتنی سکولر معیشتیں ہیں، ان میں معیشت کو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے، اور اس بنیاد پر تمام نظام کی تعمیر کی گئی ہے لیکن اسلام میں معیشت اہمیت ضرور رکھتی ہے لیکن وہ انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔

اصل منزل آخرت ہے

اسلام کی نظر میں بنیادی مسئلہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا جس کے اندر انسان آیا ہے یہ اس کی آخری منزل اور آخری مطمح نظر نہیں ہے، بلکہ یہ آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ایک مرحلہ ہے اور ایک عبوری دور ہے اس عبوری دور کو بھی یقیناً اچھی حالت میں گزارنا چاہئے لیکن یہ سمجھنا کہ میری ساری کوششوں، ساری توانائیوں اور ساری جدوجہد کا محور یہ دنیاوی زندگی کی معیشت ہو جائے یہ بات اسلام کے بنیادی مزاج سے میل کھانے والی نہیں۔

اسلام نے ایک طرف دنیا کو اس درجہ اہمیت دی کہ دنیاوی منافع کو قرآن کریم میں ''خیر'' اور اللہ کا ''فضل'' کہا گیا، اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(۱)

یعنی معیشت کو حلال طریقے سے حاصل کرنا یہ انسان کے فرائض کے بعد دوسرے درجہ کا اہم

(۱) كنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱٦/٤)، كشف الخفاء، رقم: ١٦٧١ (٤٦/٢)، سنن البيهقي، رقم: ١٢٠٣٠ (٢٤/٢)، الجامع الكبير للسيوطي، رقم: ٣٥ (١٤٠٨٥/١)، جامع الأحاديث، رقم: ١٣٩٣٧ (١٢٨/١٤)، مشكوة المصابيح، رقم: ٢٧٨١ (١٢٩/٢)، شعب الإيمان، رقم: ٨٧٤١ (٤٢١/٦)

فریضہ ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ اپنی تمام جدوجہد کا محور اس دنیا کو نہ بنانا، کیونکہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری ابدی زندگی آخرت کی شکل میں آنے والی ہے، اس کی بہبود درحقیقت انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔

دنیا کی بہترین مثال

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے اس نقطہ نظر کو ایک خوبصورت مثال کے ذریعہ واضح فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

دنیا کی مثال پانی جیسی ہے اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے، جس طرح کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی اسی طرح انسان دنیا اور اس کے ساز وسامان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن یہ پانی کشتی کے لئے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک وہ کشتی کے چاروں طرف اور اردگرد ہو، لیکن اگر یہ پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو اس وقت وہ پانی کشتی کو سہارا دینے کے بجائے اسے ڈبو دے گا۔ اسی طرح دنیا کے یہ سارے ساز وسامان انسان کے لئے بڑے فائدہ مند ہیں اور اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں گزر سکتی، لیکن یہ اس وقت تک فائدہ مند ہیں جب تک یہ دل کی کشتی کے چاروں طرف اور اردگرد رہیں لیکن اگر یہ ساز وسامان انسان کی دل کی کشتی میں سوار ہوجائیں تو پھر وہ انسان کو ڈبود یں گے اور ہلاک کردیں گے۔

اسلام کا معیشت کے بارے میں یہی نقطہ نظر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معیشت فضول چیز ہے اس لئے کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ معیشت بڑی کارآمد چیز ہے، بشرطیکہ اس کو اس کی حدود میں استعمال کیا جائے، اور اس کو اپنا بنیادی مطمح اور آخری مقصد زندگی قرار نہ دیا جائے۔

ان دو بنیادی نکتوں کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ اور ان بنیادی معاشی مسائل کو موجودہ معاشی نظاموں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت نے کس طرح حل کیا ہے؟ اور پھر تیسرے نمبر پر یہ کہ اسلام نے ان کو کس طرح حل کیا ہے؟

''معیشت'' کا مفہوم

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ معاشیات کا ایک مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل چار ہیں ان چار مسائل کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم جس چیز کو اکنامکس (Economics) کہتے ہیں اور عربی میں جس کا ترجمہ ''اقتصاد'' سے کیا جاتا ہے اگر ڈکشنری میں اس کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو ''اکنامکس'' کے معنی یہ ملیں گے کہ انسان اپنی ضرورت کو کفایت کے ساتھ پورا کرلے، اکنامکس کے اندر بھی کفایت کا تصور موجود ہے، ورعربی میں اس کا جو ترجمہ ''اقتصاد'' سے کیا جاتا ہے اس میں بھی کفایت کا تصور موجود ہے، لہٰذا اکنامکس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات، بلکہ خواہشات غیر متناہی ہیں، اور ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل کم اور محدود ہیں اگر وسائل بھی اتنے ہی ہوتے جتنی ضروریات اور خواہشات ہیں تو پھر کسی علم معاشیات کی ضرورت نہ ہوتی، علم معاشیات کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات زیادہ ہیں اور اس کے مقابلے میں وسائل کم ہیں تو اب اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ کس طرح ان دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کی جائے؟ جس کے ذریعہ کفایت کے ساتھ اپنی ضروریات اور خواہشات پوری ہوسکیں، اور یہی درحقیقت علم معاشیات کا موضوع ہے اور اس نقطہ نظر سے کسی معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ چار بنیادی مسائل ہیں:

(۱) ''ترجیحات کا تعین'' (Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ جس کو معیشت کی اصطلاح میں ''ترجیحات کا تعین'' کہا جاتا ہے، یعنی ایک انسان کے پاس وسائل تو تھوڑے سے ہیں اور ضروریات اور خواہشات بہت زیادہ ہیں اب کون سی خواہش کو مقدم کرے اور کون سی خواہش کو موخر کرے، یہ معاشیات کا سب سے پہلا مسئلہ ہے، مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں اب ان پچاس روپے سے میں خوراک کے لئے بازار سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں اور اس پچاس روپے سے کپڑا بھی خرید سکتا ہوں، اور کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے میں بھی خرچ کرسکتا ہوں، اور ان پچاس روپے سے کوئی فلم بھی دیکھ سکتا ہوں اب یہ چار پانچ ضرورتیں میرے سامنے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ان چار پانچ اختیارات میں سے کس کو ترجیح دوں؟ اور وہ پچاس روپے کس طرح استعمال کروں؟ اس مسئلہ کا نام ''ترجیحات کا تعین'' ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پیش آتا ہے اسی طرح پورے ملک، پوری ریاست اور پوری معیشت کو بھی پیش آتا ہے، مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں کچھ انسانی وسائل ہیں کچھ معدنی وسائل ہیں کچھ نقدی وسائل ہیں یہ سارے وسائل محدود ہیں، اور ہماری ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں، اب جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں ان کے ذریعہ ہم کھیت میں گندم بھی اگا سکتے ہیں، چاول بھی اگا سکتے ہیں، اور تمباکو بھی اگا سکتے ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سارے وسائل عیاشی پر خرچ کردیں، یہ مختلف اختیارات (Options) ہمارے سامنے موجود ہیں تو کسی معیشت کا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کس طرح کریں؟ اور کس کام کو فوقیت دی جائے؟

(۲) ’’وسائل کی تخصیص‘‘

دوسرا مسئلہ جسے معاشیات کی اصطلاح میں ’’وسائل کی تخصیص‘‘ (Allocation of Resources) کہا جاتا ہے، یعنی جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں ان کو کس کام میں کس مقدار میں لگایا جائے؟ مثلاً ہمارے پاس زمینیں بھی ہیں اور ہمارے پاس کارخانے بھی ہیں، ہمارے پاس انسانی وسائل بھی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کتنی زمین پر گندم اگائیں؟ اور کتنی زمین پر روئی اگائیں؟ کتنی زمین پر چاول اگائیں؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں ’’وسائل کی تخصیص‘‘ کہا جاتا ہے، کہ کون سے وسیلے کو کس کام کے لئے اور کس مقدار میں مخصوص کیا جائے؟

(۳) آمدنی کی تقسیم

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب پیداوار (Production) شروع ہو تو اس پیداوار کو کس طرح معاشرے اور سوسائٹی میں تقسیم کیا جائے؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں ’’تقسیم آمدنی‘‘ (Distribution of Income) کہا جاتا ہے۔

(۴) ترقی

چوتھا مسئلہ جس کو معیشت کی اصطلاح ’’ترقی‘‘ (Development) کہا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہماری جو معاشی سرگرمیاں ہیں ان کو کس طرح ترقی دی جائے؟ تا کہ جو پیداوار حاصل ہورہی ہے وہ معیار کے اعتبار سے اور زیادہ اچھی ہوجائے اور مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہوجائے؟ اور اس میں ترقی ہو اور نئی مصنوعات وجود میں آئیں تا کہ مزید اسباب معیشت لوگوں کے سامنے آئیں۔

یہ چار اسباب ہوتے ہیں جن کا ہر معیشت کو سامنا کرنا پڑتا ہے، ان چار مسائل کے تعین کے بعد ایک نظر اس پر ڈالنی ہوگی کہ موجودہ رائج الوقت معیشت کے نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟ پھر یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اسلام ان مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے کیونکہ عربی کا یہ مصرعہ آپ نے سنا ہوگا کہ:

"وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ"

جب تک کسی چیز کی ضد سامنے نہ آئے اس وقت تک کسی چیز کے حقیقی محاسن سامنے نہیں آتے، اگر رات کا اندھیرا نہ ہوتو دن کی روشنی کی قدر نہ ہوتی، اگر حبس اور گرمی نہ ہوتو بارش کا رحمت ہونا معلوم نہ ہوتا، اس لئے مختصراً پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ رائج الوقت معاشی نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام میں ان کا حل

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کو لیا جاتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام نے ان چار مسائل کو حل کرنے کے لئے جو فلسفہ پیش کیا وہ یہ ہے کہ ان چار مسائل کو حل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، ایک ہی جادو کی چھڑی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دو اور پھر جب ہر شخص اپنا منافع کمانے کی فکر کرے گا اور آزاد جدوجہد کرے گا تو اس وقت یہ چاروں مسائل خود بخود (Automatically) حل ہوتے چلے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ یہ چار مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت اس کائنات میں قدرتی قوانین کارفرما ہیں، جن کو رسد اور طلب (Supply and Demand) کے قوانین کہا جاتا ہے، معاشیات کے طالب علم کے علاوہ ہر آدمی بھی ان قوانین کے بارے میں اتنا جانتا ہے کہ جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور اگر طلب رسد کے مقابلے میں کم ہوجائے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ بازار میں آم موجود ہیں اور آم کے خریدار اور شوقین زیادہ ہیں، اس کے مقابلے میں اس کی سپلائی کم ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بازار میں آم کی قیمت بڑھ جائے گی، لیکن اگر وہ آم ایسے علاقے میں پہنچا دیئے جائیں جہاں لوگ آم کھانا پسند نہیں کرتے اور ان کے اندر آم کھانے کی طلب اور رغبت نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آم کی قیمت گھٹ جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ طلب کے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے اور طلب کے گھٹنے سے قیمت گھٹتی ہے، یہ ایک عام

اصول اور قانون ہے جسے ہر انسان جانتا ہے۔

سرمایہ دارانہ (Capitalism) نظریہ کہتا ہے کہ یہی قانون جو درحقیقت اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کس مقدار میں پیدا کی جائے اور کس طرح وسائل کی تخصیص کی جائے ان سب چیزوں کا تعین درحقیقت طلب اور رسد کے قانون سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو اب ہر شخص اپنے منافع کے خاطر وہی چیز پیدا کرنے کی کوشش کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب زیادہ ہے۔

میں آج اگر ایک کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں تو پہلے یہ معلوم کروں گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے، تاکہ جب وہ چیز میں مارکیٹ میں لاؤں تو اس کو زیادہ قیمت میں فروخت کر کے اپنا منافع کما سکوں۔

لہٰذا لوگ جب اپنے منافع کے محرک کے تحت کام کریں گے تو وہی چیز بازار میں لائیں گے جس کی طلب زیادہ ہوگی، اور جب بازار میں اس چیز کی طلب کم ہو جائے گی تو لوگ اس پیداوار کو بازار میں مزید لانے سے اس لئے رک جائیں گے کہ مزید لانے کی صورت میں اس کی قیمت گھٹے گی اور قیمت گھٹنے سے ان کا نقصان ہوگا۔ یا کم از کم اس کے منافع پورے نہیں کما سکیں گے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ طلب و رسد کے قوانین مارکیٹ میں اس طرح جاری ہیں کہ اس کے ذریعہ ترجیحات کا تعین بھی خود بخود ہو جاتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کتنی مقدار میں پیدا کی جائے اور وسائل کی تخصیص بھی اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان اپنی زمین اور اپنے کارخانے کو اس چیز کے پیدا کرنے میں استعمال کریں گے، جس کی طلب ملک میں زیادہ ہے تاکہ اس سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں، لہٰذا منافع کے حصول کے محرک کے ذریعہ ان چاروں مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد رسد اور طلب کے بنیادی قوانین ہوتے ہیں، اور اس سسٹم کو پرائز میکنزم (Price Mechanism) کہا جاتا ہے، اور اسی پرائز میکنزم کے تحت یہ سارے وسائل انجام پاتے ہیں۔

اسی طرح آمدنی کی تقسیم کا نظام ہے، اس کے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ یہ ہے کہ رسد اور طلب کے قوانین ہی کے تحت آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے، مثلاً ایک کارخانہ دار نے ایک کارخانہ لگایا اور اس میں ایک مزدور کو کام پر لگایا، اب سوال یہ ہے کہ کارخانے سے ہونے والی آمدنی کا کتنا حصہ مزدور وصول کرے اور کتنا کارخانے دار حاصل کرے؟ اس کا تعین بھی درحقیقت رسد اور طلب کے قوانین کے تحت ہوگا، یعنی مزدور کی طلب جتنی زیادہ ہوگی اس کی اجرت بھی اتنی زیادہ ہوگی اور جتنی اس کی طلب کم ہوگی اس کی اجرت بھی کم ہو جائے گی۔ تو اسی اصول پر آمدنی کی تقسیم ہوگی۔

آخری مسئلہ یعنی ترقی (Development) کا مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوگا کہ جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی فکر میں ہے تو اب وہ منافع کے حصول کے لئے نت نئی ایجادات سامنے لائے گا، اور ایسی چیزیں پیدا کرے گا جس کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف راغب کر سکے۔

لہٰذا جب ہر شخص کو کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے ذریعہ چاروں مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، انہی کے ذریعہ ترجیحات کا تعین ہوتا ہے، انہی کے ذریعہ وسائل کی تقسیم ہوتی ہے انہی کے ذریعہ آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے اور انہی کے ذریعہ معاشی ترقی عمل میں آتی ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظریہ ہے۔

اشتراکیت میں ان کا حل

جب اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے یہ کہا کہ جناب! آپ نے معیشت کے سارے اہم اور بنیادی مسائل کو بازار کی اندھی اور بہری قوتوں کے حوالے کر دیا ہے، اس لئے کہ رسد اور طلب کی قوتیں اندھی بہری قوتیں ہیں اور یہ جو آپ نے کہا کہ انسان وہی چیز پیدا کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب ہے، اور اس وقت تک پیدا کرے گا جب تک طلب ہوگی، یہ بات نظریاتی طور پر تو چاہے درست ہو لیکن عملی میدان میں جب انسان قدم اٹھاتا ہے تو اس کو اس بات کا علم بہت مدت کے بعد ہوتا ہے کہ اس چیز کی طلب کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی، ایک مدت ایسی آتی ہے جس میں طلب حقیقتاً گھٹی ہوئی ہوتی ہے لیکن پیدا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ طلب بڑھی ہوئی ہے، اس لئے وہ پیداوار میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بالآخر کساد بازاری پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر کساد بازاری کے مہلک نتائج معیشت کو بھگتنے پڑتے ہیں، لہٰذا ان مسائل کو ان اندھی بہری قوتوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ایک جادو کی چھڑی پیش کی تھی، اور اشتراکیت نے دوسری جادو کی چھڑی پیش کر دی کہ ان چاروں مسائل کا ایک ہی حل ہے، وہ یہ کہ سارے وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں رکھنے کے بجائے اجتماعی ملکیت میں لائے جائیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ سارے وسائل پیداوار حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور پھر حکومت ان وسائل کی منصوبہ بندی کرے گی کہ کتنی زمین پر گندم پیدا کی جائے، کتنی زمین پر چاول پیدا کیا جائے، کتنی زمین پر روئی پیدا کی جائے، کتنے کارخانوں میں کپڑا بنے گا، اور کتنے کارخانوں میں جوتے بنیں گے، یہ ساری پلاننگ حکومت

کرے گی، اور جو انسان زمین یا کارخانے میں کام کریں گے ان کی بحیثیت محنت کار کے اجرت مہیا کی جائے گی اور اس اجرت کی مقدار بھی پلاننگ کے ذریعے طے کی جائے گی، لہٰذا ترجیحات کا تعین بھی حکومت کرے گی، وسائل کی تخصیص بھی حکومت کرے گی آمدنی کی تقسیم بھی حکومت کرے گی اور ترقی کی منصوبہ بندی بھی حکومت کرے گی۔

چونکہ اشتراکی معیشت میں یہ سارے کام حکومت اور منصوبہ بندی کے حوالے کئے گئے ہیں اس لئے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) بھی کہتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ معیشت نے چونکہ اپنے وسائل کو مارکیٹ کی رسد اور طلب کی قوتوں پر چھوڑ دیا ہے اس لئے اس کو ''بازاری معیشت'' (Market Economy) اور عدم مداخلت معیشت (Laisscz Faire Economy) بھی کہتے ہیں۔

یہ دو مختلف نظریات ہیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور دنیا میں رائج ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول جو اس کے فلسفے سے نکلتے ہیں، ان میں سے پہلا اصول ''انفرادی ملکیت'' (Private Ownership) ہے، یعنی تمام وسائل پیداوار کا ہر شخص انفرادی طور پر مالک بن سکتا ہے۔ دوسرا اصول ''حکومت کی عدم مداخلت'' (Laissez Faire Policy of State) ہے، یعنی انسان کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے، حکومت کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے، اور اس پر کوئی پابندی اور کوئی روک عائد نہ کی جائے۔ تیسرا اصول ''ذاتی منافع کا محرک'' ہے۔ کہ انسان کے اپنے ذاتی منافع کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیا جائے معاشی سرگرمیوں میں تیزی لانے کے لئے اس کی ترغیب دی جائے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول ہیں۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اس کے برخلاف اشتراکیت کے بنیادی اصول یہ ہے کہ وسائل کی پیداوار کی حد تک ''انفرادی ملکیت'' کی بالکلیہ نفی کی جائے، یعنی وسائل پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتے، یعنی نہ کوئی زمین کسی کی ذاتی ملکیت ہوسکتی ہے، اور نہ کارخانہ کسی کی ذاتی ملکیت ہوسکتا ہے۔ دوسرا اصول ہے ''منصوبہ بندی'' یعنی ہر کام پلاننگ اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے، یہ دو مختلف نظریات ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔

اشتراکیت کے نتائج

اس وقت دنیا میں ان دونوں نظاموں کے تجربات اور نتائج سامنے آ چکے ہیں، اور اشتراکیت کے نتائج آپ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کہ ۷۲ سال کے تجربے کے بعد پورے نظام کی عمارت زمین پر اس طرح گری کہ بڑے بڑے سورما بچھڑے ہوئے نظر آئے۔ حالانکہ ایک زمانے میں نیشنلائیزیشن ایک فیشن کے طور پر دنیا میں رائج تھا، اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف زبان کھولتا تو اس کو سرمایہ دار کا ایجنٹ اور رجعت پسند کہا جاتا تھا۔ لیکن آج خود روس کا سربراہ یہ کہہ رہا ہے کہ:

''کاش! یہ اشتراکیت کے نظریہ کا تجربہ روس کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے ملک میں کر لیا گیا ہوتا، تاکہ کم از کم ہم اس کی تباہ کاریوں سے بچ جاتے''

''اشتراکیت'' ایک غیر فطری نظام تھا

بہرحال! طبعی طور پر یہ ایک غیر فطری نظام تھا، اس لئے کہ دنیا میں بے شمار معاشرتی مسائل ہیں، صرف ایک معیشت ہی کا مسئلہ نہیں ہے اب اگر ان مسائل کو منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے بیٹھ جائیں تو یقین کیجئے کبھی حل نہیں ہو سکیں گے، آخر یہ بھی تو ایک معاشرتی مسئلہ ہے کہ ایک مرد کو ایک عورت سے شادی کرنی ہے اور شادی کے لئے مرد کو مناسب بیوی درکار ہے اور بیوی کو مناسب شوہر چاہئے، اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ شادی کا نظام لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں بڑی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، طلاقیں ہو رہی ہیں گھر اجڑ رہے ہیں اور دونوں کے درمیان ناچاقیاں پیدا ہو رہی ہیں لہٰذا اس نظام کو چلانے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس نظام کو حکومت کے حوالے کر دیا جائے، اور پلاننگ کے ذریعہ یہ طے کیا جائے کہ کون سا مرد کس عورت کے لئے زیادہ مناسب ہے، اور کون سی عورت کس مرد کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ پلاننگ کے ذریعہ اگر کوئی شخص اس مسئلے کو حل کرنا چاہے تو وہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہوگا، جس سے بہتر نتائج کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

یہی صورت حال اشتراکیت میں پیش آئی اس میں چونکہ یہ سارے مسائل پلاننگ اور منصوبہ بند کے حوالے کئے ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ پلاننگ کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرے گی اور حکومت کیا چیز ہے؟ وہ چند فرشتوں کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ بھی انسانوں ہی کے اندر سے وجود

میں آنے والے گروپ کا نام ہے، اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ دار دولت کے بہت بڑے وسائل پر قبضہ کر کے من مانی کرتا ہے، لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اشتراکیت کے نتیجے میں اگرچہ بہت سارے سرمایہ دار تو ختم ہوئے لیکن ایک بہت بڑا سرمایہ دار وجود میں آ گیا جس کا نام بیوروکریسی، افسر شاہی، اور نوکر شاہی ہے اور اب سارے وسائل پیداوار اور ساری معیشت اور بیروکریس (افسر شاہی) کے ہاتھ میں آ گئے، لہٰذا اب اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ناانصافی نہیں کریں گے وہ کون سے آسمان سے اترنے والے فرشتے ہیں، یا وہ کون سا معصومیت کا پروانہ اپنے ساتھ لائے ہیں؟ یقیناً اس نظام میں بھی خرابیاں ہوں گی اور وہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور آپ حضرات نے اس کو دیکھ لیا، اور یہ نظام اپنے انجام کو پہنچ گیا اور آج اس کا نام لینے والے بھی شرما شرما کر اس کا نام لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں

اب اشتراکیت کے فیل ہونے کے بعد آج سرمایہ دار مغربی ممالک بڑے زور وشور کے ساتھ بغلیں بجا رہے ہیں کہ چونکہ اب اشتراکیت فیل ہوگئی ہے لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہوگئی، اب انسان کے لئے سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ کوئی نظام کارآمد نہیں ہوسکتا اور اب یہ بات بالکل طے ہوچکی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کا جو بنیادی فلسفہ ہے وہ یہ کہ آزاد بازار کا وجود، اور لوگوں کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑنا اگرچہ نظریاتی طور پر ایک معقول فلسفہ ہے، لیکن جب اس فلسفے پر حد سے زیادہ عمل کیا گیا تو اس فلسفہ نے آگے چل کر خود اپنی جڑ کاٹ لی، یہ بات درست ہے کہ جب لوگوں کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد وطلب کی قوتیں برسر کار آئیں گی اور وہ ان مسائل کو حل کر دیں گی، لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ رسد وطلب کی یہ قوتیں اس وقت تک کارآمد ہوتی ہیں جب بازار میں مسابقت کی فضا ہو اور آزاد مقابلہ ہو اور اجارہ داری نہ ہو۔

مثلاً میں بازار سے ایک چھڑی خریدنا چاہتا ہوں اور بازار میں بہت سے لوگ چھڑی بیچنے والے موجود ہیں جو مختلف قیمتوں پر چھڑی بیچ رہے ہیں، ایک دوکاندار 500 روپے میں بیچ رہا ہے اور دوسرا دوکاندار 450 روپے کی بیچ رہا ہے، اب مجھے اختیار ہے کہ چاہے وہ چھڑی 500 روپے کی خریدوں یا 450 روپے کی خریدوں، اس صورت میں تو رسد اور طلب کی قوتیں صحیح طور پر کام کرتی ہیں اور ان کا صحیح عمل ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر بازار میں چھڑی بیچنے والا صرف ایک دوکاندار ہے اور میرے پاس کوئی چوائس اور انتخاب نہیں ہے اگر مجھے چھڑی خریدنی ہے تو اسی سے خریدنی ہوگی، تو اب وہ اپنی

من مانی قیمت میں چھڑی بیچے گا، اور اس کے اندر مجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا، اور اب رسد وطلب کی قوتیں یہاں ختم ہوگئیں، اس لئے اب تو صرف یک طرفہ قیمت کا تعین ہے، جو اس اجارہ دار نے مقرر کر دی اور مجھے کوئی اختیار نہیں رہا۔ لہٰذا یہ رسد اور طلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں آزاد مقابلہ ہو اور اگر اجارہ داری ہو تو وہاں یہ قوتیں کام نہیں دیتیں۔

پھر جب انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا کہ جو طریقہ تم اختیار کرنا چاہو اختیار کرلو، تو اس نے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے جس کے ذریعہ بازار میں اجارہ داری قائم ہوگئی اور دوسری طرف سرمایہ داری نظام میں انسان کو سود کے ذریعہ منافع کمانا بھی جائز، قمار کے ذریعہ منافع کمانا بھی جائز، سٹے کے ذریعہ نفع کمانا جائز، اور ان تمام طریقوں سے بھی نفع کمانا جائز ہے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ جو طریقہ چاہے اختیار کرے، انسان کو اس کی بالکل کھلی اجازت ہے اور اس کی کھلی چھوٹ کی وجہ سے بسا اوقات اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں رسد وطلب کی قوتیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں، جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ عملی طور پر وجود میں نہیں آتا۔

منافع کمانے کے لئے بالکل آزادی دینے کے نتیجے میں دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ کوئی اخلاقی قدر ایسی باقی نہیں رہی جو اس بات کا خیال کرے کہ معاشرے کو کون سی چیز مفید ہوگی، اور کون سی چیز مضر ہوگی، ابھی چند روز پہلے امریکی رسالے ٹائم میں میں نے پڑھا کہ ایک موڈل گرل مصنوعات کے اشتہار پر اپنی تصویر دینے کے لئے ایک دن میں 25 ملین ڈالر وصول کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ تاجر اور کارخانہ دار یہ 25 ملین ڈالر کہاں سے حاصل کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ غریب عوام سے وصول کرے گا، اس لئے کہ جب وہ چیز اور وہ پیداوار بازار میں آئے گی تو یہ 35 ملین ڈالر اس کی لاگت اور کوسٹ میں شامل ہو کر میری اور آپ کی جیب سے وصول کریں گے۔

یہ فائیو اسٹار ہوٹل جن میں ایک دن کا کرایہ 2500 روپے یا 3000 روپے ہے، ایک متوسط درجے کا آدمی ان ہوٹلوں کی طرف رخ کرتے ہوئے ڈرتا ہے، لیکن وہ تمام فائیو اسٹار ہوٹل ان غریب عوام کی آمدنیوں سے وجود میں آئے، کہ آپ یہ دیکھیں ان ہوٹلوں میں کون جا کر ٹھیرتا ہے؟ یا تو سرکاری ملازمین اور سرکاری افسران گورنمنٹ کے اخراجات پر ٹھیرے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان کا خرچہ گورنمنٹ ادا کرتی ہے اور گورنمنٹ کا مطلب ہے ٹیکس ادا کرنے والوں کا روپیہ اور یا پھر دوسرا طبقہ ان ہوٹلوں میں آکر ٹھیرتا ہے وہ تاجر، صنعتکار ہوتے ہیں، جو اپنے تجارت کے سفروں کے دوران ہوٹلوں میں ٹھیرتے ہیں۔ لیکن وہ ان ہوٹلوں کا خرچہ کہاں سے وصول کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ

سرمایہ دار اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتے بلکہ درحقیقت وہ اخراجات اس چیز کی لاگت (Cost) میں شامل ہوں گے جو چیز وہ بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ اور اس کی لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت میں اضافہ کریں گے، اور پھر وہ قیمت عوام سے وصول کی جائے گی۔

لہٰذا کوئی اخلاقی قدر اور کوئی اخلاقی پیمانہ اس بات کا موجود نہیں ہے کہ منافع کمانے کا کون سا طریقہ درست اور معاشرے کے لئے مفید ہے، اور کون سا طریقہ معاشرے کے لئے مضر اور مہلک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بداخلاقیاں، ناانصافیاں اور مظالم وجود میں آ رہے ہیں۔

اسلام کے معاشی احکام

اب میں اسلام کی معاشی تعلیمات کی طرف آتا ہوں تاکہ مندرجہ بالا پس منظر میں اس کو اچھی طرح سمجھا جا سکے، اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ فلسفہ کہ معاشی وسائل کا تصفیہ پلاننگ کے بجائے مارکیٹ کی قوتوں کے تحت ہونا چاہئے اس بنیادی فلسفہ کو اسلام تسلیم کرتا ہے قرآن کریم کہتا ہے:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضاً سُخْرِيّاً﴾(۱)

یعنی ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت عطا کیا ہے، اور اس کے بعد کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا:

﴿لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً﴾

تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام بنایا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معیشت تقسیم کی ہے، یعنی وسائل کی تقسیم اور قیمتوں کا تعین اور تقسیم دولت کے اصول یہ سارے کے سارے کسی انسانی پلاننگ کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس بازار اور اسی دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ معیشت خود بخود تقسیم ہو جائے۔

یہ جو فرمایا کہ ہم نے تقسیم کیا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آ کر خود دولت تقسیم فرما دی کہ اتنا تم لے لو اور اتنا تم لے لو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے فطرت کے ایسے قوانین بنا دیئے ہیں جن کی روشنی میں انسانوں کے درمیان معیشت کی تقسیم کا عمل خود بخود ہو جائے۔

اور ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اعلیٰ درجے کا معاشی اصول یہ بیان فرمایا:

(۱) الزخرف: ۳۲

((دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ))(۱)

''لوگوں کو آزاد چھوڑ دو، کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرماتے ہیں''

یعنی ان پر بلاوجہ پابندیاں نہ لگاؤ بلکہ آزاد چھوڑ و، اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا عجیب وغریب نظام بنایا ہے، مثلاً میرے دل میں اس وقت یہ خیال آیا کہ بازار جا کر ''پپیتہ'' خریدوں، اور بازار میں جو شخص پھل بیچنے والا ہے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ تم جا کر ''پپیتہ'' فروخت کرو، اور اب جب میں بازار گیا تو دیکھا کہ ایک شخص ''پپیتہ'' بیچ رہا ہے، اس کے پاس گیا اور اس سے بھاؤ تاؤ کر کے اس سے ''پپیتہ'' لے لی، اور اس کو پیسے دے دیئے، تو یہ مطلب اس حدیث کا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دو اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا فرماتے ہیں۔

بہرحال! یہ بنیادی اصول کہ مارکیٹ کی قوتیں ان بنیادی مسائل کا تعین کرتی ہیں یہ اصول تو اسلام کو تسلیم ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا یہ بنیادی امتیاز کہ معیشت کو مارکیٹ کی قوتوں پر بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسانوں کو منافع کمانے کے لئے اتنا آزاد نہ چھوڑو کہ ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی کو سلب کر لے، یعنی ایک کو اتنا آزاد چھوڑا کہ وہ اجارہ دار بن گیا اور بازار میں اس کی اجارہ داری قائم ہوگئی، اور اسکے نتیجے میں دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی، لہٰذا اسلام نے اس آزادی پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں وہ پابندیاں کیا ہیں؟ ان کو میں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ نمبر ایک، شرعی اور الٰہی پابندی، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی عائد کر دی ہے کہ تم اپنا منافع کماؤ، لیکن تمہیں فلاں کام نہیں کرنا، اس کو دینی پابندی بھی کہتے ہیں۔ دوسری قسم ہے ''اخلاقی پابندی'' تیسری قسم ''قانونی پابندی'' ہے۔

یہ تین قسم کی پابندیاں ہیں جو انسان پر شریعت نے عائد کی ہیں۔

(۱) دینی پابندی

پہلی قسم کی پابندی ''دینی پابندی'' ہے یہ بہت اہمیت کی حامل ہے، جو اسلام کو دوسرے معاشی نظریات سے ممتاز کرتی ہے، اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام اب اپنے بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اتنا نیچے آ گیا

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الحاضر للبادی، رقم: ۲۷۹۹، سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء لا یبیع حاضر لباد، رقم: ۱۱۴۴، سنن النسائی، کتاب البیع، باب بیع الحاضر للبادی، رقم: ۴۴۱۹، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب النهی ان یبیع حاضر لباد، رقم: ۲۱۶۷، مسند احمد، رقم: ۱۰۲۳۷

ہے کہ اب اس میں حکومت کی کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی ہے، لیکن حکومت کی یہ مداخلت ذاتی عقل اور سیکولر تصورات کی بنیاد پر ہوتی ہے، اور اسلام جو پابندی عائد کرتا ہے وہ "دینی پابندی" ہوتی ہے، وہ دینی پابندیاں کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم بازار میں منافع کماؤ لیکن تمہارے لئے سود کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں، اگر ایسا کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے، اسی طرح قمار کو ممنوع قرار دیدیا، "قمار" کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں اور احتکار ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیدیا۔ "سٹے" کو ممنوع قرار دیدیا، ویسے تو شریعت نے یہ کہہ دیا ہے کہ جب دو آدمی اگر کوئی معاملہ کرنے پر راضی ہو جائیں تو پھر وہ قانونی معاملہ ہو جاتا ہے، لیکن وہ دونوں اگر کسی ایسے معاملہ پر راضی ہو جائیں جو معاشرے کی تباہی کا سبب ہو، اس معاملے کی اجازت نہیں۔ مثلاً "سود" کے معاملے پر دو آدمی رضامندی سے معاملہ کرلیں تو چونکہ "سود" کے ذریعہ معاشی طور پر نقصانات پیدا ہوتے ہیں، تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے شرعاً اس کی اجازت نہیں۔ اب "سود" کے ذریعہ معاشی طور پر کیا تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ لیکن میں آپ کے سامنے ایک سادہ سی مثال پیش کرتا ہوں جس سے ان تباہ کاریوں کا ذرا سا اشارہ ہو جائیگا۔

سود کے نظریئے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایک شخص کی آمدنی یقینی اور دوسرے کی آمدنی خطرے میں ہے اور غیر یقینی ہے، مثلاً ایک شخص نے کسی سے سود پر قرض لیا، تو اب اس نے جس سے قرض لیا اس کو تو ایک متعین رقم بطور سود کے ضرور ادا کرنی ہے۔ اور جس نے قرض لیا ہے وہ اس قرض کی رقم سے جب کاروبار کرے گا تو ہوسکتا ہے اس کو کاروبار میں نفع ہو، اور ہوسکتا ہے کہ اس کو کاروبار میں نقصان ہو جائے۔ دونوں باتیں ہوسکتی ہیں اور اب جس صورت میں قرض لینے والا نقصان میں رہا، اس صورت میں بھی ۱۶ فیصد قرض دینے والے بینک یا ادارے کو ادا کرنا اس کے ذمہ ضروری اور لازم ہے، لہٰذا قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس قرض دینے والا نقصان میں ہوتا ہے اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے بینک سے سود پر دس کروڑ روپیہ قرض لیا اور اس سے کاروبار شروع کیا بہت سی تجارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں سو فیصد بھی نفع ہوتا ہے، فرض کریں کہ اس شخص کو دس کروڑ پر پچاس فیصد نفع ہوا، اب وہ بینک کو صرف سود کی متعین شرح مثلاً 15% اس نفع میں سے بینک کو ادا کرے گا اور باقی پورا 35 فیصد خود اس کی جیب میں چلا گیا، اب یہ دیکھئے کہ جو اس نے تجارت کی وہ پیسہ کس کا تھا؟ وہ تو عوام کا تھا اور اس کے ذریعہ جو نفع کمایا اس کا 35% نفع صرف ایک شخص کی جیب

میں چلا گیا جس نے تجارت کی اور صرف 15% بینک کے پاس پہنچا اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ تھوڑا سا حصہ مثلاً دس فیصد تمام ڈپازیٹر کے درمیان تقسیم کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے پیسے سے جو 50% نفع ہوا تھا اس کا صرف دس فیصد عوام میں تقسیم ہوا اور 35% صرف ایک آدمی کی جیب میں چلا گیا اور عوام وہ دس فیصد لیکر بہت خوش ہے کہ ہم نے بینک میں سو روپے رکھوائے تھے اور اب سال بھر کے بعد ایک سو دس ہو گئے لیکن اس بچارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دس روپے پھر واپس اس سرمایہ دار تاجر کے پاس چلے جاتے ہیں، اس لئے کہ اس تاجر نے 15% بینک کو جو سود کی شکل میں دیا تھا وہ اس کو اپنی پروڈکشن کی لاگت میں شامل کرے گا اور لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت کا حصہ بن جائے گا اور وہ قیمت پھر عوام سے وصول کرے گا۔ لہٰذا ہر اعتبار سے وہ فائدے میں رہا پھر اس کو نقصان کا بھی خطرہ نہیں اور اگر بالفرض اس کو نقصان ہو بھی جائے تو اس کی تلافی کے لئے انشورنس کمپنیاں موجود ہیں وہ انشورنس کمپنیاں جس میں ان عوام کے پیسے رکھے ہیں جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک وہ انشورنس کی قسط (Premium) ادا نہ کرے۔ ان عوام کے پیسوں سے اس سرمایہ دار کے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے۔

بہر حال سودی نظام کے ظالمانہ طریقے کی طرف میں نے تھوڑا سا اشارہ کر دیا لہٰذا سود کے ذریعہ معیشت میں ناانصافی، ناہمواری پیدا ہونا لازمی ہے اس لئے شریعت نے اس کو منع کیا ہے۔

شرکت اور مضاربت کے فوائد

اب اگر یہی تجارت سود کے بجائے ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں بینک اور سرمایہ لینے والے کے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوگا کہ یہ بینک کو 15% ادا کرے گا، بلکہ یہ معاہدہ ہوگا کہ یہ سرمایہ لینے والا جو کچھ نفع کمائے گا اس کا آدھا مثلاً بینک کو ادا کرے گا اور آدھا تجارت کرنے والے کا ہوگا، اب اگر پچاس فیصد نفع ہوا ہے تو پچیس فیصد بینک کو ملے گا اور پچیس فیصد اس کو ملے گا، اس طرح دولت کا رخ اوپر کے بجائے نیچے کی طرف ہوگا، اس لئے کہ بینک کے واسطے سے وہ پچیس فیصد ڈپازیٹر کو ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''سود'' کا برا اثر تقسیم دولت پر بھی پڑتا ہے اور اس کے نتائج معیشت کی پشت پر نظر آتے ہیں۔

قمار حرام ہے

اسی طرح اسلام نے ''قمار'' کو حرام قرار دیا ہے، ''قمار'' کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص نے تو اپنا

پیسہ لگا دیا اب دو صورتیں ہوں گی یا تو جو پیسہ اس نے لگایا وہ بھی ڈوب گیا، یا اپنے ساتھ بہت بڑی دولت لے آیا، اس کو ''قمار'' کہتے ہیں، اس کی بے شمار شکلیں ہیں عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اس مغربی نظام زندگی میں ''جوا'' (Gambling) کو بہت سے جگہوں پر قانون کے اندر ممنوع قرار دیا گیا ہے، لیکن جب (Gambling) مہذب شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ جائز ہوجاتی ہے اور خلاف قانون نہیں رہتی، مثلاً ایک غریب آدمی سڑک کے کنارے ''جوا'' کھیل رہا ہے تو پولیس اس کو پکڑ کر لے جائے گی لیکن اگر ''جوا'' کو مہذب شکل دیدی جائے اور اس کے لئے کوئی ادارہ قائم کر لیا جائے اور اس کا کوئی دوسرا نام رکھ دیا جائے تو اس کو جائز سمجھا جاتا ہے، اس قسم کا ''قمار'' ہمارے سرمایہ دارانہ معاشرے میں پھیلا ہوا ہے، جس کے نتیجے میں۔ بے شمار انسانوں سے پیسے جوڑ جوڑ کر ایک انسان پر اس کی بارش برسادی جاتی ہے، اس لئے یہ ''جوا'' شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح ''احتکار'' (Hoarding) یعنی ذخیرہ اندوزی شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، چونکہ ہر انسان اس کو جانتا ہے اس لئے اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح ''اکتناز'' یعنی انسان اپنا پیسہ اس طرح جوڑ جوڑ کر رکھے کہ اس پر جو شرعی فرائض ہیں ان کو ادا نہ کرے۔ مثلاً زکوۃ اور دیگر مالی حقوق ادا نہیں کرتا اس کو شریعت میں اکتناز کہتے ہیں اور شرعاً یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

اور سنئے حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) (۱)

''کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے''

یعنی دیہاتی اپنا مال دیہات سے شہر میں بیچنے کے لئے لا رہا ہے اس وقت میں کسی شہری کے لئے جائز نہیں کہ وہ جا کر اس سے کہے کہ میں تمہارا مال فروخت کردوں گا، بظاہر تو اس میں کوئی خرابی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب النهی للبائع ان لا یحفل الابل والبقر ...... الخ، رقم: ۲۰۰۶، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الخطبة علی خطبة اخیه ...... الخ، رقم: ۲۵۳۳، سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء لا یبیع حاضر لباد، رقم: ۱۱۴۳، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب النهی ان یخطب الرجل علی خطبة اخیه، رقم: ۳۱۸۷، سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی النهی ان یبیع حاضر لباد، رقم: ۲۹۸۳

نظر نہیں آتی، اس لئے کہ اس معاملے میں شہری بھی راضی اور دیہاتی بھی راضی، لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے اس سے منع فرمادیا، اس لئے کہ شہری جب دیہاتی کا مال اپنے قبضہ میں کرلے گا تو وہ اس مال کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک کہ بازار میں اس کی قیمت زیادہ نہ ہوجائے، اس لئے عام گرانی پیدا کرنے کا سبب بنے گا، اس کے برخلاف اگر دیہاتی خود اپنا مال شہر میں لاکر فروخت کرے گا تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنے نقصان پر تو فروخت نہیں کرے گا لیکن اس کی خواہش یہ ہوگی کہ جلدی سے اپنا مال فروخت کرکے واپس اپنے گھر چلا جاؤں، تو اس طرح حقیقی طلب اور حقیقی رسد کے ذریعہ قیمتوں کا تعین ہوجائے گا اور اگر درمیان میں (Middleman) آگیا تو اس کی وجہ سے رسد اور طلب کی قوتوں کو آزادنہ کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور اس (Middleman) کی وجہ سے قیمت بڑھ جائے گی۔

اس لئے وہ تمام ذرائع اور تمام راستے جن کے ذریعہ معاشرے کو گرانی کا شکار ہونا پڑے اور جن کے ذریعے معاشرے کو ناانصافی کا شکار ہونا پڑے ان پر شرعی اعتبار سے پابندی عائد کی گئی ہے۔ بہرحال یہ پابندیوں کی پہلی قسم ہے جو اس آزاد معیشت پر شرعاً عائد کی گئی ہے۔

(۲) اخلاقی پابندی

آزاد معیشت پر شرعاً دوسری پابندی جو عائد کی گئی ہے اس کو ''اخلاقی پابندی'' کہتے ہیں، اس لئے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو شرعاً حرام تو نہیں اور نہ ان کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، البتہ ان کی ترغیب ضروری ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اسلام ایک معاشی نظام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دین ہے اور ایک نظام زندگی ہے جس میں سے پہلے یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ انسان کا بنیادی مقصد آخرت کی بہبود ہے، لہٰذا اسلام یہ ترغیب دیتا ہے کہ اگر تم فلاں کام کروگے تو آخرت میں تمہیں بہت بڑا اجر ملے گا، اسلام ذاتی منافع کا محرک تو ہے لیکن وہ صرف دنیاوی منافع کمانے کی حد تک محدود نہیں، بلکہ ذاتی منافع میں آخرت کے منافع کو بھی لازماً شامل سمجھتا ہے، لہٰذا اسلام نے بہت سے احکام ہمیں اس بات کے دیئے ہیں کہ تمہیں دنیا میں اگرچہ نفع کچھ کم ملے لیکن آخرت میں اس کا نفع بہت ملے گا، مثلاً شرعاً یہ کہا گیا ہے کہ ہر وہ انسان جو اپنی معیشت کو کمانے کے لئے بازار میں نکلا ہے اگر یہ نیت کرے کہ وہ اس لئے بازار میں نکلا ہے کہ معاشرے کی فلاں ضرورت کو پورا کروں گا تو اس کی اس نیت کی وجہ سے اس کا یہ سارا عمل عبادت بن جائے گا اور باعث اجر ہوجائے گا، اور پھر اس نقطہ نظر سے انسان اس چیز کا انتخاب کرے گا جس کی معاشرے کو ضرورت ہوگی، اور حقیقت میں

معاشرے کو دینی اعتبار سے ضرورت ہونی چاہئے، مثلاً فرض کریں کہ لوگ اگر رقص وسرور کے زیادہ شائق ہیں تو اس صورت میں کیپٹل ازم کا تصور تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ منافع کمانے کے لئے ناچ گھر قائم کریں چونکہ طلب اس کی زیادہ ہے، لیکن اسلام کی اس دینی پابندی کے تحت اس کے لئے ناچ گھر قائم کرنا جائز نہیں، یا مثلاً ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں فلاں کارخانہ میں لگاؤں گا تو اس میں مجھے منافع تو بہت ہوگا، لیکن اس وقت چونکہ رہائشی ضرورت کے لئے لوگوں کو مکانات کی ضرورت ہے اور اس میں منافع تو زیادہ نہیں ہوگا، لیکن لوگوں کی ضرورت تو پوری ہوگی تو اس وقت شریعت کی اس اخلاقی پابندی پر عمل کرنے کی وجہ سے آخرت کے منافع کا حق دار ہوگا۔

(۳) قانونی پابندی

تیسری پابندی ''قانونی پابندی'' ہے یعنی اسلام نے اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیا ہے کہ جس مرحلے پر حکومت یہ محسوس کرے کہ معاشرے کو کسی خاص سمت پر ڈالنے کے لئے کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہے تو ایسے وقت میں حکومت کوئی حکم جاری کر سکتی ہے، اور پھر وہ حکم تمام انسانوں کے لئے قابل احترام ہے، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (۱)

''یعنی اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی بھی اطاعت کرو اور اولی الامر یعنی اہل ریاست کی بھی اطاعت کرو''

اسی لئے فقہاء کرام نے فرمایا کہ اگر حاکم وقت جو صحیح معنی میں اسلامی حکومت کا سربراہ ہو اگر کسی مصلحت کی بنیاد پر یہ حکم دیدے کہ فلاں دن تمام لوگ روزہ رکھیں تو اس دن روزہ رکھنا پوری رعایا پر عملاً واجب ہو جائے گا اور اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھے تو عملی طور پر اس کو ایسا ہی گناہ ہوگا جیسے رمضان کا روزہ چھوڑنے کا گناہ ہوتا ہے اس لئے کہ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے۔ (۲)

اسی طرح فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر اولی الامر یہ حکم جاری کردے کہ لوگوں کے لئے خربوزہ کھانا منع ہے تو اب رعایا کے لئے خربوزہ کھانا حرام ہو جائے گا، بہرحال اولی الامر کو ان چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ یہ احکام عام لوگوں کی مصلحت کے تحت جاری کرے، اب اس میں جزوی منصوبہ بندی بھی داخل ہے، مثلاً حکومت یہ کہہ دے کہ فلاں چیز میں لوگ سرمایہ کاری کریں اور فلاں چیز میں

---

(۱) النساء: ۵۹

(۲) فتاوی شامی (٤٦٣/٤)، روح المعانی (٦٦/٥)

سرمایہ کاری نہ کریں، تو حکومت حدودِ شرعیہ میں قانونی طور پر اس قسم کی پابندی عائد کر سکتی ہے۔

بہرحال کیپٹل ازم کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام میں یہ بنیادی امتیاز اور فرق ہے اور یاد رکھئے کہ جہاں تک قانونی پابندی کا تعلق ہے یہ پابندی کیپٹل ازم میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ پابندیاں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور اسلام میں اصل امتیاز دینی پابندیوں کا ہے جو "وحی" کے ذریعہ مستفاد ہوتی ہیں، اور جس میں اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے وہ یہ ہدایت کرتا ہے کہ فلاں چیز تمہارے لئے مضر ہے اور منع ہے۔ درحقیقت یہ چیز ایسی ہے کہ جب تک انسانیت اس راستے پر نہیں آئے گی اس وقت تک انسانیت افراط وتفریط کا شکار رہے گی۔

بیشک اشتراکیت میدان میں شکست کھا گئی، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جو خرابیاں تھیں یا اس کی جو ناانصافیاں اور ناہمواریاں تھیں کیا وہ ختم ہوگئیں؟ وہ یقیناً آج بھی اسی طرح برقرار ہیں اور ان کا حل اگر ہے تو وہ ان الٰہی پابندیوں میں ہے، اور ان الٰہی پابندیوں کی طرف آئے بغیر انسان کو سکون حاصل نہیں ہوسکتا، بس ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ابھی تک ان "الٰہی پابندیوں" پر مبنی معیشت کا کوئی عملی ڈھانچہ اور عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکے اور ہمارے ملک پاکستان کے سامنے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ ان معاشی تعلیمات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے دکھائے تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ حقیقت میں اسلامی معیشت کن بنیادی خصوصیات کی حامل ہے اور کس طرح ان کو اپنایا جا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے استحقاق سے زیادہ آپ حضرات کا وقت لے لیا اور اس بات کا بھی احساس ہے کہ ایک خشک موضوع کے اندر میں نے آپ کو مشغول رکھا اور میں آپ حضرات کے حسن سماعت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے صبر وضبط اور تحمل کے ساتھ اس گفتگو کو سنا، اللہ تعالیٰ اس کو میرے لئے بھی اور سننے والوں کے لئے بھی مفید بنائے اور اس کے بہتر نتائج پیدا کرے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتداء ☆

پچھلی چند صدیوں سے پہلے یورپ میں اور پھر بعد میں ایشائی ممالک میں بھی ایک خاص قسم کا معاشی اور سیاسی نظام جاری رہا ہے جس کو جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں۔

اس جاگیری نظام میں طرح طرح کے معاشی اور سیاسی مفاسد لوگوں کے سامنے آئے اس کی بنا پر جاگیردارانہ نظام بہت بدنام ہوا اور جاگیری نظام کے خلاف پورا علم بغاوت بلند ہوا اور زمین کی ملکیت کا سرے سے ہی انکار کر دیا۔

اس موقع پر اشتراکیت نے جاگیردارانہ نظام کو اور زیادہ بدنام کر دیا تھا، تو جب یہ ذکر آیا کہ اسلام میں عطاء جاگیر کی کوئی حیثیت ہے یا نہیں؟ تو لوگوں نے سوچا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام میں عطاء جاگیر کی کوئی گنجائش ہے تو یہ جاگیردارانہ نظام کی حمایت ہوگی اور اسلام کی طرف جاگیردارانہ نظام کی حمایت منسوب کرنا خود اسلام کو بدنام کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا انہوں نے دعوی کیا کہ اسلام میں جاگیردارانہ نظام کا کوئی تصور نہیں ہے اور عطاء جاگیر اسلام میں نہیں ہے۔

بعض لوگوں کی یہ ذہنیت ہے کہ جب کوئی نظریہ ایک دم بہت زور وشور کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ دیکھے بغیر کہ اسلام کی کیا تعلیمات ہیں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ نہیں جناب اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے۔ اور اس طرح اپنے ذہن اور خیال کے مطابق اسلام کی خدمت کرتے ہیں تا کہ اسلام کی بدنامی نہ ہو اور اس کے ماتھے پر داغ لگا ہوا ہے وہ دور کر دیا جائے، اس لئے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ عطائے جاگیر اسلام میں ہے ہی نہیں، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے ابھی آپ نے احادیث میں دیکھا کہ انصار کو جاگیر دینے کا ذکر ہے، اسی طرح بے شمار جاگیریں مختلف زمانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا فرمائی گئیں۔

مثلاً حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا بیت اللہ کا علاقہ دیدیا تھا، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو یمن کا بہت بڑا علاقہ بطور جاگیر عطا فرمایا تھا، حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑی جاگیر عطا کی، اور اسی طرح حضرات شیخین کو بھی عطا کی تھی، تو عطاء جاگیر کے بے شمار واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور خاص طور سے امام ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاحوال، امام

☆ انعام الباری (۷/ ۶۱ تا ۷۲)، زیرنظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتداء پر روشنی ڈالی ہے۔

یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الخراج، اور ابن آدم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الخراج میں عطاء جاگیر کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔(۱)

یورپ کے جاگیری نظام کی حقیقت

اصل بات یہ ہے کہ لوگ صرف جاگیر کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ گئے اور یہ نہیں سمجھا کہ وہ جاگیری نظام جو یورپ سے شروع ہوا تھا اور جس کے بے شمار مفاسد سامنے آئے اس میں اور اسلام کی عطائے جاگیر میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا یہ سمجھے بغیر انکار کر دیا کہ اسلام میں جاگیر کا کوئی تصور نہیں ہے۔

لہٰذا پہلے یہ سمجھئے کہ یورپ کا جاگیری نظام کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ جس شخص کو جاگیر دی جاتی تھی جاگیردار بنایا جاتا تھا اس کو زمین بطور ملکیت نہیں دی جاتی تھی کہ یہ تمہاری زمین ہے بلکہ عام طور پر جاگیردار سے یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ ایک مخصوص علاقے کے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سارے علاقے کی زمینوں کی لگان، خراج لینے کا آپ کو حق حاصل ہے، مثلاً یہ کہہ دیا کہ کراچی کے آس پاس جتنے دیہات ہیں ان پر جتنی زمینیں ہیں ان پر جو لوگ کاشت کاری کرتے ہیں ان سے حکومت کے بجائے آپ خراج وصول کریں اور اس خراج کی تعین بھی وہی کرتے تھے اور انہی کو یہ حق حاصل تھا کہ کون سی زمین سے کتنا خراج وصول کرنا ہے اور عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ یہ جاگیریں اس وقت اس کو دی جاتی تھیں جس نے حکومت کے لئے کوئی خدمات انجام دی ہوں، اس وقت بادشاہت کا دور تھا عموماً بادشاہ اپنے دوستوں اور بڑے بڑے فوجی افسروں کو یہ جاگیریں دیتے تھے، بادشاہ نے جس کو نواز دیا کہ اتنی جاگیر ہم نے تم کو دیدی ہے لہٰذا یہاں کے علاقے کا خراج تم وصول کرو، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی جاتی تھی کہ جب کبھی حکومت کو جنگ وغیرہ کے موقع پر لڑنے والوں کی ضرورت پیش آئے گی تو اپنی جاگیر کے علاقے میں سے آپ اتنے افراد حکومت کو جنگ کے لئے فراہم کریں گے۔ مثلاً کسی کو کہہ دیا کہ ہم نے تم کو اپنی جاگیر فراہم کی ہے لیکن جب ہمیں ضرورت پیش آئے گی تو دس ہزار آدمی یا پانچ ہزار آدمی تم لیکر آؤ گے، باقی جس طرح چاہو تم ان لوگوں سے خراج وصول کرو، جتنا چاہو وصول کرو اور جو تم وصول کرو گے وہ تمہاری ملکیت ہوگا۔

ہمارے ہاں یہ اصطلاحات مشہور تھیں یہ دس ہزاری جاگیردار ہے، یہ پانچ ہزاری جاگیردار ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ جو جنگ کے موقع پر دس ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ دس ہزاری جاگیردار ہے اور جو پانچ ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ پانچ ہزاری جاگیردار ہے۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ خراج کی

(۱) كتاب الخراج للقاضي ابي يوسف يعقوب بن ابراهيم، ص: ٦٢ تا ٧١

مقدار کے تعین کے حقوق بھی ان کو حاصل تھے تو بسا اوقات اپنے مفاد کی خاطر کاشتکاروں کے اوپر زیادہ خراج عائد کردیتے تھے اور چونکہ کاشتکار یہ سمجھتے تھے کہ خراج عائد کرنا ان لوگوں کا کام ہے اور اگر ہم نے ذرا سا بھی ان کے چشم ابرو کے خلاف کام کیا تو ہمارا خراج بڑھادیں گے اور خراج بڑھنے کے نتیجے میں ہمارے لئے زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا اور زندگی دوبھر ہوجائے گی۔ لہٰذا وہ ان کے ہر حکم کی اطاعت کرتے تھے اور وہ ان کے اوپر طرح طرح کے بیگار عائد کرتے تھے یہ کرو وہ کرو۔ اگر وہ نہ کریں تو یہ خراج بڑھا دیتے تھے، درحقیقت ان کی حیثیت غلاموں جیسی ہوگئی تھی اس واسطے ان کو اصطلاح میں رعیت کہا جاتا تھا، وہ بیچارے کاشتکار ان کا ہر حکم ماننے کے پابند ہوتے تھے اور یہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتے تھے کام لیتے اور ان سے خراج وصول کرتے۔

اس کا نقصان یہ ہوا کہ جب ان کے قبضے میں اتنی بڑی مخلوق آگئی جو ان کی رعیت ہے اور وہ غلاموں جیسی ہے تو گویا یہ ان کا لشکر ہے، اور ان کا بادشاہ سے وعدہ بھی ہوتا تھا کہ جنگ کے موقع پر ضرورت کے وقت بادشاہ کو دس ہزار آدمی فراہم کریں گے، تو اس طرح ایک آدمی دس ہزار کے لشکر کا مالک ہے، کوئی بیس ہزار کے لشکر کا مالک ہے تو ان کی حیثیت اپنے علاقے میں بادشاہ جیسی ہوتی تھی، جب بادشاہ جیسی حیثیت ہوگئی تو گویا اندرون ملک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں اور ان کی دفاعی اور سیاسی قوت بھی بہت زیادہ مضبوط ہوگئی، تو اب یہ چونکہ بڑے مستحکم اور مضبوط ہوگئے اور سیاسی اعتبار سے ان کا مرتبہ ہوگیا اب یہ بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھانے لگے کہ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تم سے بغاوت کردیں گے، اتنا لشکر ہمارے پاس موجود ہے اور بغاوت کرکے ہم اپنی الگ سلطنت بنالیں گے۔

لہٰذا یہ جاگیردار بادشاہ کے اوپر مسلط ہوگئے اور اگر آٹھ دس جاگیردار آپس میں مل جاتے تھے تو بادشاہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا، اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے اور ہر حکم ماننے پر مجبور ہوجاتا تھا وہ جو چاہتے بادشاہ سے منوا لیتے تھے تو بادشاہ گویا ان کا تابع ہوگیا۔ لہٰذا ان جاگیرداروں نے ایک طرف تو اپنے زیر جاگیر لوگوں کو رعیت اور غلام بنایا ہوا ہے اور دوسری طرف بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھارہے ہیں اور اس کے ساتھ من مانی کررہے ہیں اس سے اپنے مفادات اور مرضی کے خلاف فیصلے کرارہے ہیں تو یہ ہے یورپ کا وہ جاگیرداری نظام جو ایک عرصہ تک یورپ میں رہا۔

اور اس کے اثرات ہمارے ہندوستان اور پاکستان میں بھی آئے اور اس کا باقی ماندہ اثر بلوچستان میں سرداری نظام کی صورت میں ہے کہ جو سردار ہوتا ہے وہ ایک طرح سے (اللہ بچائے) اپنے زیر جاگیر لوگوں کے لئے خدا بنا بیٹھا ہے کہ ان سے خراج وصول کرتا ہے، آج بھی بلوچستان میں کاشتکار اپنی پیداوار کا چھٹا حصہ جاگیردار کو بطور خراج دیتا ہے جسے وہ ''ششک'' کہتے ہیں۔ اور تمام

لوگ جاگیر کے تحت ہیں وہ اس کے غلام ہیں اور سرداروں نے یہ کام کر رکھا ہے کہ ہمارے زیر جاگیر لوگ کسی طرح تعلیم حاصل نہ کر پائیں، کیونکہ انہوں نے اگر تعلیم حاصل کر لی تو یہ ہمارے مطیع اور ہمارے فرمانبردار نہیں رہیں گے، اس لئے ان کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہاں کوئی تعلیمی ادارہ نہ بنے اور کوئی سڑک نہ بنے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں تعلیم وتمدن آ جائے اور یہ دونوں چیزیں آنے کی صورت میں یہ اپنے آپ کو غلام سمجھنا چھوڑ دیں گے۔ یہ سارے فسادات اس سے پھیلے۔

یہ وہ جاگیرداری نظام تھا جس کے خلاف مزاحمت کا رویہ پیدا ہوا اور بالآخر یورپ میں ختم ہوا اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی ختم ہوا۔ اس کے خلاف بڑی نفرت پیدا ہوئی اور بعض جگہوں میں ابھی تک باقی ہے اور نفرت بھی باقی ہے۔

اسلام میں عطاء جاگیر کا مطلب

اس کے برخلاف اسلام میں عطاء جاگیر کا معنی یہ ہے کہ تین صورتوں میں کسی کو جاگیر دی جاسکتی ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ارض موات دیدی گئی یعنی بنجر زمین دی گئی اور کہا گیا کہ تم اس کو آباد کر کے اپنی ملکیت میں لے آؤ۔ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کریں، اگر اس نے تین سال کے اندر آباد کر لیا تب تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اگر وہ تین سال کے اندر اندر اس کو آباد نہ کر سکا تو جاگیر ختم، پھر وہ اس کو نہیں لے سکتا۔

آپ دیکھیں گے کہ اگر اس شرط پر کسی کو جاگیر دی جائے کہ تم اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کر لو تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بنجر زمینیں آباد ہوں گی اور ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ آدمی خود تنہا اس کو آباد نہیں کر سکتا، اس کو کچھ مزدور رکھنے پڑیں گے تو لوگوں کو روزگار ملے گا اور اگر تین سال میں یہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو جاگیر ختم واپس لیکر کسی اور کو دی جائے گی۔ تو اس میں مفاسد ہونے کا احتمال ہی نہیں۔

حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگیر عطا فرمائی، انہوں نے کچھ حصہ تو آباد کیا اور زیادہ تر حصہ آباد نہ کر سکے، لہٰذا بعد میں وہ جاگیر ان سے واپس لے لی گئی۔

بعض لوگ تحدید ملکیت والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگیر واپس لے لی تو وہ اس لئے واپس لی کہ انہوں نے تین سال تک انہیں آباد نہیں کیا اگر آباد کی ہوتی تو واپس نہ لیتے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی زمین جو سرکاری ملکیت ہے بطور حصہ دیدی جائے،

اسلام میں بنجر زمین سرکاری ملکیت نہیں ہوتی، سرکاری زمین وہ ہوتی ہے جس بنجر زمین کو سرکار نے آباد کیا، ان زمینوں میں سے کوئی زمین کسی کو بطور مالکانہ حقوق کے ساتھ دیدی جائے کہ ہم تمہیں یہ زمین مالکانہ حقوق کے ساتھ دیدیتے ہیں تم اس کو استعمال کرو اس میں یہ قید نہیں ہوتی کہ تین سال تک آباد نہ کی تو واپس لے لی جائے گی۔ لیکن اس قسم کی جاگیر صرف اراضی سلطانیہ میں ہوسکتی ہے جس کی مالک صرف حکومت ہو، لیکن ایسی اراضی سلطانیہ جو حکومت نے پہلے سے آباد کر کے اپنی ملکیت بنا رکھی ہیں ان کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ ان کو بڑے پیمانہ پر کسی کو بطور جاگیر دینا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ ملکیت جس زمین کو آباد کرتی ہے تو وہ اپنے کسی مقصد کے تحت کرتی ہے اور وہ زمین اس مقصد میں لگی ہوتی ہے تو ایسی اراضی جو حکومت نے آباد کی ہوں اور وہ حکومت کی ضرورت سے زائد ہوں، فالتو ہوں، ایسا بہت کم ہوتا ہے بلکہ اکثر نہیں ہوتا۔ اگر ہوں گی تو بہت کم ہوں گی اور اگر کسی کو دی جائے گی تو بہت تھوڑی سی زمین دی جائے گی اور اس میں بھی امام اس بات کا پابند ہے کہ مصلحت عامہ کو مدنظر رکھے یہ نہیں کہ کسی کو رشوت میں دیدی، یا کسی کو نواز دیا بلکہ جہاں واقعی کوئی شخص حاجت مند ہے اس کو دیں۔ غریب لوگوں کو یا کسی کی خدمات کے صلے میں دیں، ویسے ہی بغیر کسی مصلحت کے دے دینا امام کے لئے جائز نہیں۔ اور جو دے گا اس کی مقدار بھی کم ہوگی کیونکہ اراضی سلطانیہ کی مقدار کم ہوتی ہے، غلطی یہاں سے لگتی ہے کہ لوگ اراضی سلطانیہ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی غیر آباد زمین پڑی ہوئی ہے وہ حکومت کی ملکیت ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زمین کی ملکیت اور مالکانہ حقوق تو نہیں دیئے لیکن زمین کی منفعت دیدی کہ زمین تو سرکار کی ہے تم اس میں معین مدت تک کاشت کر کے پیسے حاصل کر سکتے ہو، یہ دوسری قسم سے بھی اضعف ہے، اس پر بھی وہ ساری حدود وقیود عائد ہیں جو دوسری قسم پر تھیں اور یہ کام بھی بڑے پیمانہ پر نہیں ہوسکتا اس کی تعداد بھی محدود رہے گی۔

اور چوتھی صورت جو یورپ وغیر میں تھی کہ خراج وصول کرنے کا مالک بنادیا، اسلام میں یہ جائز نہیں جب تک مقطع لہ یعنی جاگیردار مستحق زکوٰۃ نہ ہو، اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہے تب یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا، لیکن اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا کیونکہ عشر کا مصرف مستحقین زکوٰۃ اور فقراء ہیں۔

فرض کریں اگر کسی کو کہہ دیا کہ تم وہاں کا عشر وصول کرو اور وہ مستحق زکوٰۃ تھا، جونہی وہ عشر وصول کرنے کے بعد صاحب نصاب بنا، اگلے سال اس کو عشر وصول کرنے کا حق نہیں رہے گا تو یہ جاگیر چل ہی نہیں سکتی۔

پہلی تین قسمیں ہوسکتی ہیں ان میں سے دو قسمیں بڑی محدود ہیں، اگر زیادہ بڑے پیمانے پر

ہو سکتی ہے تو پہلی قسم ہے یعنی ارض موات۔ لہٰذا اسلام میں جو زیادہ تر زمین دی گئی وہ ارض موات ہی تھی اور اس میں اس بات کی پابندی تھی کہ تین سال کے اندر اندر خود آباد کریں۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ ارض موات کو یا آدمی خود کاشت کر کے آباد کرے یا مزدوری کے ذریعہ اجرت پر کرائے پر دے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر کسی ایسے شخص نے جس کو ارض موات دی گئی تھی اس نے خود کاشت کرنے یا اپنے مزدوروں سے کاشت کرانے کے بجائے وہ زمین مزارعت پر دیدی، بٹائی پر دیدی اور کاشتکاروں سے کہا تم اس کو آباد کرو جو کچھ پیداوار ہوگی وہ میرے اور تمہارے درمیان تقسیم ہوگی تو یہ عقد مزارعت فاسد ہے۔ اس لئے کہ یہ عقد مزارعت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی زمین کا مالک ہو پھر کاشتکار سے عقد مزارعت کر سکتا ہے، ابھی جبکہ زمین آباد نہیں ہوئی تو وہ اس کا مالک نہیں بنا اور جب مالک نہیں بنا تو عقد مزارعت کیسا؟

لہٰذا اس صورت میں جو کاشتکار کام کر کے آباد کرے گا وہی اس کا مالک بن جائے گا، جاگیردار مالک نہیں بنے گا جو کاشتکار عملاً کام کرے گا "مَنْ أَحْيٰى أَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ" (۱) کے اصول کے مطابق وہی مالک بنے گا، جاگیردار اس صورت میں فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ خود آباد کرے یا اجرت دے کر مزدوروں سے آباد کرائے ورنہ مالک نہیں بنے گا۔

اس نظام کے تحت جو صدیوں سے مسلمانوں کے اندر جاری رہا اور اس کے نتیجے میں بڑی بڑی زمینیں لوگوں کے پاس آئیں، لیکن اس قسم کا کوئی مفسدہ پیدا نہیں ہوا جو جاگیرداری نظام کے مفاسد میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے فائدہ ہوا ہے کہ غیر آباد زمینیں آباد ہوئیں، ملکی پیداوار میں اضافہ ہوا، لوگوں کے روزگار اور عشر وخراج کی مقدار زیادہ ہوئی جس سے فقراء اور مساکین کو فائدہ پہنچا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان جاگیرداروں نے کوئی ایسا تسلط حاصل کر لیا ہو جس کی بنیاد پر وہ امراء اور خلفاء کو اپنے فیصلوں کا تابع بنائیں، نہ سیاسی مفاسد پیدا ہوئے اور نہ معاشی مفاسد پیدا ہوئے۔

اس لئے اسلام میں عطاء جاگیر کا جو تصور ہے وہ اس عطاء جاگیر سے بالکل مختلف ہے جو یورپ میں شروع ہوا اور بعد میں ایشیاء میں پھیلا، البتہ پاکستان، ہندوستان اور برصغیر میں چونکہ مدتوں تک انگریز کا تسلط اور انگریز کے اثرات رہے اس وجہ سے اس میں کوئی شک نہیں، یہاں بعض علاقوں میں اس قسم کا جاگیرداری نظام رائج رہا جو یورپ میں تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سرداری نظام اسی قسم کے نظام کے باقی ماندہ اثرات ہیں جن کو ختم کرنا ضروری ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأحکام عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما ذکر فی إحیاء أرض الموات، رقم: ۱۲۹۹؛ سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفیء، رقم: ۲۶۷۱؛ مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۰۹، مؤطا امام مالك، کتاب الأقضیة، باب القضاء فی عمارة الموات، رقم: ۱۲۲۹

انگریزوں کی عطاء جاگیریں

انگریز کے زمانے میں لوگوں کو بہت سی ایسی جاگیریں عطا کی گئی جو اسلام میں پہلی قسم کی ہیں یعنی بنجر زمین کے مالکانہ حقوق کے ساتھ دی گئیں۔اس کے دو پہلو ہیں:

بعض مرتبہ وہ اراضی بطور رشوت دی گئیں اور رشوت بھی مسلمانوں سے غداری کرنے پر مسلمان انگریز کو ملک سے نکالنے کے لئے جدوجہد میں مصروف تھے، انگریز نے مسلمانوں میں ہی کچھ لوگوں کو ان کا جاسوس مقرر رکھا تھا وہ مسلمانوں سے غداری کر کے انگریز کو خبریں پہنچایا کرتے تھے کہ فلاں لوگ آپ کے خلاف یہ سازش کر رہے ہیں، انگریز کے ہاں اس جاسوسی کی بڑی قیمت تھی، اس غداری کے نتیجے میں بطور رشوت یا بطور اجرت (اسلامی نقطہ نظر سے وہ رشوت ہی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں سے غداری کی اجرت ہے) ان کی زمینیں اور جاگیریں دی گئیں۔

غداری کے نتیجے میں دی گئیں جاگیروں کا حکم؟

اس طرح غداری کے عوض جو زمینیں یا جاگیریں دی گئیں شرعاً ان کا جاگیرداروں کو اپنے پاس رکھنا جائز ہی نہیں، اس لئے کہ معقود علیہ غداری ہے لہٰذا اس کی اجرت میں جو کچھ ملا وہ بھی حرام ہے ان کے لئے ان کو اپنے پاس رکھنا بھی حرام ہے۔البتہ اگر انہوں نے ان زمینوں کو آباد کرلیا ہو تو ان پر ان کی ملکیت ثابت ہوجائے گی یا نہیں؟ یہ بات محل نظر ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احیاء سے مِلک تب آتی ہے جب حکومت نے اس کی اجازت دی ہو اور یہاں جو اجازت دی گئی وہ چونکہ غداری کے صلے میں ملی تھی اس لئے اس کا معتبر ہونا محل نظر ہے۔

انگریز کی طرف سے کسی خدمت کے صلے میں دی گئی جاگیر کا حکم

جو جاگیریں غداری کے نتیجے میں نہیں دی گئیں بلکہ انگریز کی حکومت تھی، حکومت کے بہت سے کام کرنے پڑتے تھے ضروری نہیں کہ غداری کے کام ہوں بلکہ مصلحت عامہ کے کام بھی ہوتے تھے، ان مصلحت عامہ کے کاموں کے صلے میں لوگوں کو جاگیریں دی گئیں۔اس طرح جو جاگیریں دی گئیں وہ صحیح ہیں لیکن اس میں اسلامی اعتبار سے شرط یہ ہے کہ جاگیردار نے اس کو اسلامی طریقہ سے آباد کرلیا ہو، اگر اس نے آباد کرلیا چاہے خود کیا ہو یا مزدوروں سے آباد کرالیا تو اس کی ملکیت صحیح ہوگئی، لیکن اگر آباد نہیں کیا تو جتنے حصے کو آباد نہیں کیا وہ اس کی ملکیت میں نہیں آیا۔

سرحد اور پنجاب کے شاملات کا حکم

آپ کو بتایا گیا ہے کہ سرحد اور پنجاب کے شاملات کے علاقے اسی قسم کے ہیں، انگریز نے نام لکھ دیئے کہ فلاں کے لئے ہے لیکن ان لوگوں نے اس میں آباد کاری کا کوئی کام نہیں کیا، اس لئے وہ ان کی ملکیت میں نہیں آئی لیکن جن کو آباد کرلیا وہ ان کی ملکیت میں آ گئیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے دور میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دوسری قسم بھی ملکیت میں نہیں آتی (جن کو آباد کرلیا ہو) اور اس کے لئے دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں، انگریز کے قبضے سے پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی اس لئے ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں، انگریز نے جو قبضہ کیا وہ ناحق تھا، جب قبضہ ناحق تھا تو کسی کو جاگیر دینے کا بھی کوئی حق نہ تھا، اگر کسی کو دے گا تو وہ اس کا مالک نہیں بنے گا۔

لیکن درحقیقت یہ دلیل درست نہیں، یہ جذباتی دلیل ہے فقہی دلیل نہیں، اس لئے کہ فقہ کا مسلمہ اصول ہے، اس طور پر حنفیہ کے نزدیک کہ اگر مسلمانوں کی زمینوں پر کافروں کا استیلاء ہوجائے تو کافر اس کا مالک بن جاتے ہیں، استیلاء کفار موجب ملک ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے ان فقراء کو جو مکہ مکرمہ میں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے فقراء قرار دیا، اس واسطے کہ ان کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں حالانکہ وہاں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کے آئے تھے جن پر مشرکین قابض ہوگئے تھے۔

معلوم ہوا کہ مشرکین کے اس قبضے کو اسلام نے تسلیم کرکے یہ کہہ دیا کہ یہ ان کی ملکیت سے نکل گئیں، تو استیلاء کفار موجب ملک ہوتا ہے، انگریز جب پاکستان اور ہندوستان کی اراضی پر قابض ہوا تو وہ اراضی اس کی ملکیت میں آ گئیں، اب وہ جس کو دیں وہ اس کا ملک ہوجائے گا جبکہ مشروع طریقہ سے دینا ہو، بطور رشوت یا غداری کی اجرت کے طور پر نہ ہو اور یہ جو زمین اور جاگیریں ہیں ان میں دونوں قسم کی ہیں، بعض وہ ہیں جو غداری کے صلے میں دی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو صحیح خدمات کے صلے میں دی گئی ہیں۔

کیا انگریزوں کی عطا کردہ سب جاگیریں غلط ہیں؟

لہٰذا یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ انگریزوں نے جتنی جاگیریں دی ہیں سب غلط ہیں سب سے

واپس لینی چاہئے، یہ بات شرعی اعتبار سے بھی درست نہیں، اس کا مطلب ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیس دیا جائے جو جائز طریقے سے مالک بنے ہیں ان کو محروم کر دیا جائے یہ بات درست نہیں۔

ہمارے ملک میں جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں وہ ان احکام کو مدنظر رکھے بغیر سب نے بلا استثناء کہہ دیا کہ سب سے واپس لے لی جائیں گی، چاہے یہ بات دینی جماعتوں نے لکھی ہے تو یہ بات شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے بلکہ اس تفصیل کے مطابق درست ہوگی کہ جن کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ انہوں نے غداری کر کے حاصل کی ہیں ان سے ساری واپس لے لو۔

یہ عجیب قصہ ہے کہتے ہیں کہ سو ایکڑ چھوڑ دیں گے باقی واپس لے لیں گے، پچاس ایکڑ چھوڑ دیں گے اور باقی واپس لے لیں گے۔ اگر حرام ہے تو پوری حرام ہے اور اگر حلال ہے تو پوری حلال ہے، اس میں سو ایکڑ اور پچاس ایکڑ کا کوئی معنی نہیں، اگر کسی نے غداری کے عوض لی ہے تو سو ایکڑ کیا ایک انچ زمین بھی اس کے پاس چھوڑنا حرام ہے، اور اگر کسی نے حلال طریقے سے حاصل کی ہے تو وہ ہزار ایکڑ ہو تب بھی اس کے لئے جائز ہے۔ اس واسطے جو سیاسی پروپیگنڈہ ہے اس کا فقہی اور شرعی احکام سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت حال وہ ہے جو عرض کر دی گئی۔

مزارعت کا حکم

بعض لوگ جاگیری نظام کے مفاسد کا ذکر کرتے ہوئے مزارعت کو بھی لپیٹ میں لیکر یہ کہتے ہیں کہ زمیندارانہ نظام بھی ختم کرنا چاہئے۔ حالانکہ زمیندارانہ نظام کی جو خرابیاں ہیں وہ درحقیقت زمیندارانہ نظام کی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ افراد کے غیر شرعی طرز عمل کی خرابیاں ہیں۔

ہمارے بعض معاشروں میں خاص طور سے پنجاب یا سرحد کے بعض علاقوں میں ہوتا ہے کہ زمیندار ناجائز شرطیں عائد کرتا ہے کہ ہم تمہیں زمین کاشت کے لئے مزارعت پر دے رہے ہیں لیکن تمہیں فلاں فلاں شرطوں کی پابندی کرنی ہوگی، ہماری بیٹی کی شادی ہوگی تو تمہیں اتنا غلہ فراہم ہوگا، ہمارے بچے کی ختنہ ہوگی تو تمہیں اتنا گھی لا کر دینا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اور بیگار یعنی ایسی محنت جس کا کوئی صلہ نہیں وہ ان پر عائد کی جاتی ہے، مثلاً ہم کوٹھی بنا رہے ہیں ہمارے گھر کی تعمیر کرو، کوئی صلہ یا اجرت نہیں، تو اس قسم کی باتیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں اور زمیندارانہ نظام کو خراب کر دیا ہے۔

دوسرا یہ کہ مزارع کا سماجی رتبہ بہت فروتر بنایا ہوا ہے، یہاں تک کہ پنجاب میں اس کو "کمی" کہتے ہیں، کمی کے معنی ہیں کمینہ تو کاشت کار کا نام کمی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہمارا کمی ہے، اس کو حقیر

اور ذلیل سمجھ کر اس کی بے عزتی کی جاتی ہے یہ سب باتیں ناجائز اور حرام ہیں، نفس مزارعت کے اندر کوئی خرابی نہیں اگر دو آدمیوں کے درمیان برادری کی بنیاد پر معاملہ ہو جیسا کہ دو شریکوں کے درمیان معاملہ ہوتا ہے، خرابی ان شرائط فاسدہ کی وجہ سے ہے ان شرائط فاسدہ کو دور کرنا چاہئے۔

سودی رہن رکھنا

ایک بہت بڑا رواج سودی رہن کا ہے، قرضہ لیا اور زمین رہن رکھ لی، قرض دینے والا اس میں کاشت کر رہا ہے اور قرضے سے کئی گنا زیادہ اس زمین سے وصول کر چکا لیکن پھر بھی زمین نہیں چھوڑ رہا۔ اس قسم کے مسائل ہیں جنہوں نے ہمارے نظام اراضی کو خراب کیا ہے اور اشتراکیت کا پروپیگنڈہ ہے کہ زمین داری نظام ہی غلط ہے، اس سے مرعوب ہونے کے بجائے نظام اراضی کی اصلاح کا جو صحیح طریقہ شریعت نے مقرر کیا ہے اختیار کرنا چاہئے۔

اس موقع پر ایک سوال ہے کہ اندرون سندھ میں حکومت پاکستان کی طرف سے ہاریوں میں زمینیں تقسیم کی جاتی ہیں جب حکومت بدلتی ہے تو نئی حکومت ان زمینوں کو دوبارہ ضبط کر لیتی ہے اور اپنے بعض حامیوں کو دے دیتی ہے، نیز بعض دفعہ بنجر زمینیں بھی ہوتی ہیں جن کو سلطان نے آباد نہیں کیا ایسی زمینیں دینا جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب حکومت بنجر زمین دے رہی ہے تو اس کو لینا اور آباد کرنا جائز ہے اور آباد کرنے سے وہ مالک ہو جائے گا، اس کے بعد اگر دوسری حکومت واپس لے گی تو اس کے لئے وہ لینا شرعاً جائز نہیں ہم نے سپریم کورٹ میں یہ فیصلہ دیدیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو وہ عدالت میں دعویٰ کر کے واپس لے سکتا ہے۔ (۱)

زمین میں وراثت جاری ہونے کا مسئلہ

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمارے نظام اراضی میں ایک بہت بڑا فساد وراثت کے جاری نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، خاص طور پر پنجاب میں وراثت کے شرعی احکام زمینوں پر جاری نہیں کرتے، بیٹیوں کو زمینوں میں کبھی حصہ نہیں ملتا۔

تو زمینوں میں وراثت کے جاری نہ ہونے کے نتیجے میں زمینوں میں ارتکاز پیدا ہو گیا ہے، اگر وراثت کے شرعی احکام جاری ہوتے تو کبھی بھی اتنے بڑے بڑے رقبے ایک آدمی کی ملکیت نہ

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ''عدالتی فیصلے'' (۲/۱۵ تا ۲۰۱)

رہتے، سوڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اگر اس میں وراثت جاری ہوئی ہوتی تو آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ زمین کا تصور بھی نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بخود تقسیم ہو جاتی۔

آج بھی اگر کوئی اسلامی حکومت آئی تو اس پر واجب ہے کہ اس دن سے وراثت کے احکام جاری کرے اس لئے کہ جن لوگوں کے حقوق ختم کئے گئے، زائل کئے گئے یا مارے گئے ان کے حقوق مرور ایام سے ضائع نہیں ہوئے، اس لئے اس دن سے وراثت جاری ہوگی، اگر ایسا ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ تو درکنار، پانچ سو ایکڑ بھی نہیں ہوگی۔

اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید ملکیت نہیں کی، اس واسطے کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید کی جاتی ہے وہ کبھی نہیں چلتی، ایوب خان نے کی، پھر بھٹو صاحب نے کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنے والوں نے یہ کیا کہ ٹھیک ہے بھائی پہلے یہ ہوا تھا کہ ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہو سکتی تھی، اب جس کے پاس پانچ ہزار ایکڑ ہے اس نے چار ہزار ایکڑ اپنے ان چار ہاریوں کے نام کر دیں جن بے چاروں کو پتہ تک نہیں کہ یہ ان کے نام ہے، ان سے کہا گیا کہ یہاں انگوٹھا لگا دیں انہوں نے انگوٹھا لگا دیا کہ میں نے ایک ہزار ایکڑ وصول کر لی، اب وہ اس کے نام پر آ گئی، نام بدل گئے لیکن ہے وہ پانچ ہزار اسی کی۔

بھٹو صاحب مرحوم نے سو ایکڑ تک کی تحدید کر دی، اس نے دس ہاریوں کے نام کر دی، تو اس کے پاس تو پانچ ہزار ایکڑ ہی رہی لیکن نام بدل گئے، تو گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید ہوتی ہے وہ سوائے فراڈ کے اور کچھ نہیں ہوتا، اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید نہیں کی لیکن نظام ایسا بنایا ہے کہ مآل کار کوئی آدمی زیادہ رقبہ کا مالک نہیں رہ سکتا۔

جب میراث جاری ہوگی تو ایک آدمی کے انتقال سے ایک رقبہ زمین آٹھ دس حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور اس کا بھی انتقال ہو گیا تو اور زیادہ تقسیم ہو جائے گی تو اس طرح کبھی بڑا رقبہ ایک آدمی کی ملکیت نہیں رہ سکتا، جس کے نتیجے میں مفاسد جو آج پیدا ہو رہے ہیں یہ پیدا نہیں ہوں گے۔

آج شریعت کے احکام پر کوئی عمل نہیں کرتا اور کہتے ہیں کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تقسیم کر دو اور باقی چھین لو جس کا نہ شرعی جواز ہے اور نہ ہی یہ مسئلہ کا صحیح حل ہے۔

اس موقع پر سوال اٹھتا ہے کہ اگر ایک حکومت سے کم قیمت میں یا ناجائز طریقہ سے کوئی زمین حاصل کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ ہر زمین کی سرکاری طور پر کچھ قیمت متعین ہوتی ہے، اگر امام سرکاری قیمت کے مطابق دے تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ وہ بازار کی زمینوں سے غبن فاحش نہ ہو۔ لیکن اگر غبن فاحش کے ساتھ سستی قیمت پر دیدے، اگر دے گا تو وہ

ناجائز ہوگا اور اگر کسی نے رشوت کے طور پر لی ہے تو وہ بطریق اولی ناجائز ہے جائز نہیں۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ انگریز نے لوگوں کو جو زمین دی ہے یہ تقریباً ایک صدی قبل کا واقعہ ہے اور انگریز رخصت ہو چکا ہے، آج کے دور میں اس عطاء کے گواہ اور ریکارڈ بھی نہیں ہیں؟

اس کے جواب میں کہوں گا کہ میں نے ذاتی طور پر اس کی تحقیق کی ہے ایک ایک زمین اور ایک ایک چپہ کا ریکارڈ موجود ہے، لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ریکارڈ نہیں ہے، کس کو دی گئی؟ اصلاً کس کے نام ہے اور کس کو منتقل ہوئی؟ سب کچھ موجود ہے، ویسے انگریز کا نظام حکومت بڑا زبردست تھا، ہمارے ہاں ہندوستان و پاکستان میں جو زمینیں تھیں مغلیہ دور میں ان کا باقاعدہ منظم ریکارڈ نہیں تھا، انگریز نے آکر اس کے ایک ایک چپہ کا ریکارڈ بنادیا اس کے ریکارڈ کے دو طریقے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بندوبست کے دفاتر میں ریکارڈ موجود ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس نے کتابیں لکھ کر چھاپ دیں، ہر ضلع اور ڈویژن کا ریکارڈ لکھ دیا، یہ چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں، میں جس زمانے میں اس کی تحقیق کر رہا تھا ہزارہ کے ایک گاؤں کا مسئلہ تھا اس موضوع پر مجھے فیصلہ لکھنا تھا، اس لئے مجھے تحقیق کرنی پڑی اس وقت دیکھا کہ انگریز نے انتظام کے اندر کیا کمال دکھایا ہے اس نے ایک ایک گاؤں، ایک ایک گلی، ایک ایک رقبہ کا ریکارڈ بنایا ہے نہ یہ کہ صرف دفتروں میں ہے بلکہ کتابوں کی شکل میں چھاپ کے رکھ دیا ہے اور وہاں جو رسم ورواج تھے سارے تفصیل سے لکھ کر چلا گیا ہے کہ فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا، فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا وغیرہ۔

پہلے یہ تھا اور اب یہ ہے کہ فلاں تاریخ سے فلاں تک یہ رواج رہا، یہ ہوا وہ ہوا، وہ سب لکھ کر چلا گیا۔ اس واسطے یہ ریکارڈ نکالنا مشکل نہیں ہے، اگر حکومت ایک اراضی کمیشن بنادے کہ بھائی تم چھان بین کرو تو کوئی دشواری نہیں ہے، بڑے آرام سے نکل آئے گا، اور اطمینان سے اس کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ ان باتوں کو بھی چھوڑ دو، صرف وراثت کے احکام جاری کردو، پھر دیکھو ان بڑے بڑے رقبوں کا کیا بنتا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ



اسلام، جمہوریت اور سوشلزم ☆

''اسلام ہمارا مذہب ہے
جمہوریت ہماری سیاست ہے
اور سوشلزم ہماری معیشت ہے''

یہ وہ نعرہ ہے جسے پچھلے دنوں ہمارے ملک کی بعض سیاسی جماعتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ پھیلایا ہے۔ اس نعرہ کی پہلی ہی سطر میں ''اسلام'' کا لفظ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس میں ''اسلام'' کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے، لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ اس نعرے میں ''اسلام'' کی مثال بالکل اسی شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا ہو۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تین جملوں کو پڑھ کر ''اسلام'' کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ معاذ اللہ اسلام بھی عیسائیت، یہودیت یا ہندومت کی طرح پوجا پاٹ کی چند رسموں یا اخلاق کے چند مجمل اصولوں کا نام ہے اور زندگی کے دوسرے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی شخص عبادت کے چند خاص طریقوں کو اپنا لے تو اس کے بعد وہ اپنی حکومت اور اپنی معیشت کو جس نظام کے ساتھ بھی وابستہ کرنا چاہے کر سکتا ہے، وہ مسجد میں بیٹھ کر اسلام کی تعلیمات کا پابند ہے، لیکن اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد یا اپنے لئے رزق کی تلاش کے وقت اسلام نے یا تو اسے رہنمائی دی ہی نہیں ہے، یا اگر دی ہے تو وہ (معاذ اللہ) اتنی ناقص اور بیکار ہے کہ اس کے ذریعہ اس کے سیاسی اور معاشی مسائل حل نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اپنی سیاست میں جمہوریت سے اور اپنی معیشت میں سوشلزم سے ''روشنی'' حاصل کرے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کا مفہوم یہی کچھ ہے تو پھر یہ دعوے آپ فضول کرتے ہیں کہ ''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس میں انسان کی تمام موجودہ پریشانیوں کا حل موجود ہے'' پھر تو کھل کر آپ کو کہنا چاہئے کہ اسلام نے عبادات وعقائد کے علاوہ زندگی کے کسی مسئلہ میں ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی اور (معاذ اللہ) ہم اپنے سینوں میں قرآن رکھتے ہوئے بھی کارل مارکس اور ماؤزے

☆ ہمارا معاشی نظام، ص: ۸۳

تنگ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔

اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات صرف عبادات وعقائد تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل نظام ہے، تو پھر مسجد ہو یا بازار، حکومت کا ایوان ہو یا تفریح کا میدان، آپ کو ہر مقام پر صرف اور صرف اسلام ہی کی پیروی کرنی پڑے گی، پھر اس طرز عمل کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسجد میں پہنچ کر تو آپ بیت اللہ کی طرف رخ کریں اور دفتر وبازار میں پہنچ کر ماسکو اور پیکنگ کو اپنا قبلہ وکعبہ بنالیں۔ آپ کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر انسانیت کے صرف اس محسن اعظم ﷺ کے چشم وابرو کو دیکھنا ہوگا جس کی تعلیمات نے صرف مسجدوں میں اجالا نہیں کیا بلکہ اس کے نور ہدایت سے حکومت کے ایوانوں اور معیشت کے بازار بھی یکساں طور پر جگمگائے ہیں۔

بعض حضرات اس نعرے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں جس سوشلزم کو اپنایا گیا ہے وہ لادینی سوشلزم نہیں بلکہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے اور جس طرح ''جمہوریت'' اسلامی ہوسکتی ہے اسی طرح ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح بھی درست ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جہاں اصطلاح کا تعلق ہے ہمارے نزدیک نہ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح درست ہے اور نہ اسلامی سوشلزم کی۔ یہ دونوں نظام مغرب کی لادینی فکر کی پیداوار ہیں، اور ان کے ساتھ اسلام کا پیوند لگانا ایک طرف اسلام کی توہین ہے اور دوسری طرف اس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں نظام جوں کے توں اسلام کے مطابق ہیں لہٰذا لفظوں کی حد تک تو یہ دونوں اصطلاحیں ہماری نظر میں غلط اور مغالطہ انگیز ہیں اور مسلمانوں کو دونوں ہی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

لیکن معنویت کے لحاظ سے ''اسلامی جمہوریت'' اور ''اسلامی سوشلزم'' میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، جمہوریت کے فلسفے میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں۔ (مثلاً عوام کے اقتدار اعلیٰ کا تصور، لیجلیز کا خدائی احکام کی پابندی کے بغیر خود مختار واضع قانون ہونا، اور امیدوار حکومت کا از خود اقتدار کی طلب کرنا) لیکن جمہوریت کی وہ بہت سی باتیں اسلام کے مطابق بھی ہیں جنہیں عرف عام میں جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، یعنی شورائی حکومت تقسیم اختیارات، آزادی اظہار رائے اور عوام کے سامنے حکومت کی جواب دہی وغیرہ اب جو لوگ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد نظام جمہوریت کی صرف وہ باتیں ہیں جو اسلام کے خلاف نہیں ہیں، ان کو نکال کر جو باقی بچتا ہے وہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر توحید رسالت اور آخرت پر ایمان لاکر جمہوری نظام حکومت کو جوں کا توں قبول کرلیا

جائے تو وہی لادینی جمہوریت اسلامی بن جاتی ہے۔ دوسری الفاظ میں ان کے نزدیک لادینی جمہوریت کی خرابی صرف اس قدر نہیں ہے اس کا نظریہ پیش کرنے والے مادہ پرست اور غیر مسلم تھے جنہوں نے اپنی مادہ پرستی کا جوڑ جمہوریت کے ساتھ ملا دیا تھا، اور اگر توحید پر ایمان رکھنے والے لوگ اسے بعینہ اختیار کرلیں گے تو اس کی خرابی دور ہو جائے گی، بلکہ ان کے نزدیک کچھ خرابیاں خود جمہوریت میں پائی جاتی ہیں، اور ان خرابیوں کو نکال کر باقی ماندہ حصے کو وہ ''اسلامی جمہوریت'' قرار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ بلند کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ سوشلزم کے معاشی نظام میں بذاتہ خود کوئی خرابی نہیں، اس کی خرابی صرف یہ ہے کہ اس کے پیش کرنے والے منکر خدا تھے اور انہوں نے اس انکار خدا کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملا دیا تھا، اب اگر اسی معاشی نظام کو مسلمان اختیار کرلیں تو اس کی خرابی دور ہو جاتی ہے، گویا سوشلزم کے معاشی نظام کو جوں کا توں لیکر اس میں خدا اور رسول اور آخرت کے عقائد کو شامل کر لیجئے تو وہی لادینی سوشلزم اسلامی بن جاتا ہے۔

اور اگر یہ حضرات یہ کہتے بھی ہیں کہ ہم نے سوشلزم سے غیر اسلامی اجزاء کو نکال کر اس کا نام ''اسلامی سوشلزم'' رکھا ہے تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے، ورنہ ان کا یہ دعویٰ دو وجہ سے غلط ہے ایک تو اس لئے کہ انہوں نے اپنے تجویز کردہ معاشی نظام میں سوشلزم کے معاشی نظام کی تمام وہ باتیں باقی رکھی ہیں جو صریحی طور پر خلاف اسلام ہیں۔ سوشلزم کی بنیاد وسائل پیداوار پر جو جبر قبضہ کرلینے پر ہے، اور یہ بات جوں کی توں ان کے ''اسلامی سوشلزم'' میں بھی موجود ہے، جس کی صراحت ان کے رہنما اپنی تحریر وتقریر میں ہمیشہ کرتے رہے، دوسرے اس لئے کہ سوشلزم کا صرف مادی فلسفہ نہیں بلکہ اس کا معاشی نظام بھی سر سے لیکر پاؤں تک اسلام کے خلاف ہے، لہٰذا اگر اس میں سے غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیا جائے تو حاصل تفریق کچھ بچتا ہی نہیں ہے جسے ''اسلامی سوشلزم'' کہا جاسکے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح بالکل ایسی ہی ہے جیسے ''اسلامی بنکاری'' کی اصطلاح موجودہ بنکاری کا سارا نظام سود پر چل رہا ہے۔ اس لئے یہ نظام بلاشبہ غیر اسلامی ہے، لیکن اگر اسی نظام سے سود کی گندگی کو خارج کر کے اسے مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تو یہی نظام اسلام کے مطابق ہو جائے گا، اب اگر کوئی شخص ایسے نظام کا نام ''اسلامی بنکاری'' رکھ دے تو اس کی اس اصطلاح پر تو اعتراض کیا جاسکتا ہے لیکن معنویت کے لحاظ سے اس کی بات غلط نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ''اسلامی سوشلزم'' کی مثال ایسی ہے جیسے ''اسلامی سود'' اور ''اسلامی قمار''

اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ ''سود'' اور ''قمار'' کی خرابی صرف یہ تھی کہ اس کے موجد اسلام کے بنیادی عقائد کے قائل نہیں تھے اب ہم ان کے نظریات میں سے تمام غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیتے ہیں اور توحید اور رسالت اور آخرت کو مان کر سود کھاتے اور قمار کھیلتے ہیں، لہٰذا ہمارے سود و قمار کا نام اسلامی سود و قمار ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات حددرجہ مضحکہ خیز ہوگی، اس لئے کہ سود و قمار سرتاپا خلاف اسلام چیزیں ہیں اور ان میں سے خلاف اسلام اشیاء کو نکال دیا جائے تو کوئی ایسی چیز باقی ہی نہیں رہتی جس کا نام ''اسلامی سود'' یا ''اسلامی قمار'' رکھا جائے۔

لہٰذا اسلامی جمہوریت کی اصطلاح لفظی طور پر غلط سہی، لیکن معنی کے اعتبار سے ''اسلامی سوشلزم'' کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم نے ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح اس لئے اختیار کی ہے کہ ماضی میں بہت سے لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس اصطلاح سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حامی نہیں، لیکن یہ دلیل بھی انتہائی بودی اور کمزور ہے، کیونکہ ایک غلط فہمی کو رفع کر کے دوسری غلط فہمی پیدا کردینا عقل وخرد کی کون سی منطق کا تقاضا ہوسکتا ہے؟ اگر واقعۃً مقصد یہی واضح کرنا ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم وستم کا حامی نہیں تو پھر اس کے لئے ''اسلامی سوشلزم'' کے بجائے ''اسلامی عدل عمرانی'' (Islamic Social Justice) کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔

پھر اس نعرہ میں اسلام اور جمہوریت کو سوشلزم کے ساتھ معصومیت سے شیر وشکر کر کے پیش کیا گیا ہے، گویا ان دونوں چیزوں کا سوشلزم کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ نہ تو کسی مرحلے پر اسلام سے میل کھاتا ہے اور نہ کسی مقام پر جمہوریت اسے چھو کر گزری ہے، اسلام بلاشبہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی منصفانہ طریقے پر تقسیم ہو اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے، لیکن اس مقصد کے لئے جو ظالمانہ طریق کار سوشلزم نے تجویز کیا ہے اسلام اس کا بھی کسی طرح روادار نہیں۔ اس لئے کہ وسائل پیداوار کو لوگوں سے چھین کر حکومت کے چند افراد کے ہاتھوں میں تھما دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ ملک کی ساری دولت ایک بڑی سرمایہ دار جماعت کے حوالے ہو جائے، اور عام آدمی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ اس کے رحم وکرم کا محتاج ہو کر رہ جائے، لہٰذا انفرادی ملکیت کی جس نفی پر سوشلزم کی بنیاد ہے اسلام چند قدم بھی اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

اسی طرح سوشلزم کی تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت بھی کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکی،

جمہوریت کی روح "آزادی اظہار رائے" پر قائم ہے۔ اور سوشلزم نظام زندگی میں یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، سوشلزم جس جگہ بھی قائم ہوا ہے جبر وتشدد کے ذریعہ قائم ہوا ہے۔ اس نے ہمیشہ فکر ورائے کا گلا گھونٹ کر اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے خود پسند مزاج نے اس آواز کو کبھی گوارا نہیں کیا جو اس پر تنقید کرنے کے لئے اٹھی ہو۔ اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں جو "منصوبہ بند معیشت" قائم کی جاتی ہے وہ شدید ترین آمریت کے بغیر نہ قائم ہوسکتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے، یقین نہ آئے تو ان ملکوں کے حالات پڑھ کر دیکھئے جہاں سوشلزم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے کیا وہاں اشتراکی پارٹی کے سوا کوئی اور سیاسی جماعت پنپ سکتی ہے؟ کیا وہاں مزدور کو حق ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوئی چھوٹی سی انجمن ہی بنالے؟ کیا وہاں کا مزدور حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف ہڑتال کرسکتا ہے؟ کیا وہاں کے پریس کو آزادی ہے کہ وہ برسراقتدار جماعت کے خلاف چوں بھی کرسکے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر آخر وہ کون سی جمہوریت ہے جس کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملایا گیا ہے؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

☆☆☆

حقوق و فرائض ☆

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ماضی قریب کی ان شخصیتوں میں سے تھے جن کی مثالیں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں، ان کا اردو ترجمہ قرآن اور تفسیر مشہور و معروف ہے، اس کے علاوہ آزادی ہند کے سلسلے میں ان کی تحریک ریشمی رومال اور تحریک خلافت میں ان کی سرگرم خدمات ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے اور پھر تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں عمر بھر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور ماضی قریب کے بے شمار مشاہیر نے ان کی شاگردی کا اعزاز حاصل کیا۔

جب وہ دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الحدیث'' کے طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے محسوس کیا کہ ان کی تنخواہ ان کے منصب ان کے علم و فضل اور ان کی خدمات کے لحاظ سے بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے ان کا کوئی اور ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہے اور ضروریات بڑھتی جارہی ہیں۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور اس مضمون کا ایک حکم نامہ مجلس شوریٰ کی طرف سے جاری کردیا گیا۔

جو صاحب مولانا کے پاس مجلس شوریٰ کے فیصلے کی خبر لیکر گئے انہیں یقیناً یہ امید ہوگی کہ مولانا یہ خبر سن کر خوش ہوں گے، لیکن معاملہ برعکس ہوا، مولانا یہ خبر سن کر پریشان ہوگئے اور فوراً مجلس شوریٰ کے ارکان کے نام ایک درخواست لکھی جس کا مضمون یہ تھا:

> ''میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دارالعلوم کی طرف سے میری تنخواہ میں اضافہ کیا جارہا ہے یہ اطلاع میرے لئے سخت تشویش کا موجب ہے، اس لئے کہ میری عمر کی زیادتی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اب دارالعلوم میں میرے ذمے پڑھانے کے گھنٹے کم رکھے گئے ہیں، جبکہ اس سے پہلے میرے ذمے زیادہ گھنٹے ہوا کرتے تھے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مجلس شوریٰ میری تنخواہ کم کرنے پر غور کرتی، چہ جائیکہ میری تنخواہ میں اضافے پر سوچا جائے، لہٰذا میری درخواست ہے کہ میری

☆ ذکر و فکر، ص: ۹۰

تنخواہ بڑھانے کا فیصلہ واپس لیا جائے اور اوقات کے لحاظ سے تنخواہ کم کرنے پر غور کیا جائے''

آج ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں اس میں اگر کوئی ملازم اس مضمون کی درخواست اپنی انتظامیہ کے نام تحریر کرے تو اغلب گمان یہی ہوگا کہ اس درخواست کے ذریعہ ملازم نے اپنی انتظامیہ پر بھرپور طنز کیا ہے، وہ اپنی تنخواہ میں اضافے کی مقدار سے نہ صرف یہ کہ مطمئن نہیں ہے بلکہ اسے انتظامیہ پر یہ سنگین اعتراض ہے کہ اس نے یہ معمولی اضافہ کر کے اس کی توہین کی ہے، لہٰذا اس نے جلے کٹے لہجے میں یہ طنز آمیز خط تحریر کیا ہے۔

لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جو درخواست لکھی تھی اس میں دور دور تک طنز کا کوئی شائبہ نہیں تھا وہ واقعۃً یہ سمجھتے تھے کہ تنخواہ میں جو اضافہ ہوگا شاید وہ ان کے کام کے لحاظ سے دیانۃً درست نہ ہو، اس لئے کہ اس ماحول میں ایسے حضرات کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اپنے تدریسی اوقات کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتے تھے کہ یہ ان کا بکا ہوا وقت ہے جو کسی اور کام میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں جو مدرسہ قائم کیا تھا اس میں ہر استاد کا معمول تھا کہ اگر اسے مدرسے کے اوقات میں اپنا کوئی ضروری ذاتی کام پیش آ جاتا یا ملازمت کے اوقات میں ان کے پاس کوئی ذاتی مہمان ملنے کے لئے آ جاتا تو وہ گھڑی دیکھ کر اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتے تھے کہ اتنا وقت اپنے ذاتی کام میں صرف ہوا اور مہینے کے ختم پر ان اوقات کا مجموعہ بنا کر انتظامیہ کو از خود درخواست پیش کرتے تھے کہ اس ماہ ہماری تنخواہ سے اتنے روپے کاٹ لئے جائیں کیونکہ اتنا وقت ہم نے دوسرے کام میں خرچ کیا ہے۔

یہ ہے اس فرض شناس معاشرے کی ایک ہلکی سی تصویر جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے، آج ہمارے معاشرے میں ہر طرف ''حقوق'' حاصل کرنے کی صدائیں گونج رہی ہیں، اسی مقصد کے تحت بے شمار ادارے، انجمنیں اور جماعتیں قائم ہیں اور ہر شخص اپنے حقوق کے نام پر زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کرنے کی فکر میں منہمک ہے، لیکن اس پہلو کی طرف توجہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے کہ حقوق (Rights) ہمیشہ فرائض (Ofligations) سے وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ درحقیقت انہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جو شخص اپنے فرائض کما حقہ ادا نہ کرے اس کے لئے متعلقہ حقوق کے مطالبے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مزاج یہ ہے کہ وہ نہ صرف ہر فرد کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتی ہیں بلکہ دل میں اصل فکر ہی یہ پیدا کرتی ہے کہ کہیں مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی تو

نہیں ہو رہی؟ اس لئے کہ ہوسکتا ہے میں اپنی ترکیبوں سے اس کوتاہی کو چھپالوں اور اس کے دنیوی نتائج سے محفوظ ہو جاؤں، لیکن ظاہر ہے کہ کوئی کوتاہی، خواہ وہ کتنی معمولی کیوں نہ اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتا۔ جب یہ فکر کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا اصل مسئلہ حقوق کے حصول کے بجائے فرائض کی ادائیگی بن جاتا ہے، پھر وہ اپنے جائز حقوق بھی پھونک پھونک کر وصول کرتا ہے، کہ کہیں وصول شدہ حق کا وزن ادا کردہ فریضے سے زیادہ نہ ہو جائے، یہی فکر تھی جس نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو وہ درخواست دینے پر مجبور کیا۔

اگر یہ فکر معاشرے میں عام ہو جائے تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہونے شروع ہو جائیں، اور حق تلفیوں کی شرح گھٹتی چلی جائے، اس لئے کہ ایک شخص کا فریضہ دوسرے کا حق ہے اور جب پہلا شخص اپنا فریضہ ادا کرے گا تو دوسرے کا حق خود بخود ادا ہو جائے گا۔ شوہر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کے حقوق ادا ہوں گے، بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کے حقوق ادا ہوں گے، افسر اپنے فرائض بجا لائے تو ماتحت کو اس کے حقوق ملیں گے، اور ماتحت اپنے فرائض بجا لائے تو افسر کو اس کے حقوق ملیں گے، غرض دو طرفہ تعلقات کی خوشگواری کا اصل راز یہی ہے کہ ہر فریق اپنی ذمہ داری محسوس کر کے اس سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہو، تو دونوں میں سے کسی کو حق تلفی کی کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہوسکتی۔

لیکن یہ فکر معاشرے میں اس وقت تک عام نہیں ہوسکتی جب تک اس میں فکر آخرت کی آبیاری نہ کی جائے، آج ہم عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے کا زبان سے خواہ کتنا اعلان کرتے ہوں لیکن ہماری عملی زندگی میں اس عقیدے کا کوئی پرتو عموماً نظر نہیں آتا، ہماری ساری دوڑ دھوپ کا محور یہ ہے کہ روپے پیسے اور مال و اسباب کی گنتی میں اضافہ کس طرح ہو؟ یہی بات زندگی کا اصل مقصد بن چکی ہے اور یہی ہماری ساری معاشی سرگرمیوں کا آخری مطمح نظر ہے۔

چنانچہ اگر ہم کہیں ملازمت کر رہے ہیں تو ہماری سوچ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں اضافہ کس طرح کیا جائے؟ اور ملازم کو حاصل ہونے والی دوسری سہولتیں زیادہ سے زیادہ کس طرح حاصل کی جاسکتی ہیں؟ اس کے لئے ہم انفرادی درخواستوں سے لیکر اجتماعی سودا کاری تک اور چاپلوسی سے لیکر دھونس دھاندلی تک ہر حربہ استعمال کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہم میں یہ فکر رکھنے والے بہت کم ہیں (گو بحمد اللہ نایاب نہیں) کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ ہماری کارکردگی کے لحاظ سے حلال بھی ہے کہ نہیں؟ جب اپنے لئے کچھ وصول کرنے کا وقت آئے تو ہمیں یہ حدیث نبوی خوب یاد ہوتی ہے کہ "مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو" (۱) لیکن یہ دیکھنے

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب أجر الأجراء، رقم: ۲٤۳٤، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ((أعطُوا الأجيرَ أجرَهُ قَبلَ أنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ))

کی ضرورت ہم میں سے بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ پسینہ واقعی نکلا بھی ہے کہ نہیں؟

اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق کے معاملے میں تو بہت حساس ہیں، لیکن فرائض کے معاملے میں حساس نہیں اور جب کسی بھی فریق کو اپنے فرائض کی فکر نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ سب کے حقوق پامال ہوتے ہیں، معاشرے میں جھگڑوں، تنازعات اور مطالبوں کی چیخ و پکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا، لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں اور کان بند ہوجاتے ہیں، اور جب ضمیر کو موت کی نیند سلانے کے بعد کوئی کسی کی نہیں سنتا تو لوگ آخری چارۂ کار اسی کو سمجھتے ہیں کہ جس کے جو چیز ہاتھ لگ جائے لے بھاگے، چنانچہ نوبت چھینا جھپٹی تک اور لوٹ کھسوٹ تک پہنچ کر رہتی ہے۔

اپنے گردوپیش میں نظر دوڑا کر دیکھیں تو یہی منظر دکھائی دیتا ہے اس سے پریشان ہر شخص ہے لیکن افراتفری کے اس عالم میں یہ سوچنے سمجھنے کی فرصت بہت کم لوگوں کو ہے کہ یہ صورتحال اس وقت تک تبدیل نہیں ہوگی جب تک ہم میں سے ہر شخص فرائض کے احساس کو مقدم نہ رکھے یا کم از کم فرائض کو اتنی اہمیت تو دے جتنی اپنے حقوق کو دیتا ہے۔

اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ہمارے لئے بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ ہم اس پر عمل کے لئے تیار ہوں ارشاد ہے:

"اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور اپنے بھائی کے لئے بھی اس بات کو برا سمجھو جسے اپنے لئے برا سمجھتے ہو"(۱)

اس حدیث مبارک نے ہمیں یہ سنہرا اصول بتایا ہے کہ جب بھی کسی دوسرے شخص سے کوئی معاملہ کرنے کی نوبت آئے تو پہلے اپنے آپ کو اس دوسرے شخص کی جگہ کھڑا کر کے دیکھ لو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے معاملے کی توقع کرتا؟ کون سی بات میرے لئے ناگواری کا موجب ہوتی؟ اور کس بات سے مجھے اطمینان ہوتا؟ بس اب دوسرے شخص کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو اس وقت تمہارے لئے موجب اطمینان ہوسکتا تھا اور ہر اس بات سے پرہیز کرو جو تمہیں ناگوار ہوسکتی تھی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب من الإیمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه، رقم:۱۲، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من خصال الفطرة أن یحب لأخیه، رقم:٦٤، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب من اتقی المحارم فهو أعبد الناس، رقم:۲۲۲۷، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب علامة الإیمان، رقم:۴۹۳۰، سنن ابن ماجه، کتاب المقدمة، باب فی الإیمان، رقم:٦٥، مسند أحمد، رقم:۲۱۱۱۳، حدیث معاذ بن جبل رضی الله عنه، سنن الدارمی، رقم:۲٦۲۳

اگر ایک افسر اپنے ماتحت کے ساتھ اپنا رویہ متعین کرتے وقت یہ معیار اپنا لے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے رویے کو انصاف کے مطابق سمجھتا؟ تو اس کے ماتحت کو کبھی اس سے کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہوسکتی، اسی طرح اگر ماتحت اپنے کام کی نوعیت اور مقدار متعین کرتے وقت اس بات کو فیصلہ کن قرار دے کہ اگر میں اپنے افسر کی جگہ ہوتا تو میں انصاف کے ساتھ کتنے اور کیسے کام کی توقع کرتا؟ تو افسر کو اپنے ماتحت سے کوئی جائز شکایت نہیں ہوسکتی۔

یہ اصول صرف ماتحت اور افسر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دنیا کے ہر تعلق میں اتنا ہی مفید اور کارآمد ہے، باپ بیٹے، بہن بھائی، میاں بیوی، ساس بہو، دوست احباب، عزیز رشتہ دار، تاجر اور خریدار، حکومت اور عوام، غرض ہر قسم کے باہمی رشتوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے زندگی گزارنے کے لئے دُہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں، اپنے لئے ہم کسی اور معیار کی توقع رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر دوسروں سے مطالبے کرتے ہیں، اور دوسروں کے لئے ہم نے کوئی اور معیار بنا رکھا ہے، اور ان کے ساتھ معاملہ اسی معیار کے مطابق کرتے ہیں، اگر ہمارے لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ نہ ہوں بلکہ دونوں صورتوں میں ہماری سوچ ایک جیسی ہو تو حق تلفیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دلوں میں فرائض کا احساس کس طرح پیدا کیا جائے؟ یہ درست ہے کہ کوئی ایک شخص تن تنہا معاشرے کے مزاج کو ایک دم نہیں بدل سکتا لیکن وہ خود اپنے مزاج کو ضرور تبدیل کرسکتا ہے، اور اپنے حلقۂ اثر میں اس مزاج کو فروغ دینے کی ممکنہ تدابیر بھی اختیار کرسکتا ہے، کم از کم اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے، اور اگر وہ ایسا کرے تو کم از کم ایک گھرانے کو بھٹکنے سے بچا کر سیدھے راستے پر لانے کا کارنامہ اس کے نامہ اعمال کو جگمگانے کے لئے کافی ہوسکتا ہے، پھر تجربہ یہ ہے کہ نیک نیتی سے انجام دیا ہوا یہ کارنامہ دوسروں پر بھی اپنے اثرات لازماً چھوڑتا ہے، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو اسی طرح رفتہ رفتہ فرد سے گھرانہ، گھرانے سے خاندان، خاندان سے برادری، برادری سے پوری قوم تعمیر وترقی کی راہ پر لگ جاتی ہے، قومیں ہمیشہ اسی طرح بنی ہیں اور آج بھی ان کے بننے کا یہی طریقہ ہے۔

میں تو تنہا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ کچھ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆☆☆

چوری یہ بھی ہے ☆

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جارہے تھے، جب ریل میں سوار ہونے کے لئے اسٹیشن پہنچے تو محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سامان اس مقررہ حد سے زیادہ ہے جو ایک مسافر کو بک کرائے بغیر اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس کھڑکی پر پہنچے جہاں سامان کا وزن کر کے زائد سامان کا کرایہ وصول کیا جاتا ہے تاکہ سامان بک کراسکیں، کھڑکی پر ریلوے کا جو اہلکار موجود تھا، وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جانتا تھا، اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سامان بک کرنے کی فرمائش کی تو اس نے کہا کہ مولانا! رہنے بھی دیجئے، آپ سے سامان کا کیا کرایہ وصول کیا جائے؟ آپ کو سامان بک کرانے کی ضرورت نہیں میں ابھی گارڈ سے کہہ دیتا ہوں وہ آپ کو زائد سامان کی وجہ سے کچھ نہیں کہے گا۔

مولانا نے فرمایا یہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟ ''غازی آباد تک'' ریلوے افسر نے جواب دیا، پھر غازی آباد کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا نے پوچھا۔ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے بھی کہہ دے گا، اس نے کہا مولانا نے پوچھا وہ دوسرا گارڈ کہاں تک جائے گا؟ افسر نے کہا وہ کانپور تک آپ کے ساتھ جائیگا۔ پھر کانپور کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا نے پوچھا، افسر نے کہا کانپور کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وہاں آپ کا سفر ختم ہوجائے گا۔ حضرت نے فرمایا نہیں، میرا سفر تو بہت لمبا ہے کانپور ختم نہیں ہوگا اس لمبے سفر کی انتہاء تو آخرت میں ہوگی، یہ بتایئے کہ جب اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ اپنا سامان تم کرایہ دیئے بغیر کیوں اور کس طرح لے گئے؟ تو یہ گارڈ صاحبان میری کیا مدد کرسکیں گے؟

پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو سمجھایا کہ یہ ریل آپ کی یا گارڈ صاحب کی ملکیت نہیں ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ریلوے کے محکمے کی طرف سے آپ کو یا گارڈ صاحب کو یہ اختیار بھی نہیں دیا گیا کہ وہ جس مسافر کو چاہیں ٹکٹ کے بغیر یا اس کے سامان کو کرائے کے بغیر ریل میں سوار کردیا کریں، لہٰذا اگر میں آپ کی رعایت سے فائدہ اٹھا کر بغیر کرائے کے سامان لے بھی جاؤں تو یہ میرے دین کے لحاظ سے چوری میں داخل ہوگا، اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اس گناہ کا جواب

☆ ذکر فکر، ص: ۱۱۸

دینا پڑے گا، اور آپ کی یہ رعایت مجھے بہت مہنگی پڑے گی، لہٰذا براہ کرم مجھ سے پورا پورا کرایہ وصول کر لیجئے۔ ریلوے کا وہ اہلکار مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتا رہ گیا، لیکن پھر اس نے تسلیم کیا کہ بات آپ ہی کی درست ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ پیش آیا، وہ ایک مرتبہ ریل میں سوار ہونے کے لئے اسٹیشن پہنچے لیکن دیکھا کہ جس درجے کا ٹکٹ لیا ہوا ہے اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں، گاڑی روانہ ہونے والی تھی اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ جا کر ٹکٹ تبدیل کروالیں، مجبوراً اوپر کے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے، خیال یہ تھا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ تبدیل کرالیں گے لیکن اتفاق سے پورے راستے میں کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہ آیا، یہاں تک کہ منزل آ گئی منزل پر اتر کر وہ سیدھے گھر پہنچے وہاں جا کر معلومات کیں کہ دونوں درجوں کے کرائے میں کتنا فرق ہے؟ پھر اتنی ہی قیمت کا ایک ٹکٹ وہاں سے خرید لیا اور وہیں پر پھاڑ کر پھینک دیا، ریلوے کے جس ہندو افسر نے ٹکٹ دیا تھا جب اس نے دیکھا کہ انہوں نے ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیا ہے تو اسے سخت حیرانی ہوئی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دماغی حالت پر بھی شبہ ہوا ہو، اس لئے اس نے باہر آ کر ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ آپ نے ٹکٹ کیوں پھاڑا؟

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پورا واقعہ بتایا اور کہا کہ اوپر کے درجے میں سفر کرنے کی وجہ سے یہ پیسے میرے ذمے رہ گئے تھے، ٹکٹ خرید کر میں نے یہ پیسے ریلوے کو پہنچا دیئے، اب یہ ٹکٹ بیکار تھا اس لئے پھاڑ دیا، وہ شخص کہنے لگا کہ مگر آپ تو اسٹیشن سے نکل آئے تھے اب آپ سے کون زائد کرائے کا مطالبہ کرسکتا تھا، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جی ہاں، انسانوں میں تو اب کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں تھا لیکن جس حقدار کے حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو اس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ ضرور کرتے ہیں، مجھے ایک دن ان کو منہ دکھانا ہے اس لئے یہ کام ضروری تھا۔

یہ دونوں واقعات قیام پاکستان سے پہلے اس دور کے ہیں جب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے دل میں اس حکومت کے خلاف جو نفرت تھی وہ محتاج بیان نہیں، چنانچہ ملک کو انگریزوں کی حکومت سے آزاد کرانے کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں، خود حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ برملا اپنی اس خواہش کا اظہار فرما چکے تھے کہ مسلمانوں کی کوئی الگ حکومت ہونی چاہئے جس میں وہ غیر مسلموں کے تسلط سے آزاد ہو کر شریعت کے مطابق اپنا کاروبار زندگی چلاسکیں، لیکن انگریز کی حکومت سے متنفر ہونے کے باوجود اس کے قائم کئے ہوئے محکمے سے تھوڑا سا فائدہ بھی

معاوضہ ادا کئے بغیر حاصل کرنا انہیں منظور نہ تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ چوری کی قانونی تعریف خواہ کچھ ہو لیکن گناہ وثواب کے نقطہ نظر سے کسی دوسرے کی چیز اس کی آزاد مرضی کے بغیر استعمال کرنا چوری ہی میں داخل ہے۔

آنحضرت ﷺ نے دسیوں احادیث میں مختلف انداز سے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے، چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے کہ:

((حُرْمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ كَحُرْمَةِ دَمِه))(۱)

''مسلمان کے مال کی حرمت بھی ایسی ہی ہے جیسے ان کے خون کی حرمت''

واضح رہے کہ حدیث میں اگرچہ ''مسلمان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں مسلمان حکومت کے غیر مسلم باشندے جو امن کے معاہدے کے ساتھ رہتے ہوں یا اس غیر مسلم حکومت کے غیر مسلم باشندے جس کے تحت مسلمان پرامن طور پر رہتے ہوں، ان کے جان ومال کا احترام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مسلمان کے جان ومال کا احترام۔ لہٰذا اس لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ غیر مسلموں کی جان ومال قابل احترام نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِیءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ))(۲)

''کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے''

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے منیٰ میں جو خطبہ دیا اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

((لَا يَحِلُّ لِامْرِیءٍ مِّنْ مَالِ اَخِيْهِ اِلَّا مَا طَابَتْ بِه نَفْسُهٗ))(۳)

''کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کا کوئی مال حلال نہیں ہے سوائے اس مال کے جو اس نے خوش دلی سے دیا ہو''

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّاْخُذَ مَالَ اَخِيْهِ بِغَيْرِ حَقٍّ، وَذٰلِكَ لِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَ

(۱) كنز العمال، رقم:٤٠٤ (١٤٤/١)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد(١٣١/٢)، حلية الأولياء (٣٣٤/٧)، جامع الأحاديث، رقم:١١٥٧٠ (١١٦/١٢)، جمع الجوامع للسيوطی، رقم:١٢٠٢٧ (١١٧٠٢/١)

(۲) كنز العمال، رقم:٣٩٧ (٩١/١)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم:١٩٧٧٤، جامع الأحاديث، رقم:١٧٦١٥ (٨٠/١٧)، كشف الخفاء، رقم:٣١٠١ (٣٧٠/٢)

(۳) كنز العمال، رقم:٣٩٧ (٩١/١)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم:١٩٧٧٤، جامع الأحاديث، رقم:١٧٦١٥ (٨٠/١٧)، كشف الخفاء، رقم:٣١٠١ (٣٧٠/٢)

الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ، وَاَنْ یَّاْخُذَ عَصَا اَخِیْہِ بِغَیْرِ طِیْبِ نَفْسٍ))(۱)

''کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کوئی مال ناحق طور پر لے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے، اور اس کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے''

ان تمام احادیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ دوسرے کی کوئی چیز لینے یا استعمال کرنے کے لئے اس کا خوشی سے راضی ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی وقت حالات سے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی شخص نے اپنی ملکیت استعمال کرنے کی اجازت کسی دباؤ کے تحت یا شرما شرمی میں دیدی ہے اور وہ دل سے اس پر راضی نہیں ہے تو ایسی اجازت کو اجازت نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اس کا استعمال بھی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ نہ جانے کتنے شعبوں میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان احکام کی خلاف ورزی کررہے ہیں، ہم چوری اور غصب بس یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں چھپ کر داخل ہو اور اس کا سامان چرائے، یا طاقت کا باقاعدہ استعمال کر کے اس کا مال چھینے، حالانکہ کسی کی مرضی کے خلاف اس کی ملکیت کا استعمال کسی بھی صورت میں ہو، وہ چوری یا غصب کے گناہ میں داخل ہے۔ اس قسم کی چوری اور غصب کی جو مختلف صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بظاہر مہذب افراد بھی ان میں مبتلا ہیں، ان کا شمار مشکل ہے، تاہم مثال کے طور پر اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

(۱) ایک صورت تو وہی ہے جس کی طرف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ واقعے میں ارشاد کیا گیا ہے، آج یہ بات بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ ہم اپنا سامان ریل یا جہاز میں کرایہ دیئے بغیر نکال لائے، حالانکہ اگر یہ کام متعلقہ افسروں کی آنکھ بچا کر کیا گیا تو اس میں اور چوری میں کوئی فرق نہیں، اور اگر ان کی رضامندی سے کیا گیا، جبکہ وہ اجازت دینے کے مجاز نہ تھے، تو ان کا بھی اس گناہ میں شریک ہونا لازم آیا، ہاں اگر کسی افسر کو ریلوے یا ایئر لائنز کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ زیادہ سامان بغیر کرائے کے چھوڑ دے تو بات دوسری ہے۔

(۲) ٹیلی فون ایکسچینج کے کسی ملازم سے دوستی گانٹھ کر دوسرے شہروں میں فون پر مفت بات چیت نہ

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الزوائد (۱۳۱/۲)

صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں سمجھی جاتی بلکہ اسے اپنے وسیع تعلقات کا ثبوت قرار دیکر فخر یہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی ایک گھٹیا درجے کی چوری ہے اور اس کے گناہ عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۳) بجلی کے سرکاری کھمبے سے کنکشن لیکر مفت بجلی استعمال چوری کی ایک اور قسم ہے، جس کا رواج بھی عام ہوتا جارہا ہے، اور یہ گناہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے۔

(۴) اگر ہم کسی شخص سے اس کی کوئی چیز مانگتے ہیں جبکہ ہمیں غالب گمان یہ ہے کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کر سکے گا، لیکن دینے پر دل سے راضی بھی نہ ہوگا اور دے گا تو محض شرما شرمی اور بادل ناخواستہ دے گا، تو یہ بھی غصب میں داخل ہے اور ایسی چیز کا استعمال حلال نہیں، کیونکہ دینے والے نے خوش دلی کے بجائے وہ چیز دباؤ میں آکر دی ہے۔

(۵) اگر کسی شخص سے کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے مستعار لی گئی اور وعدہ کرلیا گیا کہ فلاں وقت لوٹا دی جائے گی، لیکن وقت پر لوٹانے کے بجائے اسے کسی عذر کے بغیر اپنے استعمال میں باقی رکھا تو اس میں وعدہ خلافی کا بھی گناہ ہے اور اگر وہ مقررہ وقت کے بعد اس کے بعد استعمال پر دل سے راضی نہ ہو تو غصب کا گناہ بھی ہے، یہی حال قرض کا ہے کہ واپسی کی مقررہ تاریخ کے بعد قرض واپس نہ کرنا (جبکہ کوئی شدید عذر نہ ہو) وعدہ خلافی اور غصب دونوں گناہوں کا مجموعہ ہے۔

(۶) اگر کسی شخص سے کوئی مکان، زمین یا دوکان ایک خاص وقت تک کے لئے کرائے پر لی گئی تو وقت گزر جانے کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں رکھنا بھی اسی وعدہ خلافی اور غصب میں داخل ہے۔

(۷) اگر مستعار لی ہوئی چیز کو ایسی بے دردی سے استعمال کیا جائے جس پر مالک راضی نہ ہو تو یہ بھی غصب کی مذکورہ تعریف میں داخل ہے۔ مثلاً کسی بھلے مانس نے اگر اپنی گاڑی دوسرے کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ مال مفت دل بے رحم کا معاملے کرے، اور اسے خراب راستوں پر اس طرح دوڑائے پھرے کہ اس کے کل پرزے پناہ مانگنے لگیں، اگر کسی نے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر طویل فاصلے کی کالیں دیر دیر تک کرتے رہنا یقیناً غصب میں داخل اور حرام ہے۔

(۸) بک اسٹالوں میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ ان میں سے جو

پسند ہوں لوگ انہیں خرید سکیں، پسند کے تعین کے لئے ان کی معمولی ورق گردانی کی بھی عام طور سے اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر بک اسٹال پر کھڑے ہوکر کتابوں، اخبارات یا رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا جائے، جبکہ خریدنے کی نیت نہ ہو تو یہ بھی ان کا غاصبانہ استعمال ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو بے ساختہ قلم پر آ گئیں، مقصد یہ ہے کہ ہم سب ملکر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں چوری اور غصب کے گھٹیا جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں؟



مال میں برکت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا))(۱)

''بیع کرنے والے کو اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہو جائیں، اگر وہ سچ بولیں اور ہر چیز واضح کر دیں تو انہیں ان کی بیع میں برکت دی جاتی ہے اور اگر وہ حقیقت کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان سے برکت کھینچ لی جاتی ہے''

یہاں مقصود دوسرا جملہ ہے:

((فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا))

''اگر وہ سچ بولے اور ساتھ ساتھ حقیقت بتادے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بیع میں برکت ہوتی ہے اور اگر جھوٹ بولے اور عیب چھپائے تو ان کی بیع کی برکت فنا کر دی جاتی ہے، مٹا دی جاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچ بولنے پر برکت ہوتی ہے اور جھوٹ بولنے سے برکت مٹا دی جاتی ہے''

اب مسئلہ ایسا ہو گیا ہے کہ برکت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے، جو قدر و قیمت ہے وہ گنتی کی ہے یعنی جس طرح بھی ہو پیسہ زیادہ آنا چاہئے، برکت کا مفہوم ذہن سے مٹ گیا ہے جانتے ہی نہیں کہ برکت ہوتی کیا ہے۔

برکت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے پاس جو بھی چیز ہے اس کے اندر جو اس کا مقصود یعنی اس کی

☆ انعام الباری (۱۳۵/۶ تا ۱۳۹)، زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے مال میں برکت کے اسلامی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب إذا بين البيعان ولم يكتما ونصحا، رقم: ۱۹۳۷

منفعت ہے وہ بھر پور طریقے سے حاصل ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کے جتنے بھی مال واسباب ہیں ان میں سے کوئی بھی بذات خود راحت پہنچانے والا نہیں ہے۔ مثلاً روپیہ ہے اگر تم بھوک میں کھانا چاہو تو بھوک نہیں مٹا سکتا، کچھ حاصل نہیں ہوگا، پیاس لگی ہے تو وہ پیاس نہیں مٹا سکتے، اس کے اندر بھی بذات خود بھوک مٹانے کی صلاحیت نہیں، اگر بیماری ہو تو بیماری کے اندر ایسی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کہ کھاتے جاؤ اور بھوک نہیں مٹتی، ایسی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کہ پانی پیتے جاؤ اور پیاس نہیں مٹتی۔ تو اصل مقصود راحت ہے، لیکن راحت ان اسباب کا لازمہ نہیں ہے کہ جب بھی پیسے زیادہ ہوں گے تو راحت ضرور ہوگی یا جب بھی مال واسباب زیادہ ہوگا تو راحت ضرور ہوگی، بلکہ راحت تو کسی اور ہی چیز سے آتی ہے وہ چاہے تو ایک روپیہ میں راحت دیدے اور نہ چاہے تو ایک کروڑ میں نہ دے، اس واسطے راحت جو کہ مقصود اصلی ہے اس کا نام برکت ہے، اور یہ محض عطائے الٰہی سے آتی ہے اس کا اسباب کی گنتی سے کوئی تعلق نہیں۔

مثلاً ایک کروڑ پتی ہے جس کی ملیں کھڑی ہوئی ہیں، کاریں ہیں، کارخانے ہیں، مال و دولت ہے، بینک بیلنس ہے، لیکن جب رات کو بستر پر لیٹتا ہے نیند نہیں آتی اور کروٹیں بدلتا رہتا ہے، ائیر کنڈیشن چل رہا ہے نرم وگداز گدا نیچے ہے اور صاحب بہادر کو نیند نہیں آرہی تو یہ مسہری، یہ گدا، یہ ائیر کنڈیشنڈ کمرہ اس کے لئے راحت کا سبب نہیں بن سکے، بے چینی کے عالم میں رات گزاری صبح ڈاکٹر کو بلایا ڈاکٹر گولیاں دیتا ہے کہ یہ کھاؤ تو نیند آئے گی۔

اور اگر مزدور ہے آٹھ گھنٹے کی محنت کر کے پسینے میں شرابور ہو کے اور ساگ سے روٹی کھا کے آٹھ گھنٹے جو بھر پور نیند لی صبح کو جا کر اس نے دم لیا۔ اب بتائیں کہ کس کو راحت حاصل ہوئی؟ حالانکہ وہ کروڑ پتی تھا اور یہ بیچارہ مفلس ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے افلاس میں راحت فرمادی اور اس کروڑ پتی کو راحت نہیں ملی، تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔

آج لوگ اس حقیقت کو فراموش کر گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ گنتی ہونی چاہئے، بینک بیلنس ہونا چاہئے، بینک میں پیسے زیادہ ہونے چاہئیں، یہ پتہ نہیں کہ جس رشوت سے پیسہ کمایا، دھوکہ سے یا جھوٹ سے کمایا، اس کی گنتی تو بہت ہوگئی لیکن اس نے ان کو نفع نہیں پہنچایا اس سے راحت نہیں ملتی۔

مثلاً کما کر لائے معلوم ہوا کہ گھر میں کوئی بیمار ہو گیا ہے تو جو پیسے آئے تھے وہ ڈاکٹروں اور لیبارٹری کی نذر ہو گئے، سونا چاہا تو نیند نہیں آتی، کھانے بیٹھے انواع واقسام کے کھانے مہیا ہیں، انواع واقسام کی نعمتیں موجود ہیں مگر معدہ اس قابل نہیں کہ کوئی چیز کھا سکے۔

ایک عبرتناک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو نواب تھا، نواب ایک ریاست کے سربراہ کو کہتے ہیں، دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں تھی جو اس کے گھر میں موجود نہ ہو مگر ڈاکٹر نے کہہ رکھا تھا کہ آپ کی غذا ایک ہی چیز ہے، ساری عمر اسی پر گزارہ کریں گے، اگر ایسا کریں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مر جائیں گے، اور وہ یہ کہ بکری کا قیمہ ایک ململ کے کپڑے میں رکھ کر اور اس میں پانی ڈال کر اس کو نچوڑو، اب وہ جو پانی نکلا ہے بس آپ وہ پی سکتے ہیں، اگر دنیا کی اور کوئی چیز کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ لہٰذا ساری عمر اسی قیمہ کے پانی پر گزاری، نہ روٹی، نہ گوشت، نہ سبزی، نہ ساگ، نہ دال، نہ اور کچھ کھا سکا۔

تو اب بتائیں وہ کروڑ پتی پن کس کام کا جو آدمی کو ایک وقت میں کھانے کی لذت بھی فراہم نہ کر سکے، یہ وہ مقام ہے جہاں برکت سلب ہوگئی اور یہ برکت پیسوں سے خریدی نہیں جا سکتی کہ بازار میں جاؤ اور برکت خرید لاؤ، اتنے پیسے دو اور خرید لو۔

حصول برکت کا طریقہ

برکت اللہ جل جلالہ کی عطا ہے اور یہ عطا کس بنیاد پر ہوتی ہے، میں نے بتا دیا کہ اگر امانت سے کام کرو گے، دیانت سے کام کرو اور حلال طریقے پر کام کرو گے تو برکت ہوگی، اور اگر حرام طریقے سے کرو گے ناجائز اور دھوکہ بازی سے کرو گے تو برکت سلب ہو جائے گی۔ لہٰذا چاہے تمہاری گنتی میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کا فائدہ تمہیں نہیں حاصل ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصول برکت کے لئے دعا کی تلقین کرنا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی ہے کہ جب کسی کو دعا دو:

((بَارَكَ اللّٰهُ))(۱)

یہ معمولی دعا نہیں ہے۔ یہ بڑی زبردست دعا ہے، اور ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ بھائی مبارک ہو آپ نے مکان بنایا، مبارک ہو آپ نے نکاح کیا، مبارک ہو آپ نے گاڑی خریدی، یعنی ہر چیز میں مبارک کی دعا دیتے ہیں یہ بڑی پیاری دعا ہے، اگر اس کو سوچ سمجھ کر دیا جائے اور لیا جائے

(۱) یہ دعا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دی۔ دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عطا فرمائے''

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز جو آپ کو ملی ہے اس کی برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو، یہ درحقیقت ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چیز کچھ بھی نہیں ہے جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت نہ ڈالی جائے۔ مکان بیشک عالی شان بنالیا لیکن عالی شان مکان کوئی حقیقت نہیں رکھتا، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے برکت عطا نہ ہو اور برکت عطا ہوگی تو اس کو راحت ملے گی، مکان تو ہے مگر مکان کی برکت نہیں ہے تو یہ مکان تمہارے لئے عذاب ہو جائے گا، یہ بڑی کانٹے کی بات ہے دنیا آج گنتی کے پیچھے بھاگ رہی ہے لیکن برکت کو نہیں دیکھتے، اور جب کسی مالدار کو دیکھا کہ اس کے پاس عالی شان کوٹھی ہے، بنگلہ ہے، مل ہے، کار ہے اور کارخانے ہیں تو وہی بات دل میں آتی ہے۔ لیکن تمہیں پتہ نہیں کہ یہ جو ظاہری چمک دمک اور شان وشوکت ہے ذرا اس کے دل میں جھانک کر دیکھو کہ ان تمام اسباب کے جمع کرنے کے باوجود وہ کن اندھیروں میں گرفتار ہے۔

ظاہری چمک دمک پر نہیں جانا چاہئے

میرے پاس پچاسیوں بڑے بڑے سرمایہ دار دولت مند آتے رہتے ہیں ایسے ایسے لوگ آتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر آدمی یہی کہے کہ کاش مجھے ایسی دولت مل جائے لیکن جب وہ اپنے دکھڑے بیان کرتے ہیں کہ وہ کن دکھوں میں مبتلا ہیں تو واقعی مجھے عبرت ہوتی ہے کہ اس مال ہی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عذاب بنا رکھا ہے۔

میرے پاس اکثر ایک خاتون مسئلہ وغیرہ پوچھنے کے لئے آتی رہتی ہیں، ان کے شوہر کے لئے ارب پتی کا لفظ بھی کم ہے اور اس عورت کو جب دوسری عورتیں دیکھتی ہیں کہ کیسا لباس پہنی ہوئی ہے، کیسی گاڑی میں آرہی ہے، کیسے مکان میں رہ رہی ہے تو ان کی آنکھیں چکا چوند ہوتی ہیں کہ کیسی زبردست عورت ہے۔ لیکن وہ جو آکر میرے سامنے بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ دولت نکال دے اور مجھے وہ سکون نصیب ہو جائے کہ جو ایک جھونپڑی والے کو حاصل ہوتا ہے، دیکھنے والے تو اس کی چکا چوند دیکھ رہے ہیں لیکن میرے سوا یا اس کے سوا کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے، اس واسطے کبھی یہ ظاہری شان وشوکت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے چکر میں مت آؤ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دل کا سکون عطا فرمائے، وہ راحت عطا فرمائے جسے برکت کہتے ہیں۔

ظاہری چمک دمک والوں کے لئے عبرتناک واقعہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک غریب آدمی تھا وہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ کے پاس گیا اور جا کر ان سے کہا کہ حضرت میرے لئے دعا فرمادیجئے کہ میں بھی دولت مند ہوجاؤں مشکلوں میں گرفتار ہوں اور دل یوں چاہتا ہے کہ بس سب سے امیر ترین ہوجاؤں۔ پہلے تو انہوں نے سمجھایا کہ کس چکر میں پڑ گئے ہو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو لیکن وہ نہ مانا، تو بزرگ نے کہا کہ تم یہاں شہر میں کوئی دولت مند آدمی تلاش کرو جو بہت ہی امیر ترین ہو تو اس کا مجھے بتادینا میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا بنادے۔ اس نے شہر میں چکر لگا کر ایک سنار کو منتخب کیا جس کی دوکان زیورات سے بھری ہوئی تھی، پانچ چھ لڑکے ایک سے ایک خوبصورت ہیں اور کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، ہنسی مذاق ہو رہا ہے، کھانے پینے کا ساز وسامان ہے، سب کچھ ہے غرض دنیا کی ساری نعمت ہے، اس نے کہا کہ بس یہی ہے۔

چنانچہ غریب آدمی نے حاضر ہوکر عرض کیا'' حضرت! میں دیکھ کر آیا ہوں، ایک سنار بہت اعلیٰ درجہ کا ہے دعا کردیجئے کہ ایسا ہوجاؤں''

بزرگ نے حتی الامکان سمجھایا کہ پہلے معلومات کرلو پھر دعا کردوں گا۔

بزرگ نے کہا'' بھائی ظاہری حالت تو دیکھ آئے ہو کسی وقت تنہائی میں اس سے پوچھ لو کہ تم خوش ہو کہ نہیں؟''

تو یہ شخص ان بزرگ کے کہنے پر پھر گیا اور سنار سے تنہائی کا وقت لیا اور اس سے پوچھا کہ بھائی تمہاری دوکان دیکھی ہے بڑی شان دار ہے یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی جو کہ بڑی قابل رشک معلوم ہوتی ہے کیسے گزرتی ہے؟

سنار نے کہا'' میاں کس چکر میں پڑے ہو، میں تو اس روئے زمین پر ایسا مصیبت زدہ شخص ہوں کہ زمین پر مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص مصیبت زدہ ہو ہی نہیں سکتا، بات دراصل یہ ہے کہ میں یہ سونے کا کاروبار کرتا تھا اور اس میں خوب آمدنی تھی، بیوی بیمار ہوگئی بہت علاج کرایا صحیح نہیں ہوئی، پریشانی رہی آخر میں بیوی بالکل مایوس ہوگئی، مجھے بیوی سے بہت محبت تھی بیماری کے عالم میں بیوی مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے تو یہ خیال ہے کہ جب میں مرجاؤں گی تو تم دوسری شادی کرلو گے اور مجھے بھول جاؤ گے، میں نے کہا کہ نہیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوسری شادی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ کوئی یقین دلاؤ میں نے کہا کہ میں قسم کھانے کو تیار ہوں، کہا کہ قسم کا مجھے بھروسہ نہیں آخر کار اس کو یقین

دلانے کی خاطر میں نے اپنا عضو تناسل کاٹ دیا، اس کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ تندرست ہوگئی مگر میں قوت مردانہ سے محروم ہو چکا تھا ایک عرصہ اس طرح گزارہ وہ بھی آخر جوان تھی تو اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ اس نے جب یہ دیکھا کہ شوہر کے ساتھ تو کوئی راستہ اب ہے نہیں تو اس نے گناہ کا راستہ اختیار کرنا شروع کیا اور یہ جو خوبصورت بچے دوکان میں نظر آرہے ہیں ناجائز اولاد ہے، میں دیکھتا رہتا ہوں اور کڑھتا ہوں، ساری زندگی میری اس گھٹن میں گزر رہی ہے تو مجھ سے زیادہ تو کوئی مغموم اس دنیا میں ملے گا نہیں''

لہٰذا یہ جتنے چمک دمک والے نظر آتے ہیں ان کی زندگیوں کے اندر جھانک کر دیکھو تو پتہ لگے گا کہ کیا اندھیرے ہیں۔ لہٰذا اللہ سے مانگنے کی چیز صرف عافیت ہے اور راحت ہے۔ اللہ تعالیٰ عافیت اور راحت عطا فرمائے جو کچھ عطا فرمائے اس میں برکت عطا فرمائے۔

اب دیکھیں حدیث میں ہر جگہ جہاں بھی دیکھیں گے بار بار یہ دعا ہے:

((بَارِكْ لَنَا فِيمَا أَعْطَيْتَنَا)) (۱)

لیکن اس کی قدر و قیمت آج دنیا سے مٹ گئی ہے اور گنتی کی ہوگئی ہے، ہمارے پیسے زیادہ ہونے چاہئیں حالانکہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اصل چیز کو دیکھو وہ برکت ہے۔



(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء في القنوت في الوتر، رقم: ٤٢٥، سنن النسائي، کتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب الدعاء في الوتر، رقم: ١٧٢٥، سنن أبي داؤد، کتاب الصلاة، باب القنوت في الوتر، رقم: ١٢١٤، سنن ابن ماجه، کتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في القنوت في الوتر، رقم: ١١٦٨، مسند أحمد، رقم: ١٦٢٥

رشوت کا گناہ

شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے ☆

بعض برائیاں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی رائے مختلف ہوسکتی ہے ایک شخص کے نزدیک وہ برائی ہے، اور دوسرا اسے کوئی عیب نہیں سمجھتا، لیکن رشوت ایسی برائی ہے جس کے برا ہونے پر ساری دنیا متفق ہے کوئی مذہب وملت کوئی مکتب فکر یا انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ملے گا جو رشوت کو بدترین گناہ یا جرم نہ سمجھتا ہو، حد یہ ہے کہ جو لوگ دن کے وقت دفتروں میں بیٹھ کر دھڑلے سے رشوت کا لین دین کرتے ہیں وہ بھی جب شام کو کسی محفل میں معاشرے کی خرابیوں پر تبصرہ کریں تو ان کی زبان پر سب سے پہلے رشوت کی گرم بازاری ہی کا شکوہ آئے گا اور اس کی تائید میں وہ (اپنے نہیں) اپنے رفقائے کار کے دو چار واقعات سنا دیں گے، سننے والے یا تو ان واقعات پر ہنسی مذاق میں کچھ فقرے چست کر دیں گے یا پھر کوئی بہت سنجیدہ محفل ہوئی تو اس میں غم وغصہ کا اظہار کیا جائے گا لیکن اگلی ہی صبح یہی شرکائے مجلس پورے اطمینان کے ساتھ اسی کاروبار میں مشغول ہو جائیں گے۔

غرض رشوت کی خرابیوں سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود کوئی شخص جو اس انسانیت سوز حرکت کا عادی ہو چکا ہے وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نظر نہیں آتا، اور اگر اس بارے میں کسی سے کچھ کہا جائے تو مختصر سا جواب یہ ہے کہ ساری دنیا رشوت لے رہی ہے تو ہم کیا کریں؟ گویا ان کے نزدیک رشوت چھوڑنے کی شرط یہ ہے کہ پہلے دوسرے تمام لوگ اس برائی سے تائب ہو جائیں تب ہی چھوڑنے پر غور کر سکتا ہوں اسکے بغیر نہیں، اور چونکہ رشوت لینے والے کے پاس یہی بہانہ ہے لہٰذا یہ تباہ کن بیماری ایک وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے، فرق یہ ہے کہ جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو وہاں کوئی مریض یہ استدلال نہیں کرتا کہ جب تک تمام دوسرے لوگ تندرست نہ ہو جائیں میں بھی صحت کی تدابیر نہیں کروں گا، لیکن رشوت کے بارے میں یہ استدلال ناقابل تردید سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی استدلال نہیں ایک بہانہ ہے اور بات صرف یہ ہے کہ رشوت لینے والے کو اپنے اس عمل میں فوری طور سے مالی فائدہ ہوتا نظر آتا ہے اس لئے نفس اس فائدے کو حاصل کرنے

☆ فرد کی اصلاح، ص: ۹۷

کے لئے ہزار حیلے بہانے تراش لیتا ہے، لیکن آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ رشوت لینے میں واقعتاً کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں؟ بظاہر تو رشوت لینے میں یہ کھلا فائدہ نظر آتا ہے کہ ایک شخص کی آمدنی کسی زائد محنت کے بغیر بڑھتی جاتی ہے، لیکن اگر ذرا باریک بینی سے کام لیا جائے تو اس وقتی فائدے کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ایک ٹائیفائڈ میں مبتلا بچے کو چٹ پٹی غذاؤں میں بڑا لطف آتا ہے لیکن بچے کے ماں باپ یا اس کے معالج جانتے ہیں کہ یہ چند لمحوں کا فائدہ نہ صرف اس کی تندرستی کو دور سے دور تر کردے گا بلکہ انجام کار اسے زیادہ طویل عرصہ تک لذیذ غذاؤں سے محروم ہوجانا پڑے گا۔

یہ مثال صرف رشوت کے اخروی نقصانات پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو رشوت کے دنیوی نقصانات کے بارے میں بھی اتنی ہی سچی ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب معاشرے میں یہ لعنت پھیل جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی ایک جگہ سے کوئی رشوت وصول کرتا ہے تو اسے دسیوں جگہ خود رشوت دینی پڑتی ہے، بظاہر تو وہ ممکن ہے کہ اسے آج سو روپے زیادہ ہاتھ آ گئے، لیکن کل جب اسے خود دوسرے لوگوں سے کام پڑے گا تو یہ سو روپے نہ جانے کتنے سو ہوکر خود اس کی جیب سے نکل جائیں گے۔

پھر رشوت کا یہ نقد نقصان کیا کم ہے کہ اس کی بدولت پورا معاشرہ بدامنی اور بے چینی کا جہنم بن جاتا ہے کیونکہ کسی بھی ملک میں باشندوں کے امن وسکون کی سب سے بڑی ضمانت اس ملک کا قانون اور اس قانون کے محافظ ادارے ہی ہوسکتے ہیں، لیکن جس جگہ رشوت کا بازار گرم ہو وہاں بہتر سے بہتر قانون بھی بالکل مفلوج اور ناکارہ ہوکر رہ جاتا ہے۔

آج جب ہم معاشرے کی بدامنی کو ختم کرنے کے لئے کوئی قانون بنانے بیٹھتے ہیں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ اس قانون کو رشوت کے زہر سے کیسے بچایا جائے؟ چوری، ڈاکے، قتل، اغوا، بدکاری اور دھوکے فریب کے انسانیت کش حادثات سے آج ہر شخص سہما ہوا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتا کہ ان حادثات کے روز افزوں ہونے کا سبب اور حقیقت وہ رشوت ہے جو ہر اچھے سے اچھے قانون کو چند نوٹوں کے عوض بیچ کر اس کی ساری افادیت کو خاک میں ملا دیتی ہے اور جسے ہم نے اپنے روزمرہ کے طرز عمل سے شیر مادر بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہم نے اگر کسی مجرم سے رشوت لیکر اسے قانون کی گرفت سے بچالیا ہے تو درحقیقت ہم نے جرم کی اہمیت قانون کے احترام اور سزا کی ہیبت کو دلوں سے نکالنے میں مدد دی ہے، اور ان مجرموں کا حوصلہ بڑھایا ہے جو کل خود ہمارے گھر پر ڈاکہ ڈال سکتے ہیں۔

ایک سرکاری افسر کسی سرکاری ٹھیکہ دار سے رشوت لیکر اس کے ناقص تعمیری کام کو منظور کرادیتا

ہے اور مگن ہے کہ آج آمدنی زیادہ ہوگئی، لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ جس ناقص پل کی تعمیر پر اس نے صاد کرادیا ہے کل جب گرے گا تو اس کی زد میں خود وہ اور اس کے بچے بھی آ سکتے ہیں، جس ناقص مال کی بنی ہوئی سڑک اس نے منظور کرادی ہے وہ ہزار ہا دوسرے افراد کی طرح خود اس کے لئے بھی عذاب جان بنے گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں رشوت کے عام لین دین سے ہم نے سرکاری خزانے کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا بار کوئی حکمراں ہی نہیں اٹھائے گا بلکہ اس کے نتائج زائد ٹیکسوں کی شکل میں ملک کے تمام باشندوں کو بھگتنے پڑیں گے جن میں ہم خود بھی داخل ہیں، اس سے ملک میں گرانی بھی پیدا ہوگی، خزانہ بھی کمزور پڑے گا، ملک کے ترقیاتی کام بھی رکیں گے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی منزل بھی دور ہوگی، اور دوسری اقوام ہمیں بدستور لقمہ تر سمجھتی رہیں گی۔

یہ تو چند سرسری سی مثالیں تھیں، لیکن اگر ہم ذرا اس رخ سے مزید سوچیں تو اندازہ ہوگا کہ رشوت کے لین دین کی بدولت ہم خود دنیا میں مستقل طور پر کن پیچیدہ مصائب اور سنگین مشکلات میں مبتلا ہوگئے ہیں؟

رشوت کے یہ دنیوی نقصانات تو اجتماعی نوعیت کے ہیں اور بالکل سامنے کے ہیں، لیکن اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو خاص رشوت لینے والے کی انفرادی زندگی بھی رشوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہتی، حدیث میں ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ وَالرَّائِشَ يَعْنِيْ الَّذِيْ يَمْشِيْ بَيْنَهُمَا))(۱)

"رسول کریم ﷺ نے لعنت بھیجی ہے رشوت دینے والے پر بھی، رشوت لینے والے پر بھی اور رشوت کے دلال پر بھی"

جس ذات اقدس ﷺ نے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کی ہو اس ذات اقدس کا کسی شخص پر لعنت بھیجنا معمولی بات نہیں، اس کا اثر آخرت میں ظاہر ہوگا ہی لیکن دنیا میں بھی یہ لوگ اس لعنت کے اثر سے بچ نہیں سکتے، چنانچہ جو لوگ معاشرے کو تباہی کے راستے پر ڈال کر حق داروں کا

(۱) سنن الترمذی، کتاب الاحکام عن رسول اللہ، باب ماجاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم، رقم: ۱۲۵۶، سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیة، باب فی کراهیة الرشوة، رقم: ۳۱۰۹، سنن ابن ماجه، کتاب الاحکام، باب التغليظ فی الحیف والرشوة، رقم: ۲۳۰٤، مسند احمد، رقم: ٦٢٤٦

دل دکھا کر غریبوں کا حق چھین کر اور ملت کی کشتی میں سوراخ کر کے رشوت لیتے ہیں، بظاہر ان کی آمدنی میں خواہ کتنا اضافہ ہو جاتا ہو لیکن خوشحالی اور راحت و آسائش روپے پیسے کے ڈھیر، عالی شان کوٹھیوں، شاندار کاروں اور اپ ٹو ڈیٹ فرنیچر کا نام نہیں ہے بلکہ دل کے اس سکون، روح کے اس اقرار اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جسے کسی بازار سے کوئی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی نہیں خریدا جاسکتا، یہ صرف اور صرف اللہ کی دین ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو یہ دولت دیتا ہے تو ٹوٹے جھونپڑے، کھجور کی چٹائی اور ساگ کی روٹی میں بھی دے دیتا ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو شاندار بنگلوں، کاروں اور کارخانوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

آج اگر آپ کو رشوت کے ذریعے کچھ زائد آمدنی ہوگئی ہے لیکن ساتھ ہی کوئی بچہ بیمار پڑ گیا ہے تو کیا یہ زائد آمدنی آپ کو کوئی سکون دے سکے گی؟ آپ کی ماہانہ آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے لیکن اگر اسی تناسب سے گھر میں ڈاکٹر اور دوائیں آنے لگی ہیں تو آپ کو کیا ملا؟ اور اگر فرض کیجئے کہ کسی نے رشوت کے روپے سے تجوریاں بھر بھی لیں، لیکن اولاد نے باغی ہوکر زندگی اجیرن بنادی، داماد نے جینا دوبھر کردیا، یا اسی قسم کی کوئی اور پریشانی کھڑی ہوگئی تو کیا یہ ساری آمدنی اسے کوئی راحت پہنچا سکے گی؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ اور رسول کے احکام سے باغی ہوکر روپیہ تو جمع کرسکتا ہے لیکن اس روپے کے ذریعے راحت وسکون حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں، عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت پریشانیوں اور آفتوں کا ایسا چکر لیکر آتی ہے جو عمر بھر انسان کو گردش میں رکھتا ہے۔

قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں بتایا کہ ''جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً'' کھاتے ہیں وہ ایسے مصائب کا شکار کردیئے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں لذیذ سے لذیذ غذا بھی آگ معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا رشوت خوروں کے اونچے مکان اور شاندار اسباب دیکھ کر اس دھوکے میں نہ آنا چاہیے کہ انہوں نے رشوت سے خوش حالی حاصل کرلی، بلکہ ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر افراد کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ حرام سے اجتناب کر کے اللہ کے دیئے ہوئے حلال رزق پر قناعت کرتے ہیں، ابتداء میں انہیں کچھ مشکلات پیش آسکتی ہیں لیکن مآل کار دنیا میں بھی وہی فائدے میں رہتے ہیں، ان کی تھوڑی آمدنی میں بھی زیادہ کام نکلتے ہیں، ان کے اوقات اور کاموں میں بھی

برکت ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دل کے سکون اور ضمیر کے اطمینان کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

اوپر رشوت کے جو نقصان بیان کئے گئے وہ تمام تر دنیوی نقصانات تھے، اور اس لعنت کا سب سے بڑا نقصان آخرت کا نقصان ہے، دنیا میں اور ہزار چیزوں میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس بارے میں کسی مذہب اور کسی مکتبِ فکر کا اختلاف نہیں کہ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت ضرور آئے گی، اگر بالفرض رشوتیں لیکر کسی شخص نے چند روز مزے اڑا بھی لئے تو بالآخر اس کا انجام سرکارِ دو عالم ﷺ کے الفاظ میں یہ ہے:

''رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں ہوں گے'' (۱)

اور اس لحاظ سے رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ شراب نوشی اور بدکاری سے اگر کوئی شخص صدق دل کے ساتھ توبہ کرلے تو وہ اسی لمحے معاف ہوسکتا ہے لیکن رشوت کا تعلق چونکہ حقوق العباد سے ہے اس لئے جب تک ایک ایک حقدار کو اس کی رقم نہ چکائے یا اس سے معافی نہ مانگے اس گناہ کی معافی کا کوئی راستہ نہیں۔ عام طور سے جب انسان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اسے اپنی آخرت کی فکر لاحق ہو ہی جاتی ہے، اگر اس وقت عارضی دنیوی مفاد کے لالچ میں ہم یہ گناہ کرتے رہے تو یقین رکھئے کہ موت سے پہلے ہی جب آخرت کی منزل سامنے ہوگی تو یہ اعمال دنیا کے ہر آرام وراحت کو مستقل عذاب جان بنا کر رکھ دیں گے اور اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر تنہا میں نے رشوت ترک کردی تو اس سے پورے معاشرے پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن یہی وہ شیطان کا دھوکہ ہے جو معاشرے سے اس لعنت کے خاتمے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب ہر شخص دوسرے کا انتظار کرے گا تو معاشرہ کبھی اس لعنت سے پاک نہ ہوسکے گا۔ آپ رشوت کو ترک کرکے کم از کم خود اس کے دنیا اور آخرت کے نقصانات سے محفوظ ہوسکیں گے، اس کے بعد آپ کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ بنے گی، کیا بعید ہے کہ آپ کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس لعنت سے تائب ہوجائیں، تاریکی میں ایک چراغ جل اٹھے تو پھر چراغ سے

(۱) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ((الراشی والمرتشی فی النار)) المعجم الأوسط، رقم:۲۰۲٦ (۲/۲۹۵) المعجم الصغیر، رقم:۵۸ (۱/۵۷)، مسند البزار، رقم:۱۰۳۷ (۳/۲٤۷)، المطالب العالیہ، رقم:۲۱۸۵ (۱۰/۱۸۷)، مجمع الزوائد (٤/۱۹۸)، عام طور پر اس حدیث کے یہ الفاظ مشہور ہیں: ((الراشی والمرتشی کلاھما فی النار)) تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں ''کلاھما'' کا لفظ موجود نہیں۔

چراغ جلنے کا سلسلہ اتنا دراز ہوسکتا ہے کہ اس سے پورا ماحول بقعۂ نور بن جائے، پھر جب کوئی شخص اللہ کے لئے اپنے نفس کے کسی تقاضے کو چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے، دور دور سے ایک کام کو مشکل سمجھنے کے بجائے اسے کر کے دیکھئے، اللہ تعالیٰ سے اس کی آسانی کی دعا مانگئے۔ انشاء اللہ اس کی مدد ہوگی ضرور ہوگی بالضرور ہوگی۔

کیا عجب ہے کہ معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو منتخب کیا ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ



آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِo بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍo يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَo﴾ (۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج کا یہ اجتماع اسلام کے ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ کے موضوع پر منعقد کیا گیا ہے، اور رمضان کے مبارک مہینے سے چند روز پہلے یہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ رمضان المبارک کے مہینے میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کی اہمیت، اس کے فضائل اور اس کے ضروری احکام اس اجتماع کے ذریعہ ہمارے علم میں آجائیں تاکہ اس کے مطابق زکوٰۃ نکالنے کا اہتمام کریں۔

زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید

اس مقصد کے لئے میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو اپنے مال کی کما حقہ زکوٰۃ نہیں نکالتے، ان کے لئے بڑے سخت الفاظ میں عذاب کی خبر دی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تو اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔ یعنی جو لوگ اپنا پیسہ، اپنا روپیہ، اپنا سونا چاندی جمع کرتے جارہے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان پر اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا ہے اس کو ادا نہیں کرتے، ان کو یہ خوشخبری سنادیجئے کہ ایک دردناک عذاب ان کا انتظار کررہا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس دردناک عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جس دن اس سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اس آدمی کی

☆ آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟ رسالہ مطبوعہ ''مرکز الاقتصاد الإسلامی'' کراچی

(۱) التوبة: ۳۴-۳۵

پیشانی، اس کے پہلو اور اس کی پشت کو داغا جائے گا اور اس کو یہ کہا جائے گا:

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾

''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، آج تم خزانے کا مزہ چکھو جو تم اپنے لئے جمع کر رہے تھے''

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس انجام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو روپیہ پیسہ جمع کر رہے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کیے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک بجا نہیں لاتے۔ صرف ان آیات میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں، چنانچہ سورۃ ہمزہ میں فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝﴾(۱)

(۱) الهمزة: ۱۔۷

اس شخص کے لئے دردناک عذاب ہے جو عیب نکالنے والا ہے اور طعنہ دینے والا ہے، جو مال جمع کر رہا ہے اور گن گن کر رکھ رہا ہے (ہر روز گنتا ہے کہ آج میرے مال میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے اور اس کی گنتی کر کے خوش ہو رہا ہے) اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے گا، ہرگز نہیں۔ (یاد رکھو! یہ مال جس کو وہ گن گن کر رکھ رہا ہے اور اس پر جو واجبات ہیں ان کو ادا نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ سے) اس کو روندنے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہیں کیا پتہ کہ ''حطمۃ'' کیا چیز ہوتی ہے؟ (یہ حطمۃ جس میں اس کو ڈالا جائے گا) یہ ایسی آگ ہے جو اللہ کی سلگائی ہوئی ہے (یہ کسی انسان کی سلگائی ہوئی آگ نہیں ہے جو پانی سے بجھ جائے یا مٹی سے بجھ جائے یا جس کو فائر بریگیڈ بجھا دے بلکہ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے) جو انسان کے قلب و جگر تک جھانکتی ہوگی (یعنی انسان کے قلب و جگر تک پہنچ جائے گی)

اتنی شدید وعید اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

یہ مال کہاں سے آ رہا ہے؟

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر ایسی شدید وعید کیوں بیان فرمائی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تم اس دنیا میں حاصل کرتے ہو، چاہے تجارت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے ملازمت کے ذریعہ حاصل

کرتے ہو، چاہے کاشت کاری کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ وہ مال کہاں سے آرہا ہے؟ کیا تمہارے اندر طاقت تھی کہ تم اپنے زورِ بازو سے وہ مال جمع کرسکتے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا حکیمانہ نظام ہے، وہ اپنے اس نظام کے ذریعہ تمہیں رزق پہنچارہا ہے۔

گاہک کون بھیج رہا ہے؟

تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے مال جمع کرلیا اور دکان کھول کر بیٹھ گیا اور اس مال کو فروخت کردیا تو اس کے نتیجے میں مجھے پیسہ مل گیا، یہ نہ دیکھا کہ جب دکان کھول کر بیٹھ گئے تو تمہارے پاس گاہک کس نے بھیجا؟ اگر تم دکان کھول کر بیٹھے ہوتے اور کوئی گاہک نہ آتا تو اس وقت کوئی بکری ہوتی؟ کوئی آمدنی ہوتی؟ یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کی حاجتیں، ایک دوسرے کی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے دل میں ڈال دیا کہ تم جاکر دکان کھول کر بیٹھو اور دوسرے کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اس دکان والے سے خریدو۔

ایک سبق آموز واقعہ

میرے ایک بڑے بھائی تھے جناب محمد ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، آمین، لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی ایک دکان ''ادارۂ اسلامیات'' کے نام سے تھی، اب بھی وہ دکان موجود ہے، وہ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ تجارت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور قدرت کے عجیب کرشمے دکھلاتا ہے، ایک دن میں صبح بیدار ہوا تو پورے شہر میں موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور بازاروں میں کئی کئی انچ پانی کھڑا تھا، میرے دل میں خیال آیا کہ آج بارش کا دن ہے، لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر رہے ہیں، سڑکوں پر پانی کھڑا ہے، ایسے حالات میں کون کتاب خریدنے آئے گا اور کتاب بھی کوئی دنیاوی یا کورس اور نصاب کی نہیں بلکہ دینی کتاب جس کے بارے میں ہمارا حال یہ ہے کہ جب دنیا کی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں تب جاکر یہ خیال آتا ہے کہ چلو کوئی دینی کتاب خرید کر پڑھ لیں، ان کتابوں سے نہ تو بھوک مٹتی ہے نہ پیاس بجھتی ہے نہ اس سے کوئی دنیا کی ضرورت پوری ہوتی ہے، اور آج کل کے حساب سے دینی کتاب ایک فالتو مد ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ فالتو وقت ملے گا تو دینی کتاب پڑھ لیں گے۔ تو ایسی موسلا دھار بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا، لہٰذا آج دکان پر نہ جاؤں اور چھٹی کرلیتا ہوں۔

لیکن چونکہ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اُٹھائی تھی، فرمانے لگے کہ اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں دوسرا خیال یہ آیا کہ ٹھیک ہے کوئی شخص کتاب خریدنے آئے یا نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لئے رزق کا یہ ذریعہ مقرر فرمایا ہے، اب میرا کام یہ ہے کہ میں جاؤں، جا کر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاہک بھیجنا میرا کام نہیں، کسی اور کا کام ہے، لہٰذا مجھے اپنے کام میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، چاہے بارش ہو رہی ہو یا سیلاب آرہا ہو، مجھے اپنی دکان کھولنی چاہئے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چھتری اُٹھائی اور پانی سے گزرتا ہوا چلا گیا اور بازار جا کر دکان کھول کر بیٹھ گیا اور یہ سوچا کہ آج کوئی گاہک تو آئے گا نہیں، چلو بیٹھ کر تلاوت ہی کر لیں، چنانچہ ابھی میں قرآن شریف کھول کر تلاوت کرنے بیٹھا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ برساتیاں ڈال کر اور چھتریاں تان کر کتابیں خریدنے آرہے ہیں، میں حیران تھا کہ ان لوگوں کو ایسی کونسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اس طوفانی بارش میں اور بہتے ہوئے سیلاب میں میرے پاس آکر ایسی کتابیں خرید رہے ہیں جن کی کوئی فوری ضرورت نہیں۔ لیکن لوگ آئے اور جتنی بکری روزانہ ہوتی تھی اس دن بھی اتنی بکری ہوئی۔ اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ یہ گاہک خود نہیں آرہے ہیں، حقیقت میں کوئی اور بھیج رہا ہے، اور یہ اس لئے بھیج رہا ہے کہ اس نے میرے لئے رزق کا سامان ان گاہک کو بنایا ہے۔

کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

بہرحال، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا بنایا ہوا نظام ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے، جو گاہک کے دل میں ڈال رہا ہے کہ تم اس دکان سے جا کر سامان خریدو۔ کیا کسی شخص نے یہ کانفرنس بلائی تھی اور اس کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا فروخت کریں گے، اتنے لوگ جوتے فروخت کریں گے، اتنے لوگ چاول فروخت کریں گے، اتنے لوگ برتن فروخت کریں گے، اور اس طرح لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ دنیا میں ایسی کوئی کانفرنس آج تک نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم کپڑا فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم جوتے فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم روٹی فروخت کرو، کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم گوشت فروخت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو بازار میں نہ ملتی ہو۔ دوسری طرف خریداروں کے دل میں یہ ڈالا کہ تم جا کر ان سے ضروریات خریدو اور ان کے لئے رزق کا سامان فراہم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس طرح سے رزق عطا کر رہا ہے۔

زمین سے اُگانے والا کون ہے؟

خواہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زراعت کو دیکھئے! زراعت میں آدمی کا کام یہ ہے کہ زمین کو نرم کر کے اس میں بیج ڈال دے اور اس میں پانی دیدے، لیکن اس بیج کو کونپل بنانا، وہ بیج جو بالکل بے حقیقت ہے، جو گنتی میں بھی نہ آئے، جو بے وزن ہے، لیکن اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے اور کونپل بن جاتا ہے، پھر وہ کونپل بھی ایسی نرم اور نازک ہوتی ہے کہ اگر بچہ بھی اس کو اُنگلی سے مسل دے تو وہ ختم ہو جائے، لیکن وہی کونپل سارے موسموں کی سختیاں برداشت کرتی ہے، گرم اور سرد اور تیز ہواؤں کو سہتی ہے، پھر کونپل سے پودا بنتا ہے، پھر اس پودے سے پھول نکلتے ہیں، پھول سے پھل بنتے ہیں اور اس طرح وہ ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچ جاتا ہے، کون ذات ہے جو یہ کام کر رہی ہے؟ اللہ جل شانہ ہی یہ سارے کام کرنے والے ہیں۔

انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں

لہٰذا آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ ہو، چاہے وہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، حقیقت میں تو انسان ایک محدود کام کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے، بس انسان وہ محدود کام کر دیتا ہے لیکن اس محدود کام کے اندر کسی چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جل شانہ ہیں جو ضرورت کی اشیاء پیدا کرتے ہیں اور تمہیں عطا کرتے ہیں، لہٰذا جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب اسی کی عطا ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱)

''زمین وآسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے''

مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیز تمہیں عطا کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ چلو تم ہی اس کے مالک ہو۔ چنانچہ سورۃ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ﴾ (۲)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنادیئے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے، پھر وہ ان کے مالک ہیں''

(۱) البقرہ: ۲۸۴ (۲) یٰسٓ: ۷۱

مالک حقیقی تو ہم تھے، ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ تو حقیقت میں وہ مال جو تمہارے پاس آیا ہے اس میں سب سے بڑا حق تو ہمارا ہے، جب ہمارا حق ہے تو پھر اس میں سے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرو، اگر اس کے حکم کے مطابق خرچ کرو گے تو باقی جتنا مال تمہارے پاس ہے وہ تمہارے لئے حلال اور طیب ہے، وہ مال اللہ کا فضل ہے، اللہ کی نعمت ہے، وہ مال برکت والا ہے۔ اور اگر تم نے اس مال میں سے وہ چیز نہ نکالی جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کی ہے تو پھر یہ سارا مال تمہارے لئے آگ کے انگارے ہیں اور قیامت کے دن ان انگاروں کو دیکھ لو گے جب ان انگاروں سے تمہارے جسموں کو داغا جائے گا اور تم سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جس کو تم جمع کیا کرتے تھے۔

صرف اڑھائی فیصد ادا کرو

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ یہ مال ہماری عطا کی ہوئی چیز ہے، لہٰذا اس میں سے ڈھائی فیصد تم رکھو اور ساڑھے ستانوے فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کر دو تو بھی انصاف کے خلاف نہیں تھا، کیونکہ یہ سارا مال اسی کا دیا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر فضل فرمایا اور یہ فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو اور تمہیں اس مال کی ضرورت ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت اس مال کی طرف راغب ہے، لہٰذا چلو اس مال میں سے ساڑھے ستانوے فیصد تمہارا، صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ ہے، جب یہ ڈھائی فیصد اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تو باقی ساڑھے ستانوے فیصد تمہارے لئے حلال ہے اور طیب ہے اور برکت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا معمولی مطالبہ کر کے سارا مال ہمارے حوالے کر دیا کہ اس کو جس طرح چاہو اپنی جائز ضروریات میں خرچ کرو۔

زکوٰۃ کی تاکید

یہ ڈھائی فیصد زکوٰۃ ہے، یہ وہ زکوٰۃ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں بار بار ارشاد فرمایا:

﴿وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۳)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

جہاں نماز کا ذکر فرمایا ہے وہاں ساتھ میں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید وارد ہوئی ہے۔ جب اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید ہے اور دوسری طرف اللہ جل شانہ نے اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ ہمیں مال عطا کیا اور اس کا مالک بنایا اور پھر صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ کیا تو مسلمان کم از کم اتنا

---

(۳) البقرة: ۴۳

کرلے کہ وہ ڈھائی فیصد ٹھیک ٹھیک اللہ کے مطالبے کے مطابق ادا کردے تو اس پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

زکوٰۃ حساب کرکے نکالو

بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو زکوٰۃ سے بالکل بے پرواہ ہیں، العیاذ باللہ، وہ تو زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں ہیں۔ ان کی سوچ تو یہ ہے کہ یہ ڈھائی فیصد کیوں دیں؟ بس جو مال آرہا ہے وہ آئے۔ دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جن کو زکوٰۃ کا کچھ نہ کچھ احساس ہے اور وہ زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں لیکن زکوٰۃ نکالنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ جب ڈھائی فیصد زکوٰۃ فرض کی گئی تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک حساب لگاکر زکوٰۃ نکالی جائے۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کون حساب کتاب کرے، کون سارے اسٹاک کو چیک کرے، لہٰذا بس ایک اندازہ کرکے زکوٰۃ نکال دیتے ہیں، اب اس اندازے میں غلطی بھی واقع ہوسکتی ہے اور زکوٰۃ نکالنے میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر زکوٰۃ زیادہ نکال دی جائے تو انشاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، لیکن اگر ایک روپیہ بھی کم ہوجائے یعنی جتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس سے ایک روپیہ کم زکوٰۃ نکالی تو یاد رکھئے! وہ ایک روپیہ جو آپ نے حرام طریقے سے اپنے پاس روک لیا ہے، وہ ایک روپیہ تمہارے سارے مال کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

وہ مال تباہی کا سبب ہے

ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مال میں زکوٰۃ کی رقم شامل ہوجائے یعنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالی بلکہ کچھ زکوٰۃ نکالی اور کچھ باقی رہ گئی تو وہ مال انسان کے لئے تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے۔

اس وجہ سے اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک ایک پائی کا صحیح حساب کرکے زکوٰۃ نکالی جائے، اس کے بغیر زکوٰۃ کا فریضہ کماحقہٗ ادا نہیں ہوتا۔ الحمدللہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو زکوٰۃ ضرور نکالتی ہے لیکن اس بات کا اہتمام نہیں کرتی کہ ٹھیک ٹھیک حساب کرکے زکوٰۃ نکالے۔ اس کی وجہ سے زکوٰۃ کی رقم ان کے مال میں شامل رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

زکوۃ کے دنیاوی فوائد

ویسے زکوۃ اس نیت سے نکالنی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کی رضا کا تقاضا ہے اور ایک عبادت ہے۔ اس زکوۃ نکالنے سے ہمیں کوئی منفعت حاصل ہو یا نہ ہو، کوئی فائدہ ملے یا نہ ملے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت بذاتِ خود مقصود ہے۔ اصل مقصد تو زکوۃ کا یہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب کوئی بندہ زکوۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوائد بھی عطا فرماتے ہیں۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ اس کے مال میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور زکوۃ اور صدقات کو بڑھاتے ہیں''

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ زکوۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے حق میں یہ دعا فرماتے ہیں کہ:

((أَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا مَالًا تَلَفًا)) (۲)

''اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرمائیے، اور اے اللہ! جو شخص اپنے مال کو روک کر رکھ رہا ہے اور زکوۃ ادا نہیں کر رہا ہے تو اے اللہ! اس کے مال پر ہلاکت ڈال دیئے''

اس لئے فرمایا:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ))(۳)

''کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا''

چنانچہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ادھر ایک مسلمان نے زکوۃ نکالی دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کر دیئے اور اس کے ذریعہ اس زکوۃ سے زیادہ پیسہ اس کے پاس آ گیا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ زکوۃ نکالنے سے اگرچہ گنتی کے اعتبار سے پیسے کم ہو جاتے ہیں

(۱) البقرة: ۲۷٦

(۲) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى فأما من أعطى...... الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب في المنفق والممسك، رقم: ۱٦۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۷۰۹

(۳) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استباب العفو والتواضع، رقم: ٤٦۸۹، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ۱۹۵۲، مسند أحمد، رقم: ٦۹۰۸، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في التعفف عن المسألة، رقم: ۱۵۹۰

لیکن بقیہ مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی برکت ہوتی ہے کہ اس برکت کے نتیجے میں تھوڑے مال سے زیادہ فوائد حاصل ہوجاتے ہیں۔

مال میں بے برکتی کا انجام

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے۔ برکت کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ برکت اس چیز کو کہتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز میں زیادہ فائدہ حاصل ہوجائے، مثلاً آج آپ نے پیسے تو بہت کمائے لیکن جب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے، اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے اور ایک ہی طبی معائنہ میں وہ سارے پیسے خرچ ہوگئے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پیسے کمائے تھے اس میں برکت نہ ہوئی۔ یا مثلاً آپ پیسے کما کر گھر جارہے تھے کہ راستہ میں ڈاکو مل گیا اور اس نے پستول دکھا کر سارے پیسے چھین لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیسے تو حاصل ہوئے لیکن اس میں برکت نہیں ہوئی۔ یا مثلاً آپ نے پیسہ کما کر کھانا کھایا اور اس کھانے کے نتیجے میں آپ کو بدہضمی ہوگئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں برکت نہ ہوئی۔ یہ سب بے برکتی کی نشانیاں ہیں۔ برکت یہ ہے کہ آپ نے پیسے تو کم کمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تھوڑے پیسوں میں زیادہ کام بنادیئے اور تمہارے بہت سے کام نکل گئے، اس کا نام ہے برکت۔ یہ برکت اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالیں اور اس طرح نکالیں جس طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے اور اس کو حساب کتاب کے ساتھ نکالیں۔ صرف اندازہ سے نہ نکالیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے کہ اس نصاب سے کم اگر کوئی شخص مالک ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اگر اس نصاب کا مالک ہوگا تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ وہ نصاب یہ ہے: ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، یا زیور، یا سامانِ تجارت وغیرہ، جس شخص کے پاس یہ مال اتنی مقدار میں موجود ہو تو اس کو "صاحبِ نصاب" کہا جاتا ہے۔

ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں

پھر اس نصاب پر ایک سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب رہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے، تب اس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، یہ بات درست نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحب نصاب بن جائے مثلاً فرض کریں کہ یکم رمضان کو اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب بن گیا، پھر آئندہ سال جب یکم رمضان آیا تو اس وقت بھی وہ صاحبِ نصاب ہے تو ایسے شخص کو صاحبِ نصاب سمجھا جائے گا، درمیان سال میں جو رقم آتی جاتی رہی اس کا کوئی اعتبار نہیں، بس یکم رمضان کو دیکھ لو کہ تمہارے پاس کتنی رقم موجود ہے، اس رقم پر زکوۃ نکالی جائے گی، چاہے اس میں سے کچھ رقم صرف ایک دن پہلے ہی کیوں نہ آئی ہو۔

تاریخِ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا، اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آگئے اور اس کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوۃ فرض ہوگی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہٰذا اس پر زکوۃ نہ ہونی چاہئے، یہ درست نہیں بلکہ زکوۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحبِ نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا مال آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال یکم رمضان کی رقم سے زیادہ ہو یا کم ہو، مثلاً اگر پچھلے سال ایک لاکھ روپے تھے، اب ڈیڑھ لاکھ ہیں تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوۃ ادا کرو، اور اگر اس سال پچاس ہزار رہ گئے تو اب پچاس ہزار پر زکوۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہوگئی، اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کی اُلجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمہارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آگئی اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا؟ بلکہ زکوۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمہارے پاس ہے، اس پر زکوۃ ادا کرو۔ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ اس نے ہر ہر چیز پر زکوۃ فرض نہیں فرمائی، ورنہ مال کی تو بہت سی قسمیں ہیں۔ جن چیزوں پر زکوۃ فرض ہے وہ یہ ہیں: (۱) نقد روپیہ، چاہے وہ کسی بھی شکل میں

ہو، چاہے وہ نوٹ ہوں یا سکے ہوں، (۲) سونا چاندی، چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو، یا سکے کی شکل میں ہو، بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ جو خواتین کا استعمالی زیور ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، یہ بات درست نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے البتہ صرف سونے چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے، چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اسی طرح ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ نہیں جب تک تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔

اموالِ زکوٰۃ میں عقل نہ چلائیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اللہ تعالیٰ کا عائد کیا ہوا فریضہ ہے۔ اب بعض لوگ زکوٰۃ کے اندر اپنی عقل دوڑاتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ اس پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اور فلاں چیز پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟

یاد رکھئے کہ یہ زکوٰۃ ادا کرنا عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہی یہ ہیں کہ چاہے وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اللہ کا حکم ماننا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ سونے چاندی پر زکوٰۃ واجب ہے تو ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟ اور پلاٹینم پر کیوں زکوٰۃ نہیں؟ یہ سوال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حالتِ سفر میں ظہر اور عصر اور عشاء کی نماز میں قصر ہے اور چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے تو پھر مغرب میں قصر کیوں نہیں؟ یا مثلاً کوئی شخص کہے کہ ایک آدمی ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کے اندر سفر کرتا ہے اور اس سفر میں اس کو کوئی مشقت بھی نہیں ہوتی مگر اس کی نماز آدھی ہو جاتی ہے اور میں کراچی میں بس کے اندر بڑی مشقت کے ساتھ سفر کرتا ہوں، میری نماز آدھی کیوں نہیں ہوتی؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عبادت کے احکام ہیں، عبادات میں ان احکام کی پابندی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کام عبادت نہیں رہے گا۔

عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے

یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ ہی کو حج ہوتا ہے؟ مجھے تو آسانی یہ ہے کہ آج جا کر حج کر آؤں اور ایک دن کے بجائے میں عرفات تین دن قیام کروں گا، اب اگر وہ شخص ایک دن کے بجائے تین دن بھی وہاں بیٹھا رہے گا، تب بھی اس کا حج نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے عبادت کا جو طریقہ بتایا تھا اس کے مطابق نہیں کیا۔ یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ حج کے تین دنوں میں جمرات کی رمی کرنے میں بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے میں چوتھے دن اکٹھی سارے دنوں کی رمی کرلوں گا۔ یہ رمی درست نہیں ہوگی اس لئے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت کے اندر یہ ضروری ہے کہ جو طریقہ بتایا گیا ہے اور جس طرح بتایا گیا ہے اس کے مطابق وہ عبادت انجام دی جائے گی تو وہ عبادت درست ہوگی ورنہ درست نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کیوں ہے اور ہیرے پر کیوں نہیں، یہ عبادت کے فلسفے کے خلاف ہے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی پر زکوٰۃ رکھی ہے، چاہے وہ استعمال کا ہو، اور نقد روپیہ پر زکوٰۃ رکھی ہے۔

سامانِ تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ

دوسری چیز جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ ہے ''سامانِ تجارت'' مثلاً کسی کی دکان میں جو سامان برائے فروخت رکھا ہوا ہے، اس سارے اسٹاک پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اسٹاک کی قیمت لگاتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی زکوٰۃ نکالتے وقت یہ حساب لگائے کہ اگر میں پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کروں تو بازار میں اس کی کیا قیمت لگے گی۔ دیکھئے ایک ''ریٹیل پرائس'' ہوتی ہے اور دوسری ''ہول سیل پرائس''، تیسری صورت یہ ہے کہ پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کرنے کی صورت میں کیا قیمت لگے گی، لہٰذا جب دکان کے اندر جو مال ہے اس کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جارہا ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ تیسری قسم کی قیمت لگائی جائے، وہ قیمت نکال کر پھر اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ عام ''ہول سیل قیمت'' سے حساب لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

مالِ تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟

اس کے علاوہ مالِ تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو آدمی نے بیچنے کی غرض سے خریدا ہو، لہٰذا اگر کسی شخص نے بیچنے کی غرض سے کوئی پلاٹ خریدا یا زمین خریدی یا کوئی مکان خریدا یا گاڑی خریدی اور اس مقصد سے خریدی کہ اس کو بیچ کر نفع کماؤں گا تو یہ سب چیزیں مالِ تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین، کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ میں اس کو فروخت کروں گا تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''انوسٹمنٹ'' کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کردوں گا اور فروخت کرکے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی

زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھادیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کردیں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں ہے بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرلیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کرائے پر چڑھادیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ فروخت کردیں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ اب اس کو فروخت کرکے پیسے حاصل کرلیں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا، جب تک آپ اس پلاٹ کو واقعۃً فروخت نہیں کردیں گے اور اس کے پیسے آپ کے پاس نہیں آجائیں گے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بہرحال، ہر وہ چیز جسے خریدتے وقت ہی اس کو فروخت کرنے کی نیت ہو، وہ مالِ تجارت ہے اور اس کی مالیت پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔

کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کررہے ہیں، مثلاً ایک پلاٹ آپ نے ایک لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائے گی۔

کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم

اسی طرح کمپنیوں کے "شیئرز" بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں۔ اور ان کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز اس مقصد کے لئے خریدے ہیں کہ اس کے ذریعہ کمپنی کا منافع (Dividend) حاصل کریں گے اور اس پر ہمیں سالانہ منافع کمپنی کی طرف سے ملتا رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز "کیپٹل گین" کے لئے خریدے ہیں،

یعنی نیت یہ ہے کہ جب بازار میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع کمائیں گے۔ اگر یہ دوسری صورت ہے یعنی شیئرز خریدتے وقت شروع ہی میں ان کو فروخت کرنے کی نیت تھی تو اس صورت میں پورے شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً آپ نے پچاس روپے کے حساب سے شیئرز خریدے اور مقصد یہ تھا کہ جب ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع حاصل کریں گے، اس کے بعد جس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب نکالا، اس دن شیئرز کی قیمت ساٹھ روپے ہوگئی تو اب ساٹھ روپے کے حساب سے ان شیئرز کی مالیت نکالی جائے گی اور اس پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

لیکن اگر پہلی صورت ہے یعنی آپ نے کمپنی کے شیئرز اس نیت سے خریدے کہ کمپنی کی طرف سے اس پر سالانہ منافع ملتا رہے گا اور فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں آپ کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ یہ دیکھیں کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں اس کمپنی کے کتنے اثاثے جامد ہیں، مثلاً بلڈنگ، مشینری، کاریں وغیرہ، اور کتنے اثاثے نقد، سامانِ تجارت اور خام مال کی شکل میں ہیں یہ معلومات کمپنی ہی سے حاصل کی جاسکتی ہیں، مثلاً فرض کریں کہ کسی کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے نقد سامانِ تجارت، خام مال، اور تیار مال کی صورت میں ہیں اور چالیس فیصد اثاثے بلڈنگ،، مشینری اور کار وغیرہ کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں آپ ان شیئرز کی بازاری قیمت لگا کر اس کی ساٹھ فیصد قیمت پر زکوٰۃ ادا کریں، مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت ساٹھ روپے تھی اور کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے قابلِ زکوٰۃ تھے اور چالیس فیصد اثاثے ناقابلِ زکوٰۃ تھے تو اس صورت میں آپ اس شیئرز کی پوری قیمت یعنی ساٹھ روپے کے بجائے =/۳۶ روپے پر زکوٰۃ ادا کریں۔ اور اگر کسی کمپنی کے اثاثوں کی تفصیل معلوم نہ ہو سکے تو اس صورت میں احتیاطاً ان شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔

شیئرز کے علاوہ اور جتنے فائنانشل انسٹرومنٹس ہیں چاہے وہ بونڈز ہوں یا سرٹیفکیٹس ہوں، یہ سب نقد کے حکم میں ہیں، ان کی اصل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے

اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح جو مال تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ فیکٹری کی مشینری، بلڈنگ، گاڑیاں وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی شخص نے کسی کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے، اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصہ اس کی ملکیت ہے اس حصے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بہرحال، خلاصہ یہ کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائنانشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سامانِ تجارت، جس میں تیار مال، خام مال، اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اور کمپنی کے شیئرز بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اس کے علاوہ ہر چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامانِ تجارت میں داخل ہے، زکوٰۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوٰۃ ادا کریں۔

واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ

ان کے علاوہ بہت سی رقمیں وہ ہوتی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسروں کو قرض دے رکھا ہے، یا مثلاً مال اُدھار فروخت کر رکھا ہے اور اس کی قیمت ابھی وصول ہونی ہے، تو جب آپ زکوٰۃ کا حساب لگائیں اور اپنی مجموعی مالیت نکالیں تو بہتر یہ ہے کہ ان قرضوں کو اور واجب الوصول رقموں کو آج ہی آپ اپنی مجموعی مالیت میں شامل کرلیں۔ اگرچہ شرعی حکم یہ ہے کہ جو قرضے ابھی وصول نہیں ہوئے تو جب تک وہ وصول نہ ہوجائیں اس وقت تک شرعاً ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، لیکن جب وصول ہوجائیں تو جتنے سال گزر چکے ہیں ان تمام پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ قرضہ دے رکھا تھا، اور پانچ سال کے بعد وہ قرضہ آپ کو واپس ملا، تو اگرچہ اس ایک لاکھ روپے پر ان پانچ سالوں کے دوران تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں تھی، لیکن جب وہ ایک لاکھ روپے وصول ہوگئے تو اب گزشتہ پانچ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تو چونکہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ یک مشت ادا کرنے میں بعض اوقات دشواری ہوتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر سال اس قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کردی جایا کرے۔ لہٰذا جب زکوٰۃ کا حساب لگائیں تو ان قرضوں کو بھی مجموعی مالیت میں شامل کرلیا کریں۔

قرضوں کی منہائی

پھر دوسری طرف یہ دیکھیں کہ آپ کے ذمّے دوسرے لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ اور پھر مجموعی مالیت میں سے ان قرضوں کو منہا کردیں، منہا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ قابلِ زکوٰۃ رقم

ہے۔ اس کا پھر ڈھائی فیصد نکال کر زکوٰۃ کی نیت سے ادا کر دیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو رقم زکوٰۃ کی بنے اتنی رقم الگ نکال کر محفوظ کر لیں، پھر وقتاً فوقتاً اس کو مستحقین میں خرچ کرتے رہیں۔ بہرحال زکوٰۃ کا حساب لگانے کا یہ طریقہ ہے۔

قرضوں کی دو قسمیں

قرضوں کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ قرضوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو معمولی قرضے ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی ضروریات اور ہنگامی ضروریات کے لئے مجبوراً لیتا ہے۔ دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار پیداواری اغراض کے لئے لیتے ہیں مثلاً فیکٹریاں لگانے، یا مشینیریاں خریدنے، یا مالِ تجارت امپورٹ کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں، یا مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس پہلے سے دو فیکٹریاں موجود ہیں لیکن اس نے بینک سے قرض لے کر تیسری فیکٹری لگالی۔ اب اگر اس دوسری قسم کے قرضوں کو مجموعی مالیت سے منہا کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان سرمایہ داروں پر ایک پیسے کی بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ وہ لوگ اُلٹے مستحقِ زکوٰۃ بن جائیں گے، اس لئے کہ ان کے پاس جتنی مالیت کا مال موجود ہے، اس سے زیادہ مالیت کے قرضے بینک سے لے رکھے ہیں، وہ بظاہر فقیر اور مسکین نظر آرہا ہے۔ لہٰذا ان قرضوں کے منہا کرنے میں بھی شریعت نے فرق رکھا ہے۔

تجارتی قرضے کب منہا کیے جائیں

اس میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی قسم کے قرضے تو مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے اور ان کو منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اور دوسری قسم کے قرضوں میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے قرض لیا، اور اس قرض کو ایسی اشیاء خریدنے میں استعمال کیا جو قابلِ زکوٰۃ ہیں، مثلاً اس قرض سے خام مال خرید لیا، یا مالِ تجارت خرید لیا، تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا کریں گے۔ لیکن اگر اس قرض کو ایسے اثاثے خریدنے میں استعمال کیا جو ناقابلِ زکوٰۃ ہیں تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا نہیں کریں گے۔

قرض کی مثال

مثلاً ایک شخص نے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لیے اور اس رقم سے اس نے ایک پلانٹ

(مشینری) باہر سے امپورٹ کرلیا ـــــ چونکہ یہ پلانٹ قابلِ زکوٰۃ نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشینری ہے تو اس صورت میں یہ قرضہ منہا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نے اس قرض سے خام مال خرید لیا تو چونکہ خام مال قابلِ زکوٰۃ ہے اس لئے یہ قرض منہا کیا جائے گا، کیونکہ دوسری طرف یہ خام مال ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مجموعی مالیت میں پہلے سے شامل ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نارمل قسم کے قرض تو پورے کے پورے مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے، اور جو قرضے پیداواری اغراض کے لئے لیے گئے ہیں، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس سے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا نہیں ہوگا، اور اگر قابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا ہوگا۔ یہ تو زکوٰۃ نکالنے کے بارے میں احکام تھے۔

زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں

دوسری طرف زکوٰۃ کی ادائیگی کے بارے میں بھی شریعت نے احکام بتائے ہیں۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ زکوٰۃ نکالو، نہ یہ فرمایا کہ زکوٰۃ پھینکو، بلکہ فرمایا: اتوا الزکاۃ، زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی یہ دیکھو کہ اس جگہ پر زکوٰۃ جائے جہاں شرعاً زکوٰۃ جانی چاہئے۔ بعض لوگ زکوٰۃ نکالتے تو ہیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ زکوٰۃ نکال کر کسی کے حوالے کر دی اور اس کی تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح مصرف پر خرچ کرے گا یا نہیں؟ آج بے شمار ادارے دنیا میں کام کر رہے ہیں، ان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہوں گے جن میں بسا اوقات اس بات کا لحاظ نہیں ہوتا ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی جو مستحقِ زکوٰۃ ہے اس کو ادا کرو۔

مستحق کون؟

اس کے لئے شریعت نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ زکوٰۃ صرف انہی اشخاص کو دی جاسکتی ہے جو صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ایسا سامان موجود ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جاتا ہے تو بھی وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں رہتا۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کی رقم یا اتنی مالیت کا کوئی سامان ضرورت سے زائد نہ ہو۔

مستحق کو مالک بنا کر دیں

اس میں بھی شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس مستحق زکوٰۃ کو مالک بنا کر دو۔ یعنی وہ مستحق زکوٰۃ اپنی ملکیت میں خود مختار ہو کہ جو چاہے کرے۔ اسی وجہ سے کسی بلڈنگ کی تعمیر پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی، کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی۔ اس لئے کہ اگر زکوٰۃ کے ذریعہ تعمیرات کرنے اور ادارے قائم کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو زکوٰۃ کی رقم سب لوگ کھا پی کر ختم کر جاتے، کیونکہ اداروں کے اندر تنخواہیں بے شمار ہوتی ہیں، تعمیرات پر خرچ لاکھوں کا ہوتا ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ غیر صاحب نصاب کو مالک بنا کر زکوٰۃ دو، یہ زکوٰۃ فقراء اور غرباء اور کمزوروں کا حق ہے، لہٰذا یہ زکوٰۃ انہی تک پہنچنی چاہئے، جب ان کو مالک بنا کر دیدو گے تو تمہاری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے

یہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم انسان کے اندر یہ طلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوٰۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا ہے کہ کون کون لوگ مستحقین ہیں اور ان مستحقین کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوٰۃ پہنچاتا ہے، یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے محلے میں، ملنے جلنے والوں میں، عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں، دوست احباب میں جو مستحق زکوٰۃ ہوں، ان کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ ادا کریں اس میں ڈبل ثواب ہے، زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کرنے کا ثواب بھی ہے۔ اور تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، صرف دو رشتے ایسے ہیں جن کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، ایک ولادت کا رشتہ ہے، لہٰذا باپ بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے، لہٰذا شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی، ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مثلاً بھائی کو، بہن کو، چچا کو، خالہ کو، پھوپھی کو، ماموں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہو۔

بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوٰۃ ضرور دینی چاہئے حالانکہ

یہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر بیوہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اس کی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر ایک خاتون بیوہ ہے اور مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرفِ زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔ اسی طرح یتیم کو زکوٰۃ دینا اور اس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھ کر زکوٰۃ دینی چاہئے کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ لیکن اگر کوئی یتیم ہے مگر وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ صاحبِ نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ان احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ نکالنی چاہئے۔

بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم

کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کا نظام قائم ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، کمپنیاں بھی زکوٰۃ کاٹ کر حکومت کو ادا کرتی ہیں۔ اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل عرض کر دیتا ہوں۔

جہاں تک بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا تعلق ہے تو اس کٹوتی سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ احتیاطاً ایسا کرلیں کہ یکم رمضان آنے سے پہلے دل میں یہ نیت کرلیں کہ میری رقم سے جو زکوٰۃ کٹے گی وہ میں ادا کرتا ہوں، اس سے اس کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے دوبارہ زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔

اس میں بعض لوگوں کو یہ شبہ رہتا ہے کہ ہماری پوری رقم پر سال نہیں گزرا جب کہ پوری رقم پر زکوٰۃ کٹ گئی۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو اس صورت میں سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی جو رقم آپ کے پاس آئی ہے اس پر جو زکوٰۃ کٹی ہے وہ بھی بالکل صحیح کٹی ہے کیونکہ اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہو گئی تھی۔

اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟

البتہ اگر کسی شخص کا سارا اثاثہ بینک ہی میں ہے، خود اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں، اور دوسری طرف اس کے اُوپر لوگوں کے قرضے ہیں تو اس صورت میں بینک تو تاریخ آنے پر زکوٰۃ کاٹ لیتا ہے حالانکہ اس رقم سے قرضے منہا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں زیادہ زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ یا تو آدمی وہ تاریخ آنے سے پہلے اپنی رقم بینک سے نکال لے یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ دے۔ بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ ہی میں رکھے، سیونگ اکاؤنٹ میں

بالکل نہ رکھے، اس لئے کہ وہ تو سودی اکاؤنٹ ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ میں زکوٰۃ نہیں کٹتی۔ بہرحال زکوٰۃ کی تاریخ آنے سے پہلے وہ رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں منتقل کردے، جب کرنٹ اکاؤنٹ سے زکوٰۃ نہیں کٹے گی تو آپ اپنے طور پر حساب کرکے قرض منہا کرکے زکوٰۃ ادا کریں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ وہ شخص بینک کو لکھ کر دیدے کہ میں صاحبِ نصاب نہیں ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہونے کی وجہ سے میرے اُوپر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اگر یہ لکھ کر دیدے تو قانوناً اس کی رقم سے زکوٰۃ نہیں کاٹی جائے گی۔

کمپنی کے شیئرز کی زکوٰۃ کاٹنا

ایک مسئلہ کمپنی کے شیئرز کا ہے۔ جب کمپنی شیئرز پر سالانہ منافع تقسیم کرتی ہے تو اس وقت وہ کمپنی زکوٰۃ کاٹ لیتی ہے، لیکن کمپنی ان شیئرز کی جو زکوٰۃ کاٹتی ہے وہ اس شیئرز کی فیس ویلیو (Face Value) کی بنیاد پر زکوٰۃ کاٹتی ہے، حالانکہ شرعاً ان شیئرز کی مارکیٹ قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا فیس ویلیو پر جو زکوٰۃ کاٹ لی گئی ہے وہ تو ادا ہوگئی البتہ فیس ویلیو اور مارکیٹ ویلیو کے درمیان جو فرق ہے، اس کا آپ کو اس بنیاد پر حساب کرنا ہوگا جس کی تفصیل شیئرز کی زکوٰۃ کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک شیئر کی فیس ویلیو پچاس روپے تھی اور اس کی مارکیٹ ویلیو ساٹھ روپے ہے، تو اب کمپنی والوں نے پچاس روپے کی زکوٰۃ ادا کردی، لہٰذا دس روپے کی زکوٰۃ آپ کو الگ سے نکالنی ہوگی۔ کمپنی کے شیئرز اور این آئی ٹی یونٹ دونوں کے اندر یہی صورت ہے، لہٰذا جہاں کہیں فیس ویلیو پر زکوٰۃ کٹتی ہے وہاں مارکیٹ ویلیو کا حساب کرکے دونوں کے درمیان جو فرق ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہئے؟

ایک بات یہ سمجھ لیں کہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یا اس تاریخ میں زکوٰۃ ادا کی جائے، بلکہ ہر آدمی کی زکوٰۃ کی تاریخ جدا ہوتی ہے۔ شرعاً زکوٰۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس تاریخ اور جس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنا۔ مثلاً ایک شخص یکم محرام الحرام کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنا تو اس کی زکوٰۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہوگئی، اب آئندہ ہر سال اس کو یکم محرم الحرام کو اپنی زکوٰۃ کا حساب کرنا چاہئے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنے تھے، اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوٰۃ کے حساب کی مقرر کرلے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھر آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب کرکے زکوٰۃ ادا کرے، البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کردیں۔

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں؟

عام طور پر لوگ رمضان المبارک میں زکوۃ نکالتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔(۱)

لہٰذا زکوۃ بھی چونکہ فرض ہے اگر رمضان المبارک میں ادا کریں گے تو اس کا ثواب بھی ستر گنا ملے گا۔ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اپنے صاحبِ نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہے تو محض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کو چاہئے کہ اسی تاریخ پر اپنی زکوۃ کا حساب کرے۔ البتہ زکوۃ کی ادائیگی میں یہ کر سکتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی زکوۃ ادا کر رہا ہے تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کر دے۔ البتہ اگر تاریخ یاد نہیں ہے تو پھر گنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کر لے، البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کر دے تاکہ اگر تاریخ کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے جو فرق ہو گیا ہو وہ فرق بھی پورا ہو جائے۔

پھر جب ایک مرتبہ جو تاریخ مقرر کر لے تو پھر ہر سال اسی تاریخ کو اپنا حساب لگائے اور یہ دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں، اس تاریخ میں نقد رقم کتنی ہے، اگر سونا موجود ہے تو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے، اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی ان شیئرز کی قیمت لگائے، اگر اسٹاک کی قیمت لگانی ہے تو اسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائے اور پھر ہر سال اسی تاریخ کو حساب کر کے زکوۃ ادا کرنی چاہئے، اس تاریخ سے آگے پیچھے نہیں کرنا چاہئے۔

بہرحال، زکوۃ کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل عرض کر دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۳۷۱۴ (۷۵۷/۸)، شعب الإیمان للبیهقی، رقم: ۳۴۵۵ (۱۲۰/۸)، صحیح ابن خزیمة، رقم: ۱۷۸۰ (۱۱۵/۷)

زکوٰۃ کی ادائیگی سے متعلق اہل سوالات

چاند کی تاریخ مقرر کرنا

سوال: کیا زکوٰۃ کا حساب کرنے کے لئے انگریزی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں یا چاند ہی کی تاریخ مقرر کرنا ضروری ہے؟

جواب: چاند ہی کی تاریخ مقرر کرنا ضروری ہے، انگریزی تاریخ مقرر کرنا درست نہیں۔

زیور کی زکوٰۃ کس کے ذمہ ہے؟

سوال: بہت سی خواتین اپنے شوہروں کو کہتی ہیں کہ ہمارے زیور کی زکوٰۃ آپ ادا کریں، کیوں کہ ہمارے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، ایسی صورت میں اگر شوہر زکوٰۃ ادا کردے تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب: یہ بات پہلے سمجھ لیں کہ جو شخص صاحبِ نصاب ہے اور اس پر زکوٰۃ فرض ہے، وہ اپنی زکوٰۃ کا خود ذمہ دار ہے، جس طرح ہر شخص اپنی نماز کا خود ذمہ دار ہے، جس طرح شوہر کے ذمے بیوی کی نماز نہیں، اسی طرح شوہر کے ذمے بیوی کی زکوٰۃ نہیں، اگر بیوی خود صاحبِ نصاب ہے تو زکوٰۃ ادا کرنا اسی کے ذمے فرض ہے، اور بیوی کا یہ کہنا کہ میرے پاس پیسے نہیں، یہ بات اس لئے درست نہیں کہ اگر پیسے نہ ہوتے تو زکوٰۃ واجب ہی کیوں ہوتی، اگر بیوی کے پاس صرف زیور ہے اور زیور کی وجہ سے وہ صاحبِ نصاب بن گئی اور اس کے پاس الگ سے پیسے نہیں ہیں، تو وہ اپنے زیور بیچ کر زکوٰۃ ادا کرے، لیکن اگر شوہر خوش دلی سے اس کی یہ درخواست قبول کرلے اور اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کردے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیوی کے ذمے اسی زیور کی زکوٰۃ فرض ہے جو اس کی ملکیت میں ہو، لیکن اگر وہ زیور شوہر کی ملکیت میں ہے خواہ بیوی ہی پہنتی ہو تو اس کی زکوٰۃ بیوی پر فرض نہیں، شوہر کو دینی ہوگی۔

مالک بنا کر دینا ضروری ہے

سوال: بہت سے مالدار ایسے ہیں جن کے علاقوں میں سینکڑوں غریب ہوتے ہیں مگر وہ مالدار لوگ زکوٰۃ صرف اپنی برادری کی انجمن میں دیتے ہیں اور پھر وہ انجمن قبرستان کی زمین اور شادی ہال وغیرہ پر حیلۂ تملیک کا ذریعہ اختیار کر کے ان پر خرچ کرتی ہے، اور غریب لوگوں کو وہ زکوٰۃ نہیں ملتی، کیا یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: اس کا جواب پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جو غریب صاحبِ نصاب نہیں ہے، اس کو مالک بنا کر زکوٰۃ دینا ضروری ہے، کوئی بھی ایسا کام جس میں تملیک نہ پائی جائے مثلاً کوئی عمارت تعمیر کرنا ہو یا قبرستان خرید کر وقف کرنا ہو یا مسجد ہو، ان پر زکوٰۃ صرف نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ جو تملیک کا حیلہ عام طور پر کیا جاتا ہے کہ کسی غریب کو زکوٰۃ دے دی اور اس سے کہا کہ تم فلاں کام پر خرچ کردو وہ غریب بھی جانتا ہے کہ یہ میرے ساتھ کھیل ہو رہا ہے اور حقیقت میں مجھے اس زکوٰۃ کی رقم میں سے ایک پیسے کا بھی اختیار نہیں ہے، تو یہ محض ایک حیلہ ہے اور اس وجہ سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

پبلسٹی پر زکوٰۃ کی رقم لگانا

سوال: آج کل بہت سے ادارے زکوٰۃ اور دوسرے عطیات جمع کرنے کے لئے بہت سی رقمیں پبلسٹی پر خرچ کر دیتے ہیں، تو کیا زکوٰۃ کی رقم اس طرح خرچ کرنا جائز ہے؟

جواب: پبلسٹی پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں۔

مدارس کے طلبہ کو زکوٰۃ دینا

سوال: زکوہ کا بہترین مصرف تو غرباء اور مساکین ہیں لیکن ہمارے ہاں دینی مدارس والے زکوٰۃ لے جاتے ہیں اور پھر وہ لوگ مسجد پر بھی زکوٰۃ خرچ کرنے کے لئے تملیک کرا لیتے ہیں، وہ غریب لوگ جو سارا سال زکوٰۃ کی آس میں اپنے بچوں کی شادیاں اور دیگر امور التواء میں رکھتے ہیں وہ کیا کریں؟

جواب: جن اداروں میں زکوٰۃ کو صحیح طور پر ان کے شرعی مصرف میں خرچ کرنے کا انتظام موجود نہیں ہے، ان اداروں کو زکوٰۃ نہ دینی چاہئے بلکہ غریبوں کو مالک بنا کر زکوٰۃ دینی چاہئے، البتہ اگر

کسی ادارے میں باقاعدہ شرعی طریقے پر زکوٰۃ خرچ کرنے کا انتظام موجود ہے، وہاں زکوٰۃ دینی چاہئے، اس لئے کہ جس طرح اور فقراء اور غرباء زکوٰۃ کے حقدار ہیں اسی طرح وہ طلبہ جو دین کی تعلیم حاصل کررہے ہیں اور وہ غریب بھی ہیں تو وہ طلبہ اور زیادہ حقدار ہیں، کیوں کہ انہوں نے دین کی تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا ہے، اس لئے جن اداروں میں صحیح انتظام موجود ہو وہاں بے کھٹک زکوٰۃ دے سکتے ہیں، البتہ اگر اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں مستحقین زکوٰۃ موجود ہیں تو ان کو مقدم رکھنا چاہئے، ان کو دینے کے بعد ان اداروں کو دینی چاہئے۔

تاریخ زکوٰۃ پر نصاب سے کم مال ہونا

سوال: اگر زکوٰۃ کی تاریخ مقرر ہے، اب سال گزرنے کے بعد جب وہ تاریخ آئی تو اس وقت نصاب سے کم مال تھا تو کیا اس صورت میں زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے یا نہیں؟

جواب: اگر زکوٰۃ کا حساب کرنے کے لئے آپ نے جو تاریخ مقرر کی ہے، اس تاریخ میں آپ کے پاس نصاب کے بقدر مال نہیں ہے تو آپ کے ذمے زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ضرورت سے زائد مال کا مطلب

سوال: ضرورت سے زائد مال کی کیا تعریف ہے؟ کیوں کہ یہ ضروریات ہر ایک کی مختلف ہوتی ہیں؟

جواب: ضرورت سے زائد مال سے مراد یہ ہے کہ گھر میں جو اشیاء کھانے پینے کی ہیں یا استعمال ہونے والے برتن وغیرہ ہیں، اسی طرح پہننے کے کپڑے ہیں اور گھر کا اثاثہ جو گھر میں استعمال ہوتا رہتا ہے، وہ سب ضروریات میں داخل ہیں، اور پھر ہر آدمی کی ضروریات بھی مختلف ہوتی ہیں، بعض لوگ وہ ہیں جن کے پاس مہمان بہت کثرت سے آتے ہیں تو اب ان کو ان کے لئے بہت سارے سامان بستر وغیرہ رکھنے پڑتے ہیں، بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس اس طرح مہمان نہیں آتے، بہرحال یوں سمجھ لیں کہ وہ سامان جن کو کبھی استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی، ایسا سامان ضرورت سے زائد سمجھا جائے گا۔

ٹیلیویژن ضرورت سے زائد ہے

سوال: کیا ٹیلیویژن ضرورت سے زائد ہے؟

جواب: جی ہاں ٹیلیویژن یقیناً ضرورت سے زائد ہے۔

تعمیرات پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ہسپتالوں کی تعمیر اور مدارس کی تعمیر پر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہیں تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: حقیقت میں تو تعمیرات پر زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں ہوسکتی، اور آج کل جو حیلۂ تملیک کیا جاتا ہے جس میں جانبین کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت میں تملیک نہیں ہے، ایسا حیلہ تو کسی طرح بھی معتبر نہیں، لیکن یہ صورت ہوسکتی ہے کہ جن لوگوں کے لئے تعمیر کی جارہی ہے، واقعۃً ان کو وہ رقم مالک بنا کر دے دی جائے اور چونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رقم ہمارے لئے اور ہمارے مصرف میں استعمال ہوگی، لہٰذا پھر وہ لوگ وہ رقم اپنے طور پر خوش دلی سے اس تعمیر کے لئے دے دیں تو اس کی گنجائش ہے۔

زکوٰۃ میں کھانا کھلانا

سوال: زکوٰۃ کے طور پر کھانا پکا کر دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب: کھانا پکا کر مستحقین زکوٰۃ کو مالک بنادینا درست ہے۔

زکوٰۃ میں کتابیں دینا

سوال: کتابوں کی اشاعت میں زکوٰۃ کی رقم لگ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: کتابوں کی اشاعت میں زکوٰۃ کی رقم نہیں لگ سکتی البتہ اگر وہ کتابیں زکوٰۃ کے طور پر مستحقین زکوٰۃ کو مالک بنا کر دی جائیں گی تو اس سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

مال تجارت کی قیمت کا تعین

سوال: اگر کسی مال تجارت کا ریٹ کنفرم نہ ہو اور وہ مال بازار میں عام فروخت نہ ہوتا ہو، اس کے ریٹ اپنی صوابدید کے مطابق مقرر کرکے اس پر مخصوص نفع رکھ کر فروخت کرنا چاہیں لیکن وہ

مال ابھی تک فروخت نہیں ہوا اور نہ اب فروخت ہونے کا امکان ہے تو اس کی قیمت کا تعین کس طرح کریں؟

جواب: مال تجارت کی قیمت کے تعین کرنے کا تعلق تجربہ سے ہے، تجربہ سے اس کا فیصلہ کریں اور انصاف اور احتیاط کے ساتھ اس کی تخمینی قیمت لگائیں کہ جب یہ سامان فروخت ہوگا تو ہمیں اس کے اتنے پیسے ملیں گے، اس طرح قیمت کا تعین کر کے اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کریں۔

مالِ تجارت ہی کو زکوٰۃ میں دینے کا حکم

سوال: ایک مال تجارت ہمارے پاس موجود ہے مگر وہ فروخت نہیں ہو رہا ہے تو اسی مال کا ہم بطور زکوٰۃ کے مستحق کو دے سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! زکوٰۃ میں خود وہ چیز بھی دی جا سکتی ہے جس پر زکوٰۃ عائد ہے، لہٰذا سامان تجارت کی زکوٰۃ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ نقد روپیہ ہی دیا جائے، بلکہ وہ سامان تجارت جس کی زکوٰۃ نکالی جا رہی ہے، اسی سامان تجارت کا کچھ حصہ بطور زکوٰۃ کے دے سکتے ہیں، البتہ اگر وہ سامان عام استعمال کا سامان نہیں ہے اور خیال یہ ہے کہ غریب اور فقیر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو اس صورت میں انصاف کے ساتھ اندازہ اور تخمینہ سے اس کی قیمت لگا کر پھر اس کی قیمت پر زکوٰۃ ادا کی جائے۔

امپورٹ کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ہم نے ایک مال تجارت باہر ملک سے خریدا ہے اور ابھی ہمارے قبضہ میں نہیں آیا، اس مال کی قیمت کس حساب سے لگائی جائے؟

جواب: اس میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر وہ سامان آپ کی ملکیت میں آ چکا ہے، چاہے وہ ابھی تک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا تب تو اس سامان کی قیمت لگائی جائے گی، لیکن اگر وہ سامان آپ کی ملکیت میں نہیں آیا تو اس صورت میں جتنے پیسے آپ نے اس کی خریداری میں لگائے ہیں، صرف ان پیسوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک سامان امپورٹ کیا اور وہ سامان آپ کی ملکیت میں آ گیا ہے، اگرچہ وہ سامان ابھی راستہ میں ہے ابھی تک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا، تب تو اس سامان کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے

گی، لیکن اگر وہ سامان ابھی تک آپ کی ملکیت ہی میں نہیں آیا، اس لئے کہ سودا ہی مکمل نہیں ہوا تو اس صورت میں اس مال کی خریداری میں جتنی رقم لگائی ہے، اس رقم پر زکوۃ واجب ہوگی، اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

شمسی تاریخ سے قمری تاریخ کی طرف تبدیلی کس طرح ہوگی؟

سوال: شروع ہی سے میں انگریزی تاریخ کے حساب سے زکوۃ ادا کرتا ہوں، اب میں قمری تاریخ کا تعین کس طرح کروں؟

جواب: آئندہ کے لئے تو آپ کسی قمری تاریخ کا تعین کرلیں اور اب تک آپ جو شمسی تاریخ کے حساب سے زکوۃ ادا کرتے چلے آئے ہیں، تو اس میں ہر سال جو تقریبا چند دنوں کا فرق چلا گیا ہے، اس کی تلافی کے لئے آپ شمسی سال کے لئے 2.60 کا حساب کریں اور جو فرق نکلتا ہو اس کی مزید زکوۃ ادا کریں۔

خالص سونے پر زکوۃ ہے؟

سوال: سونے کے زیور میں کھوٹ اور نگینوں کی قیمت اور وزن شامل ہوتا ہے تو کیا زیور کے پورے وزن پر زکوۃ واجب ہوگی یا کھوٹ کا وزن اور اس کی قیمت الگ کرنی ہوگی؟

جواب: زکوۃ ادا کرتے وقت زیور میں نگینوں کی قیمت اور کھوٹ کو نکالا جائے گا، صرف خالص سونے پر زکوۃ ادا کی جائے گی۔

مجاہدین کو زکوۃ دینا

سوال: کیا جہاد میں کافروں سے برسرِ پیکار مجاہدین کو زکوۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب: جی ہاں! دی جاسکتی ہے جب کہ وہ جہاد میں لگے ہوئے ہوں، اس لئے کہ مجاہدین بھی زکوۃ کا ایک مصرف ہیں۔

تھوڑی تھوڑی کر کے زکوۃ دینا

سوال: بعض تاجر زکوۃ کا حساب لگا کر یکمشت ادا نہیں کرتے بلکہ اس زکوۃ کی رقم کو قابل ادا کھاتے میں درج کر دیتے ہیں اور پر تھوڑی تھوڑی کر کے زکوۃ ادا کرتے ہیں، اور زکوۃ کی

مکمل ادائیگی تک وہ رقم کاروبار میں لگی رہتی ہے، کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب: زکوٰۃ تھوڑی تھوڑی ادا کرنا جائز ہے مگر کوشش یہ کرنی چاہئے کہ زکوٰۃ جتنی جلد ادا ہو جائے تو بہتر ہے۔

ایک سے زائد گاڑی پر زکوٰۃ

سوال: اگر کسی شخص کے پاس ایک سے زائد گاڑیاں ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب: اگر ایک سے زائد گاڑیاں استعمال ہی کے لئے ہیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی بیچنے کی نیت سے خریدی ہو تو اس گاڑی پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کرایہ کے مکان پر زکوٰۃ

سوال: کیا کرایہ پر دیے ہوئے مکان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب: کرایہ پر دیے ہوئے مکان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے البتہ جو کرایہ ہر ماہ آئے گا وہ کرایہ آپ کی نقد رقم میں شامل ہوگا اور سال کے ختم ہونے پر صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قرض مانگنے والے کو زکوٰۃ

سوال: اگر کوئی شخص قرض مانگے اور احتمال یہ ہے کہ یہ شخص قرض واپس نہیں کرے گا، تو اس کو قرض بتا کر دل میں زکوٰۃ کی نیت کر کے رقم دیدیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: جی ہاں! اس طرح دینے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے بشرطیکہ شروع میں رقم دیتے وقت ہی زکوٰۃ کی نیت ہو اور یہ نیت ہو کہ اگر یہ واپس لائے گا تو اس سے واپس نہیں لوں گا، تو اس طرح بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔

اگر بینک صحیح مصرف پر زکوٰۃ خرچ نہ کرے؟

سوال: جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ اگر بینک زکوٰۃ کاٹ لے تو زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے لیکن ہمیں اس کا پتہ نہیں کہ وہ صحیح مصرف پر خرچ کرتا ہے یا نہیں، لہٰذا اگر بینک صحیح مصرف پر زکوٰۃ نہ لگائے تو کیا ہماری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ ہمارے ذمے پر زکوٰۃ باقی تو نہیں رہ جائے گی؟

جواب: حکومت جو زکوٰۃ وصول کرتی ہے تو حکومت کے وصول کرتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، اب حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ صحیح مصرف پر خرچ کرے، اگر حکومت صحیح مصرف پر خرچ کرے گی تو اس کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی، اگر صحیح مصرف پر خرچ نہیں کرے گی تو وہ گناہ گار ہوگی لیکن آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کی تاریخ بدلنے کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص اپنی زکوٰۃ کی تاریخ بدلنا چاہتا ہے تو وہ بدل سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: جیسا کہ پہلے بتایا تھا کہ ہر شخص کی زکوٰۃ کی تاریخ وہ ہے جب وہ پہلی بار صاحبِ نصاب بنا، لیکن جب ایک تاریخ بن گئی تو پھر آئندہ اس کو وہی تاریخ رکھنی چاہئے اس کو بدلنا درست نہیں۔

اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے لئے ہوئے قرض کا حکم

سوال: اگر کسی شخص نے کمپنی سے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا ہے تو وہ قرض میں شمار ہوگا یا نہیں؟

جواب: اگر کسی شخص نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا ہے چونکہ وہ اس کی اپنی ہی رقم ہے اس لئے اس قرض کو اپنی مجموعی رقم سے قرض کے طور پر منہا نہیں کیا جائے گا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے نیت ضروری ہے

سوال: میں نے اپنے ملازم کو شادی کی مد میں ۲۵ ہزار روپے دیے اور اس سے کہا کہ اس میں دس ہزار روپے تمہارے ہیں اور پندرہ ہزار روپے قرض ہیں جو تمہیں واپس کرنا ہے، یہ پندرہ ہزار روپے اگرچہ زکوٰۃ ہی کے تھے لیکن یہ سوچا کہ اس سے واپس لے کر کسی اور کو یہ زکوٰۃ میں دے دوں گا کیا میرا یہ فیصلہ درست ہے؟

جواب: جی ہاں اگر آپ نے شروع ہی میں یہ نیت کر لی کہ اس میں سے دس ہزار روپے تو اس زکوٰۃ کے طور پر دیے ہیں اور باقی قرض ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، آپ کے دس ہزار روپے بطور زکوٰۃ ادا ہو جائیں گے، باقی پندرہ ہزار روپے بطور زکوٰۃ کے ادا نہیں ہوئے، وہ جب وصول ہونے کے بعد دوبارہ زکوٰۃ کی نیت سے ادا کریں گے تو اس وقت ادا ہو جائیں گے۔

اپنے ملازم کو زکوٰۃ دینا

سوال: کیا ہم اپنے ملازم کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں اور کیا اس کا صاحبِ نصاب نہ ہونا ضروری ہے؟

جواب: ملازم ہو یا نہ ہو، جس کو زکوٰۃ دے رہے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ نصاب نہ ہو، کسی بھی صاحبِ نصاب کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ چاہے وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو البتہ ملازم کو دی ہوئی زکوٰۃ اجرت میں ہرگز نہ لگائیں بلکہ اگر کسی وقت وہ اجرت میں اضافے کا مطالبہ کرے تو اضافہ بھی اس بنا پر نہ روکیں کہ تمہیں ہم زکوٰۃ بھی دیتے ہیں یعنی زکوٰۃ کا کوئی اثر اس کی تنخواہ پر نہ پڑنا چاہئے۔

طلبہ کو وظیفے کے طور پر زکوٰۃ دینا

سوال: مدارس میں طالب علم کو کھانے کے وظیفے کے طور پر مثلاً پانچ سو روپے فی طالب علم زکوٰۃ کی رقم سے دیے جائیں اور پھر ان طلبہ سے فیس کے طور پر وہ رقم اہل مدارس وصول کریں تو اس طرح کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: جی ہاں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

شیئرز پر ملنے والا سالانہ منافع پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا شیئرز پر ملنے والے سالانہ منافع پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

جواب: جو نقد رقم تاریخ زکوٰۃ میں آپ کے پاس موجود ہے چاہے وہ رقم کسی بھی ذریعہ سے آئی ہو چاہے شیئرز پر ملنے والا سالانہ نفع کے طور پر آپ کو ملی ہو، یا کسی نے ہدیہ میں آپ کو دی ہو یا دکان کی آمدنی سے حاصل ہوئی ہو ان سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شیئرز کی کون سی قیمت معتبر ہوگی؟

سوال: اگر شیئرز فروخت کرنے کی نیت سے خریدے لیکن بازار میں ان کی قیمت بہت زیادہ گر جانے کی وجہ سے ان کو فروخت نہ کریں تو کیا زکوٰۃ کی تاریخ آنے پر ان شیئرز کی زکوٰۃ مارکیٹ ریٹ پر دی جائے گی یا اس کی خریداری کی قیمت پر دی جائے گی؟

جواب: مارکیٹ ریٹ پر زکوٰۃ دی جائے گی، چاہے مارکیٹ میں نرخ گر گیا ہو یا بڑھ گیا ہو۔

ضرورت سے زائد سامان کے ہوتے ہوئے زکوٰۃ دینا

سوال: اگر ایک شخص کے گھر میں بظاہر ضرورت کا سامان ٹی وی، وی سی آر وغیرہ موجود ہیں، مگر وہ ضرورت مند ہے، مثلاً علاج کے لئے اور بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے لیکن شرم کے مارے کھلے عام لوگوں سے نہیں مانگ سکتا، کیا ایسے شخص کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟

جواب: اگر اس شخص کو واقعۃً ان کاموں کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے تو سب سے پہلے ٹی وی، وسی آر وغیرہ فروخت کر کے پیسے حاصل کرے جب اس قسم کی اشیاء فروخت کردے اور ضرورت سے زائد سامان اس کے پاس نہ رہے تو پھر ایسے مستحق شخص کو زکوٰۃ دینے کی گنجائش ہوگی اس سے پہلے نہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں ٹی وی، وسی آر ہے اسے زکوٰۃ نہیں سکتے لیکن اگر اس کی بیوی یا بالغ اولاد میں کوئی غیر صاحبِ نصاب مستحق زکوٰۃ ہے تو اسے زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

مریضوں کو زکوٰۃ کی مد سے دوا دینا

سوال: ایسا مریض جو غریب ہو اور سید نہ ہو، ایک ڈاکٹر اس کو دوائی زکوٰۃ کی مد سے دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ایسے مریض کو ڈاکٹر سے زکوٰۃ کی مد سے دوا دے سکتا ہے۔

بچیوں کے زیور پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: بعض اوقات والدین اپنی غیر شادی شدہ بچیوں کو زیور دے دیتے ہیں اور ان بچیوں کا کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہوتا، لیکن وہ بچیاں اس زیور کی مالک ہوتی ہیں اب وہ بچیاں اس زیور کی زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟

جواب: اگر بچیاں نابالغ ہیں اور والدین نے وہ زیور ان کی ملکیت میں اس طرح دیدیا ہے کہ اب وہ زیور بچیوں سے لیا جائے گا اور نہ دوسروں کو دیا جائے گا، تو اس صورت میں تو اس زیور پر زکوٰۃ نہیں۔ اس لئے کہ نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن اگر بچیاں بالغ ہیں اور والدین نے زیور کا مالک ان کو بنادیا ہے، تو اس صورت میں خود اس بچی پر اس زیور کی زکوٰۃ فرض ہے،

اگر اس کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو پھر یا تو والدین اس کی طرف سے اس کی اجازت سے زکوٰۃ ادا کردیں، اور اگر یہ ممکن نہ تو زیور فروخت کر کے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

کیا زیور فروخت کر کے زکوٰۃ ادا کریں؟

سوال: اگر اس طرح ہر سال زیور فروخت کر کے زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تو پھر ایک وقت آئے گا کہ سارا زیور ختم ہو جائے گا؟

جواب: سارا زیور ختم نہیں ہوگا، بلکہ ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر ضرور باقی رہے گا، اس لئے جب ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار سے کم ہوگا تو نصاب زکوٰۃ ختم ہو جائے گا اور زکوٰۃ ہی واجب نہیں رہے گی۔

تاریخ زکوٰۃ پر حساب ضرور کرلیں

سوال: ایک شخص کو شادی کے موقع پر جو تحفے ملے اور منہ دکھائیاں ملیں اس کے نتیجے میں وہ صاحب نصاب ہوگیا اگر اگلے سال بھی صاحب نصاب رہے تو اگلے سال اسی تاریخ کو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اب اگر آئندہ سال وہ بھی تاریخ تو آگئی لیکن رمضان کے آنے میں ابھی پانچ ماہ باقی ہیں، تو کیا رمضان آنے پر ایک سال پانچ ماہ کی زکوٰۃ ادا کرے یا وہ کوئی اور طریقہ اختیار کرے؟

جواب: وہ یہ کرے کہ جس تاریخ کو سال پورا ہو جائے اس تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب تو لگالے کہ میرے ذمہ اتنی زکوٰۃ واجب ہوئی، پھر حسب ضرورت ادا کرتا رہے، اگر رمضان تک کوئی مناسب مصرف نہ ملے تو جو زکوٰۃ بچی ہوئی ہو وہ رمضان میں ادا کردے، لیکن اگر فوری مصرف موجود ہے اور ضرورت مند موجود ہے تو زکوٰۃ رمضان تک ہرگز مؤخر نہ کرنی چاہئے ہر صورت میں ان شاء اللہ ضرورت مند کو فوراً دینے میں زیادہ ثواب ہے۔

پگڑی کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: پگڑی پر مکان خریدا اور پھر مزید آگے کرایہ پر دے دیا، اس کی زکوٰۃ کس طرح دی جائے گی؟

جواب: پگڑی پر مکان خریدا نہیں جاتا بلکہ کرایہ پر لیا جاتا ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ پگڑی کوئی قابل

زکوٰۃ چیز نہیں، بلکہ جو مکان کرایہ پر دیا ہوا ہے اور اس کو جو کرایہ آ رہا ہے وہ جب آمدنی کی شکل میں جمع ہو، اور پھر وہ سال کے آخر میں تاریخ زکوٰۃ پر جو باقی رہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اصل میں اس پر واجب ہے کہ وہ رقم کرایہ دار کو واپس کرے چاہے کرایہ بڑھا دے۔

گڈول پر فروخت کی ہوئی بلڈنگ پر زکوٰۃ

سوال: اگر ایک شخص کے پاس ایک بلڈنگ ہے جو اس نے گڈول پر فروخت کردی ہے، کیا وہ اس پر زکوٰۃ دے گا یا نہیں؟

جواب: اگر عمارت یا بلڈنگ گڈول پر فروخت کی ہو یا کسی اور ذریعہ سے فروخت کی ہو جب آپ کے پاس اس کی نقد رقم آ گئی تو نقد رقم کا جو حکم ہے وہی حکم اس پر جاری ہوگا، یعنی سال کے ختم پر تاریخ زکوٰۃ آنے پر جو رقم باقی ہوگی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جس قرضے کی واپسی کی امید نہ ہو اس کا حکم

سوال: اگر ایک شخص نے اپنا مال ادھار فروخت کیا ہوا ہے اور پارٹی رقم ادا نہیں کر رہی ہے تو اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے، اس میں بھی پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ ادھار مال لینے والا مسلسل یہ کہتا رہے کہ میں ادا کردوں گا، مگر وہ ادا نہیں کرتا، اور دوسری صورت یہ کہ وہ ادھار لینے والا واپس دینے سے صاف انکار کردیتا ہے یا غائب ہی ہوجاتا ہے، یا اس کا انتقال ہوجاتا ہے تو ان صورتوں میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر کسی شخص کے ذمے آپ کی رقم تھی مگر وہ اب واپس ادا کرنے سے مکر گیا ہے یا غائب ہوگیا ہے اور پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں گیا، اور اب اس رقم کے واپس ملنے کی امید نہیں ہے، تو اس رقم پر زکوٰۃ نہیں، لیکن اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری رقم ادا کروں گا بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ نیک نیتی سے کہہ رہا ہے، اگرچہ اس وقت گنجائش نہیں ہے لیکن گنجائش ہونے پر وہ واقعی دیدے گا تو اس صورت میں اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے اس کی زکوٰۃ نکالنی چاہئے، البتہ اس رقم پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ فوری واجب نہیں، قرض کی رقم وصول ہونے پر ادا کرسکتا ہے۔ مگر جب رقم مل جائے گی، تو پچھلے ان سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، جن میں وہ رقم وصول نہیں ہوئی تھی، اور زکوٰۃ بھی ادا نہیں کی گئی تھی۔

☆☆☆

ہماری روزمرہ زندگی اوراس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اِسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۴۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور — فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵
★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان — فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۲۳۹۹۱
★ موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۷۳۵۳۲۵۵۔فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵۔۳۷۲۴۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲۰۴۲۰۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انار کلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاقِ سیّئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینانا تھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۴۳۹۹۱۔ ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ انار کلی لاہور پاکستان ★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی

فون ۳۷۲۳۲۲۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۲۳۲۲۸۵ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱۔۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۲۰۱